جمیلہ ہاشمی کے نایاب و شاہکار افسانے اور تحریریں

مختلف کتب و رسائل سے ماخوذ

------- ◈◈◈◈◈◈◈◈ -------
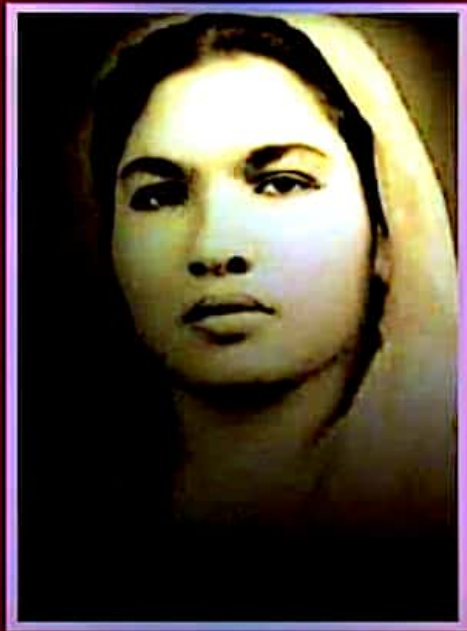
پیشکش : میر ظہیر عباس روستمانی

+92 308 3502081 ~~ +92 307 2128068

****

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani
Title By : Ghulam Mustafa Daaim

ٹیلیفون ۵۲۵۲۵　　　　رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

شمارہ نمبر ۱۳۴
دسمبر ۱۹۸۶ء

بانی

محمد طفیل

مدیر

جاوید طفیل

ادارۂ فروغِ اُردو ○ لاہور

قیمت ۱۰۰ روپے

ترتیب

مقالے

علامہ محمد حسن لطیفی

افسانے — خواتین افسانہ نگاروں کی تحریریں

مرد افسانہ نگاروں کی تحریریں

ڈرامے

خاکے

ہوائے دِل

جمیلہ ہاشمی

ہائے کیا بات کہی ہے۔ جیسے کوئی صلیب پر لٹکے اور اپنی صلیب کو اٹھائے بھی سہی۔ تمہیں پتا نہیں آفندی کبھی مجھے اچھی باتیں کرنے کا اور سننے کا بہت شوق تھا۔ ایسا بھی ہے مگر وہ صحبتیں وہ صبحیں وہ شامیں وہ سب اب کسی اور دیس کی باتیں لگتی ہیں۔ سپنوں کے اس دیس کی باتیں جہاں لوگ نوکاؤں میں گھومتے ہیں اور گیت گنگناتے ہیں۔ جہاں کشتی میں ساری زندگی گزر جاتی ہے اور سردیاں گرمیاں برساتیں آدمی جل دھارا پر ہی رہتا ہے۔ ہائے وہ زندگی ہائے وہ بیتے دن۔

ایسی حسرت سے یہ سب باتیں کیوں یاد کر رہی ہو وہ دیس کونسا دور ہے وہ سپنے تو اب بھی تمہارے ہیں میرا مطلب ہے یہاں سے ٹکٹ کٹا کر سیدھی سونار بنگلہ اور نوکائیں اور جل دھارا۔" وہ وقت بیت چکا آفندی کبھی کبھار آدمی کی نظر میں وقت نہیں بیتتا مگر اصل میں گزر چکا ہوتا ہے جب آدمی دلدل میں دھنس جاتا ہے تو بھلا کوئی اُسے بچا سکتا ہے؟ وہ سر جھکائے کب تک بیٹھی رہی جانے کونسی یادیں تھیں کون سپنے تھے کون لوگ تھے اور وہ خود کون تھی وقت کے جھنجھٹ سے پرے کی مورتی۔

عورت بہت مجبور ہے مگر جب وہ تُل کھڑی ہوتی ہے کہ اپنی طاقت آزمائے تو اُسے یکایک اپنی عظیم طاقت کا احساس ہوتا ہے اور یہ بڑی ظالم گھڑی ہوتی ہے بوتل میں سے نکلے جن کی طرح وہ ہر ناممکن کام بھی کرتی ہے وہ سر جھکائے بیٹھی تھی اپنے ہاتھوں کے پیالے میں سر کو تھامے جیسے کٹے ہوئے سر کو کسی کو پیش کرنے جا رہی ہو۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اُسے تسلی دوں مگر کیوں! بظاہر اُسے کیا دکھ ہے؟

"تم سوچ بھی نہیں سکتے آفندی کہ میں جو سرما ندی کے دھارے پر ایک اندھیری رات کو ایک چھوٹی کشتی میں پیدا ہوئی تھی یہاں بیٹھ سکتی ہوں اس نہایت حسین فلیٹ میں ہوں اور اس کی مالک ہو سکتی ہوں مین ہٹن کا یہ خوب صورت علاقہ"۔ وہ بہت اداس تھی۔

یہ جگہ بھی ندی کا دھارا ہے آدمی ہی آدمی اور بہتی ہوئی اپنے ساتھ بہاتی زندگی اور پھر کوئی ایسا بُرا بھی نہیں اور نہ ایسی ناممکن بات۔ سُرما کے دھارے پر پیدا ہونا کوئی گناہ نہیں ہے اور نہ وہاں سے مین ہٹن کا سفر کوئی ایسی عجیب بات ہے تم مفت میں آج رومانٹک ہو رہی ہو۔

اچھا تو کیا ماضی کو یاد کرنا رومانٹک ہونا ہوتا ہے اُس نے گھٹنے پر اپنی ٹھوڑی ٹکا کر کہا۔

تم ایسا کہتے ہو تو شاید ٹھیک کہتے ہوگے مگر کبھی کبھار سے کیا گناہ ہوتا ہے۔ دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔

وہ بھی ایک سرا تھا اور یہ دوسرا سرا ہے تم درمیانی راستہ اختیار نہیں کر سکتیں یا تو تمہیں قلوپطرہ ہونا ہے اور یا پھر ندی کے دھارے پر بہتی پانی کے آئینے میں اپنا عکس دیکھتی وہ لڑکی جس کا باپ مانجھی تھا اور جس کی ماں اپنی ایک دھوتی دھو کر اُسے ہی پہنتی تھی۔ ہر عام گھر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ غریب ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔

ہاں تم شاید یہ نہیں جانتے کہ قحط میں جب سارا سونا گاچی دیہات کی بھوکی لڑکیوں کے دم سے آباد تھا تو میرا باپ مجھے ایک بیس

کے ہاتھ بیچ گیا تھا۔ سیر دو سیر سبحات کے بدلے بکی ہوئی میں آج تک سوچا کرتی ہوں کہ چاول زیادہ اہم ہے یا اولاد۔ میں نے ساری عمر آج تک اپنے بہت دام لگائے ہیں میں نے اپنے آپ کے بدلے اتنا بہت کچھ لیا ہے مگر پھر بھی سینے میں ایک ہوک اٹھا کرتی ہے اور ہمیشہ اپنے بے قیمت ہونے کا احساس رہتا ہے بے وقار گری پڑی ایسی شے جس کو کسی نے چاہت نہ دی کسی نے پیار نہ کیا ہمیشہ میں اپنے آپ کو ایک ایسی کنکری لگتی ہوں جو کسی پاؤں کی چبھن نہ بن سکی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میں نے کہا۔

نورالنہار بیگم تم شمیمن پیتی ہو اور بہت ہی مہنگی خاتون ہو تمہاری ساڑھیاں تمہارا سراپا ہر ایک شے پکار پکار کر اپنے نہایت بے مثال ہونے کا اعلان کرتی ہے اس ایک گھڑی کو کیوں یاد رکھتی ہو خدا نے تمھیں اور بہت کچھ دیا ہے۔

" سنو اُس کا نام درمیان میں نہ لاؤ۔ پتا نہیں وہ ہے بھی کہ نہیں۔ وہ سوچنے لگی۔

" ذروں کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ خالقِ کائنات کے متعلق ایسی باتیں کریں۔"

" یہ بھی تم ٹھیک ہی کہتے ہو اگر میں ذرہ نہ ہوتی تو چاول کے بدلے بکتی۔ میں تو چاول سے بھی کم قیمت ٹھہری بھلا بابا مجھے کیوں بیچ گیا تھا؟"

دیکھو وہ بچھڑنا اور بکنا تمہارے لیے کتنا مبارک ہُوا۔ اب تمہارے پاس کیا نہیں ہے تم ایک ملکہ کی طرح جس چیز کی خواہش کرو وہ پوری ہو جاتی ہے۔ کتنے لوگ محض تمہارے ابرو کے اشارے کے منتظر رہتے ہیں۔

" جنہوں نے مجھے بیچا اُن کے لئے میں کچھ بھی نہ تھی۔" وہ بہت مایوس تھی۔

" نورالنہار بیگم ماضی پر ماتم کرنا جب کہ حال میں سب کچھ ہو سخت بری بات ہے۔ تُم کو اپنا درد سنانے آیا تھا اور تم یہ قصہ چھیڑ بیٹھیں۔" یہ گھڑی میری ہے آفندی تمہارا درد شاید نیا ہو۔ کسی سے محبت کا کسی سے چاہت کا کہیں امریکی لڑکیوں کے گروہ میں گھل مل کر اُن سے لُٹ جانے کا مگر میرا دکھ انوکھا ہے۔

اس لئے کہ وہ تمہارا ہے کبھی تم نے سوچا ہے اس درمیان میں کتنے لوگ بے گھر ہوئے ہیں کتنی لڑکیاں بنا مول کے ہی اُٹھا دی گئیں اُن کے بدلے تو کسی نے ایک مٹھی چاول بھی نہ دیئے۔ زلزلے بجلیاں قحط اور ایسے الم تو سدا سے ہوتے آئے ہیں۔

" ہوتے آئے ہیں۔" میں نے اُٹھ کر وہ تصویر ٹھیک کی جو دیوار پر ٹنگی تھی اور وہ جیسے بحث کرنے کے لیے تیار ہو کر بیٹھ گئی۔

تمہارا المیہ ایسا نہیں کہ اس پر آنسو بہائے جائیں نورالنہار بیگم۔ جیسے زہریلی ہوا پھیلتی ہے اور موت بانٹتی ہے اس طرح کہاں کہاں لوگ بے گھر نہیں ہوئے۔ اصل میں موجودہ دنیا اسی بے گھر ہونے کے المیے سے عبارت ہے۔ تمھیں معلوم ہے اگر بے گھر لوگ نہ ہوں اُن کے مسائل نہ ہوں تو آدھی دنیا کے ادارے بیکار ہو جائیں۔ ایسے مسائل تو جان بوجھ کر پیدا کئے جاتے ہیں۔ ویت نام۔ فلسطین۔ بنگال۔ کشمیر یہ اتنے بہت سے مسائل ہیں اور پھر اُن کے پیچھے آبادی کا ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا۔ بچوں کا بکنا بے گھر ہونا سبھی کچھ تو ہے۔ تم شکر کرو کہ تمہاری قیمت بقول تمہارے ادا کرنے والے بار بار سامنے آتے ہیں۔" مارے غصے کے مجھ سے اور بولا نہیں جاتا تھا۔

میں تمہارے اس لیکچر سے بالکل متاثر نہیں ہوئی یہ اور بات ہے کہ تم کو میری کہانی میں اور میرے کردار میں بہت فرق لگا ہے پھر بھی جاوید آفندی پھر کبھی ہماری بحث جاری رہے گی۔ یہ نشست اب برخاست ہوتی ہے اور اس سے پہلے کہ میں اُسے روکتا وہ اُٹھ کر

اندر چلی گئی۔ دوسرے کمرے میں جا کر اُس نے موسیقی کی دھن بدلی کوئی نیا ریکارڈ لگایا۔ جیسے کشتی اندھیرے اتھاہ گہرے خاموش پانیوں میں ڈوب رہی ہو۔ اُن پانیوں میں جہاں نہ حرکت ہے نہ موج نہ لہر نہ بھنور نہ گرداب بوجھل ٹھہرا ہوا سیاہ سمندر نہ جوار بھاٹے کے لئے اٹھتا ہے نہ چاند کی طرف شوریدہ سری سے لپکتا ہے نہ جھاگ اٹھتے ہیں کوئی کرن اس تک نہیں پہنچتی نہ وہ جھلکتا ہے نہ ڈولتا ہے اور اس میں مردہ وجود جو اُوپر سے گرتے ہیں وہ نہ گھلتے ہیں نہ پگھلتے ہیں نہ پُھٹے جاتے ہیں نہ منجمد ہوتے ہیں نہ ابلتے ہیں نہ تیرتے ہیں۔ جسم جہاں سے نہ چیخ اٹھتی ہے نہ آواز آتی ہے جہاں وقت رکا ہوا ہے۔ سب کچھ فنا ہے بے قیمت اور ایک ہی حقیقت ہے موت شہد آگیں نام جس تک جانے کی تمنا ہر جاندار خون میں لے کر پیدا ہوتا ہے کیوں کہ سب بھاگ دوڑ ساری تگ و دو اس کنارے تک جانے کے لئے ہی تو ہے۔ عمر خیام کی وہ رباعی تمھیں بھی یاد ہو گی جس میں شاعر نے پوچھا ہے کہ دروازے کی کوئی چابی میرے پاس نہ تھی نقاب کے پیچھے دیکھنے کی مجھے جرات نہ تھی۔ سرگوشیوں میں تمہاری اور میری گفتگو تھی اور پھر تم اور میں بھی فنا ہی تو ہو جائیں گے۔

اتنی زندگی کے درمیان پتا نہیں موت کا خیال کیوں آتا تھا مجھے ہی نہیں نور النہار کو بھی کیونکہ یہ موسیقی اُس کے اپنے مزاج کے مطابق تھی۔ پتا نہیں ساری ناز و نعمت میں زندگی گذارتی عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں یا یہ خصوصیت صرف مشرقی مزاجوں کی ہے۔ آب و ہوا کا اثر ہے ہم فٹ پاتھ پر بیٹھے کسی بھکاری سے بات کرو تو وہ موت اور قضا کی بات کرے گا۔ کچھ نہیں کچھ نہیں سب بیکار ہے اور اس کے باوجود وہ زندگی سے اور اُس تک جانے والی تونوں کی پرستش کرتا ہے۔ سارے مذہب ایشیا سے پیدا ہوئے اور سارے مذہب دنیا کی بے ثباتی کا پرچار کرتے ہیں اور اس کے باوجود جیسے جیسے ماحول بدلتا گیا مذہب بھی مرکز سے دُور ہٹ کر دنیاداری میں زیادہ انہماک کو بھی ایک اگلا قدم تصور کرنے لگا۔ مگر مرکز کے گرد لوگ ویسے ہی رہے دنیا کی محبت میں وہ گرفتار رہے ہوئے اُس کے لیے اپنے کو برباد کیا مگر اُسے ایسی محبوبہ تصور کرتے رہے جس سے کبھی قانونی تعلق پیدا نہیں ہو سکتا۔ جس کے لیے تم فنا تو ہو سکتے ہو مگر جس کا نام تمہاری وصیت میں نہیں آ سکتا اِس سے کوئی رشتہ شرمناک ہے۔ خاندان والے ذکر کریں گے مگر دبی زبان سے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ترقی کے لئے مشرقی قوموں نے صرف اوپری دل سے سطحی کوششیں کیں ہاں میں انھیں بالکل سطحی ہی کہوں گا۔ پتا نہیں کیوں جس نا اُمیدی کا وجود تک مذہب کی تعلیمات میں نہیں وہ لوگوں نے اس میں کہاں سے تلاش کر لی۔ زندگی بے شک لمحہ گزراں ہے مگر اپنے آپ کو ثابت کرنے اور اپنے پیدا کئے جانے کا کوئی جواز بھی تو ہمیں پیش کرنا ہوتا ہے۔ جتنے مذاہب ہیں اُن کے اندر اترو تو سطح کے مقابلے میں حیرت انگیز تضاد پاؤ گے جیسے خس و خاشاک کے نیچے تازہ میٹھے پانی کے سوتوں کو ڈھانپ دیا گیا ہو۔ جن لوگوں کو اُن چشموں کا علم ہے وہ بھی اتنے کباڑ کو اُٹھانے کے قابل نہیں ہیں صدیوں کی گرد ہے اس کو چھیڑنا آسان کام نہیں۔ کبھی کبھار میرا جی چاہا کرتا ہے کہ اگر وہی لحن اور وہی جذبہ مل سکے تو سارے فلسفے اور علم الکلام اور علمی موشگافیاں سب کو آگ لگائی جا سکتی ہے۔ خدا اور اُس کے ہونے اور نہ ہونے کے بارے میں جتنا کچھ لکھا گیا ہے مختلف فرقوں اور اُن کے عقائد نے جتنا نقصان انسان کو پہنچایا ہے اس کا کوئی شمار ہی نہیں بھلا عقلِ انسانی کیا گتھیاں سمجھ سکتی ہے مذہب ایک وجدان ہے الہام ہے خدا سے براہِ راست ایک تعلق ہے اس میں عقل کیا کام دے سکتی ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں عقلیت کے خلاف ہوں اس لئے کہ سوچنے والی تو وہی ہے مگر وجدان کی ہم پلہ یہ پھر بھی نہیں ہو سکتی۔ چیزوں کا ادراک یہاں اور ماورا کا اور پردوں کے آگے پیچھے دور تک دیکھنے اور سمجھنے کا شعور صرف فلسفے سے پیدا نہیں ہوتا۔ گوتم کو گیا میں برگد کے نیچے جو گیان ہوا اور مہاویر کو جو نظر عطا ہوئی

پیغمبروں کو جو خدا کا دیدار ہوا تم ہی سوچو کسی فلسفی کو کبھی نصیب ہوا ہے؟

تم یہ مت سمجھنا کہ میں مذہب کے خلاف ہوں مگر سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ جس تعلق سے تعلقِ خاطر پیدا ہو سکتا تھا شروع سے ہی اس کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں۔ کہیں پتھر کے بت بنے اور کہیں عقل کے۔ ابوالکلام آزاد کسی جگہ ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ معتزلہ نے جہاں دربار میں جگہ پانے کے لئے اور بہت سی بدعتوں اور موشگافیوں کو رواج دیا وہاں خلقِ قرآن کا مسئلہ بھی اٹھایا۔ دربارِ مامون جو شان و شوکت و دبدبہ اور ہیبت میں پوری دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا شیخ عبدالعزیز الکنانی کو کلمۂ حق کہنے سے باز نہ رکھ سکا اور انہوں نے عقل کے بنائے ہوئے اعتراضات کو اپنی ہمت اور اللہ کی مدد سے رد کیا۔ میں بھی کہاں سے کہاں جا نکلا ہوں مگر جی اس بات پر جلتا ہے کہ ہم لوگ مغرب کی دنیا پرستی شان و شوکت ان کی ترقی سے اتنے مرعوب ہو گئے ہیں کہ آج اپنے مقدمات آپس کی رنجشیں ذرا ذرا سی تکلیفیں اُن سے کہتے اور انہی سے انصاف کے طالب ہوتے ہیں۔ وہ شاندار عمارت اقوامِ عالم کی اسمبلی پرہیبت پرعظمت ہے مگر پُراسرار نہیں یہاں ہر قوم کے نمائندے آتے ہیں۔ بیٹھتے ہیں اور اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ یہ دربارِ عام کا دروازہ ہے جہاں سے بڑی قوموں کے دربارِ خاص کو راستہ جاتا ہے اور وہاں اُن کے اپنے مقاصد ہیں اپنی ترکیبیں ہیں جوڑ توڑ ہے رعب و دبدبہ ہے پچھلی گلیوں سے چور دروازوں سے وہ الجھاوے پڑتے ہیں سلجھتے نہیں ہیں قوموں کو آزادی ملتی ہے وہ اپنے خالی خزانوں اور گوناگوں مسائل کے ساتھ پھر اسی دروازے کے پھیرے کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ معاشی طور پر بدحال اور تباہ حال کر کے جب انھیں اکیلا چھوڑ دیا جاتا ہے تو اُن کی مفلوج عقلیں مارنے والے ہاتھ کی طرف روٹی کے لئے مدد کے لیے دوڑتی ہیں۔ میں نے دنوں ہفتوں مہینوں اور سالوں پس ماندہ قوموں کے نمائندوں کو بنا کسی کامیابی کے اس دربار کے باہر چکر کاٹتے دیکھا ہے۔ مغرب مشرق سے بدلہ لے رہا ہے اُس کے ترقی یافتہ ہونے اور اُس سے پہلے تہذیبوں کے پورے پورے قافلے پیدا کرنے پر قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں سن کر تو انسان کا جی زندگی سے بیزار ہو جاتا ہے مگر جینا بھی تو ہمت ہے چاہے وہ میں اور تم ہوں یا نورالنسا بیگم ہو۔

آج تمہیں خط لکھتے ہوئے میں گھڑی گھڑی بہک رہا ہوں پتا نہیں کیوں۔ ورنہ میں اپنی عزتِ نفس کی قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ میں نے یہاں پر شراب و شباب کے اس ملک میں آج تک کبھی ایک گھونٹ بھی نہیں پی۔ میرا معاملہ صرف اپنے آپ سے ہے ورنہ یوں تو قدم قدم پر بہکنے اور بہ جانے کے سامان ہوتے ہیں۔ جب میں سخت گھبراتا ہوں تو بھگتی کیرتن کی مجلسوں میں جاتا ہوں جہاں امریکی لوگ اپنی بھٹکی ہوئی کھوئی ہوئی آوارہ روح کو واپس پانے کے لئے جتن کرتے ہیں۔ یہ دیوانے لوگ ہیں جس طرف جھکتے ہیں جھکتے چلے جاتے ہیں صرف انہیں ہاؤ ہو چاہیے وہ گانا بھگتی کا ہو یا پوپ میوزک۔

جب میزبان خاتون پھر داخل ہوئی تو اس کا موڈ بدل چکا تھا۔ نہایت تنگ پتلون اور گہرے رنگ کا جھالروں والا بلاؤز جس کے اوپر اس کا چہرہ اپنے پورے میک اپ کے ساتھ بہت ہی تازہ اور چمکدار لگ رہا تھا۔

اور میں نے کہا جیسے بادلوں میں قوس قزح کا رنگ جھلکتا ہو سورج کے سامنے آئے بادل کا لحظہ لحظہ بدلتا رنگ ہو۔

"آفندی تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟ میں فیشن ماڈل کرتی ہوں اور اس سلسلے میں دعوے سے کہتی ہوں کہ مجھ سے بڑا فنکار کوئی نہیں مشرقی انداز میں میرا کوئی جواب نہیں آفندی۔

" مشرقی انداز" میں نے ہنس کر کہا "بجلی گرانے کا ایک ہی اصول ہے بیگم صاحبہ جہاں کہیں بھی ہو۔"

" کم از کم تم پر تو گرنے سے رہی" اُس نے بالوں پہ سکارف باندھتے ہوئے کہا۔

" یہ چہل قدمی باہر جانے کا اچھا وقت ہے" میں نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

" وقت سوائے شام کے نہ اچھا ہوتا ہے نہ بُرا۔ کیونکہ شام کے وقت مجھے اپنی کاروباری سہولتوں کے پیشِ نظر کہیں نہ کہیں ڈنر میں جانا ہوتا ہے کچھ نہ کچھ نوکری ہی ہوتا ہے؟" اُس نے رومانہ کے لیے گھنٹی بجائی۔

" ہاں آپ کا خیال ہے یہ جو میں ڈیلی گیشن لے کر آئی ہوں تو مجھے یہاں آنے کا شوق تھا۔ بھائی میرے یہ تو میرے لئے گھر آنگن ہے کیا سمجھے"۔ اس نے رومانہ کی طرف پاؤں بڑھا دیئے۔

سفید بے حد گورے پاؤں۔" سنو آفندی یا زمانہ تم کو نچاتا ہے یا تم زمانے کو نچاتے ہو؟"

" تو پھر رونا کا ہے کا ہے تم نے بڑھ کر یہ ساغر اُٹھا لیا"۔ میں نے پھر کھڑے ہو کر تصویر کو ٹھیک کیا۔

" کیا بات ہے یہ تصویر گھڑی گھڑی اپنی جگہ سے اِدھر اُدھر کیوں ہو جاتی ہے"

"تمہارے پہلے سوال کا جواب میں پھر دوں گی اور دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ یہ تصویر اپنے مرکز پر ٹھیک نہیں ہے اس کا فریم ذرا سا اوپرسے اس لئے یہ ٹک نہیں سکتی۔ انسانوں کی طرح ذرا سی کپکپاہٹ تھوڑی دیوانگی اور بے پناہ ہونے کا احساس اسے بھی ہے"۔

ہم باہر نکلے۔

" چلو آج کہیں کسی ایشیائی ریسٹوران میں چلتے ہیں"۔ اُس نے دروازے سے نکلتے ہوئے کہا

" ہاں ذرا اٹھنے کی تبدیلی سہی ورنہ ہمارے لیے یہ سب باتیں کیا نئی ہیں؟"

تمہیں معلوم ہے میں بہت اچھی باورچی بھی ہوں۔

جانے تم بہت اچھی کیا کچھ ہو یہ اتنے سارے علوم تم نے کہاں سے حاصل کر لئے؟

میں نے اپنی تربیت خود کی ہے برادر اُس نے ہنستے ہوئے کہا"بچپن سے ہی میں زندگی سے حالتِ جنگ میں ہوں شدید جذبوں کا شکار شدید نفرتیں شدید محبتیں میرے لئے درمیانی راستہ کون سا تھا تم ہی بتاؤ؟

میں کیا کہہ سکتا ہوں کیا عرض کروں میں نے سر جھکا کر کہا۔

یہ ایک میرا پسندیدہ پاکستانی ریسٹوران تھا یہ زیو سے ذرا ہٹ کر جیسے ایک پرائیویٹ گھر سا ہو مدتیں ہوئیں میں وہاں نہیں گیا تھا حالات کے بدلنے کے باوجود اُس پہ وہی پُرانا نام لکھا تھا یہاں وہ ہلڑ بازی نہیں رہتی جو عام امریکی ریسٹورانوں میں ہوتی ہے۔ زورانسار سے میں نے کہا چلو آج تمہیں پُرانے دنوں کی یاد دلانے کے لیے اپنے وطن لئے چلتے ہیں

مگر یہاں کی فضا میں عجیب مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ جیسے کاؤنٹر سے لے کر اندر کام کرتے باورچی تک سب بددلی کا شکار ہوں ہمیں دیکھ کر اُن کے چہرے سے اُتر گئے۔ ایک کونے میں ایک امریکی جوڑا اپنے کھانے پر جھکا ہوا تھا۔ میں نے سوچا یہ جگہ اس لیے بھی خالی خالی ہے۔ آج تفریح کا دن ہے یا ہو سکتا ہے ان کے غمزدہ سے چہرے دیکھ کر لوگ نہ آتے ہوں پتا نہیں کیا بات ہے؟

ہم منتظر ہے کہ آرڈر لینے کے لیے کوئی ہماری میز کی طرف بھی آئے۔

"عجیب بات ہے کوئی ہمارا نوٹس ہی نہیں لے رہا حالاں کہ بھیڑ بھی زیادہ نہیں ہے۔" اُس نے کہا۔

میں ہرے ہوئے سیٹی بجاتا ہوا اپنے گرد و پیش دیکھ رہا تھا۔ بڑی بڑی پینٹنگز جس سے دیواروں کو سجایا گیا تھا اپنے وطن کے مناظر تھے گرجتے ہوئے طوفانوں کی جب آمنڈ گھمنڈ گھٹائیں آتی ہیں اور سب طرف جل تھل ہو جاتا ہے بارش کے بعد شام کا منظر جب بادلوں میں سورج رنگ بکھیرتا ہے ذرا سا نیلا آسمان اُوپر سے شریر بچے کی طرح جھانکتا ہوا اور رنگوں کا میلا ایسے عجیب عجیب رنگ اور نیچے ندی میں ان کا عکس پڑتا ہوا گڈ مڈ ہو کر لہروں میں ملتے لیتے اُبلتے گردابوں میں ڈوبتے بھنور بنتے رنگ۔ رنگ ہی رنگ۔ بھیگے درختوں کی ہریالی سیاہی کی طرح گہری اور گہری جیسے کوئی کنواری رات کے اندھیرے میں ڈری سہمی کھڑی ہو۔ اور سکھ کا سانس لیتی زمین بڑے آنند سے لیٹی ہوئی ماں کی طرح جس نے سارا دن کام کرتے رہنے کے بعد اپنے بچوں کو سلایا ہو اور خود جانے کیسے کیسے سپنے دیکھ رہی ہو بیتے دنوں کے جب وہ سہیلیوں کے ساتھ شور مچاتی گیت گاتی درختوں کی اونچی شاخوں میں جھولا جھولتی تھی گویا آکاش کو چھونے جا رہی ہو۔ فراٹے بھرتی ہوا کے رس بھرے گیت کانوں میں گونجتے تھے سیٹیاں بجاتے اور بادل اوپر ہی اوپر دھوئیں سے بھرے دھوپ سے بھرے نرم پروں کے بستر کی طرح لگتے تھے جن پر شرارت سے کود پھاند کرنے اور ان میں ڈوبنے کو جی چاہے۔ تیز دھارے پر سے پھسلتی بڑی بڑی کشتیاں اور ذرا ذرا سی ناؤ کائیں، اُن میں ٹمٹماتے دیوں کا عکس، تیز بہتے پانی پر کانپتا لرکھڑاتا ہوا۔

"میں پہلے یہاں کیوں نہیں آئی؟" نور النہار نے نیلے کنول کے پھولوں کے جھنڈ کی تصویر کو بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور تم مجھے آج یہاں کیوں لائے ہو۔"

"اس لیے کہ تم جنگل پر برستی رات کا منظر دیکھ سکو : یہ ایک تصویر تھی کہ تم آرٹسٹ کے ساتھ کھنچے کھنچے وہاں پہنچ جاؤ۔ درختوں اور ان پر چڑھتی بیلوں نے تاریکی پھیلا رکھی تھی گھپ اندھیارا دھوئیں کی طرح اُس میں سے اُٹھتا ہوا چاند کی روشنی صرف اوپر کی شاخوں میں اٹکی ہوئی۔ اور کہیں کہیں سے چوری چھپے اندر اُتر کر تاریکی کو اور بھی مکمل طور پر عریاں کرتی ہوئی۔ اپنی بے بسی پر ماتم کناں جیسے یہاں نظر بند کر دی گئی ہو۔ اور پھر یہ تاریکی آوازوں اور آہٹوں سے آباد۔ ہوا روشنی کی طرح مقید اور اپنا آپ چھڑانے کے لئے روتی اور چنگھاڑتی ہوئی جنگلی جانور بہت محتاط قدم اُٹھاتے اپنی دُنیا میں شکاریوں کی طرح دبے قدموں گھات میں لگے ہوئے اور پھر کہیں کہیں پانی ٹھہرا ہوا سرکنڈوں میں سوتے ہوئے پرندوں کے گھونسلوں کے قریب سے چپ چاپ بہتا ہوا۔ تیز تیز چپو چلاتے ہوئے مانجھی ان دھاروں کا مزاج جاننے کے باوجود موتی سے خوف زدہ!

میں نے بیرے کو پکارا۔

نور النہار نے بنگالی میں کچھ کہا ہوگا باتیں کرتے ہوئے وہ بدلی ہوئی لگی دُور دور بالکل اجنبی جیسے اپنے اندر رازوں کی دنیاؤں کی حفاظت کر رہی ہو جیسے وہ خلا نورد ہو اور پُر اسرار طور پر اپنے دوسرے ساتھیوں سے مل گئی ہو جو کسی اور سرزمین کے رہنے والے ہیں۔

"چلو یہاں سے چلیں۔" اُس نے پلٹ کر مجھ سے کہا: "میں تصویر میں کھویا ہوا تھا۔"

کیوں کیا بات ہے تمہاری گفتگو تو بہت طویل تھی۔

لگتا ہے تصویر سے تم کوئی زیادہ IMPRESS نہیں ہوئے ورنہ تمہیں وقت کا پتا نہ چلتا اور میں نے زیادہ طویل بات تو نہیں کی۔ ان سے حجت کر رہی تھی وہ لوگ تمہاری وجہ سے ہمیں کچھ دینا نہیں چاہتے وہ ملائمت مگر عزم سے یہ بات کہتے ہیں۔

" یہ لوگ تو بہت متواضع۔ حلیم اور نیاز مند ہیں۔" میں نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔

" مگر اب وہ بات نہیں رہی۔" وہ دروازے کی طرف بڑھی " تم کو یہ بات پہلے ہی پتا ہونا چاہیے تھی جب آپ کسی قوم کو محکوم رکھیں گے اُس کا استحصال کریں گے تو اُن سے محبت اور فرحت کے طالب کیوں ہوں گے۔"

باہر نکل کر میں نے کہا " تم یہ سب باتیں جانتی ہو اور پھر بھی کہتی ہو ہم لوگ کس کا استحصال کر سکتے تھے صرف غلط فہمیوں کا شکار ہوئے ہیں۔"

" تم تو اپنی طرف سے یہی کہو گے مگر ان کی بات بھی سنی ہے تم نے مغرب والے مشرق کو کھا گئے۔" اس نے ہنس کر میری طرف دیکھا۔ " اب وہ لوگ مزید کچھ بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں۔"

" کمال ہے نورالنہار بیگم شاید اندرونِ خانہ کہانی کا تم کو مجھ سے بہتر پتہ ہو۔" میں نے ذرا تیز چلتے ہوئے کہا۔

" انگریزوں سے یہ سبق سیکھ کر تم لوگوں نے اپنے ہی بھائی بندوں پر وہ طریقے آزمائے۔" اُس نے کہا۔

" خیر مٹی ڈالو ان سب باتوں پر دھوپ میں ذرا گرمی آ گئی ہے اور جب تمہیں اپنی پسندیدہ جگہ کھانا نہیں ملا تو اب کہیں جانا بیکار ہے۔ آؤ کہیں سے امریکی ہاٹ ڈاگ لے لیں اور آئس کریم کھائیں۔" جیسے دو بچوں کو بڑی مدت بعد گھر سے رہائی ہوئی ہو ہم چلتے رہے ایک دکان سے جہاں حبشی لڑکے بہت تیزی سے اور مستعدی سے کام کر رہے تھے ہم نے کھانے کی چیزیں خریدیں اور چلتے ہوئے کھاتے رہے سفید فاموں اور کالوں کی ٹولیاں گھوم رہی تھیں ہوا ایک دم خوشگوار جیسے کسی خلیجی رو کے اوپر سے آئی ہو اور یادوں کے جادو جگانے والی تھی۔ یہ ایسی سہ پہر تھی جب درختوں کے سایوں تلے لیٹ کر خوشبو میں بسی ہوا میں سانس لینے کو جی چاہنے لگتا ہے اور غنودگی جی کو لپیٹ لیتی ہے۔ ہریالی اور سرسراتے پتوں میں گیت گاتی چڑیاں دنیا پر بہشت کا گمان ہوتا ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے چشموں کے میٹھے پانی کا برف کا سا سفید دھارا جب پتھروں پر پاؤں دھرتا اچھلتا کودتا نیچے کی طرف لڑھکتا ہے تو ٹھنڈک جی کو سکون بخشتی ہے۔

مگر ہم چلتے رہے میں تلخ سا اور نورالنہار بے پروا بھلا اُس نے یہ کیوں کہا تھا کہ ہم نے انگریزوں کے طریقے اپنے بھائی بندوں پر آزمائے اور ریسٹوران کے بہرے نفرت سے صرف مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔ یہ سوال کہ ہم نے کیا کیا ہے؟ بہت اہم ہے آبادی کا اتنا بڑا حصہ ملک کی زندگی اور سلامتی کا ذمہ دار پھر نفرت کی خلیج اتنی بڑی کیوں تھی کہ اس پر کوئی پل باندھا نہ جا سکا؟ میں نے دونوں قوموں کا نکتۂ نظر سمجھنے کی کوشش کی ہے سلامتی کونسل میں باہر ریسٹورانوں میں یہاں وہاں دوست دشمن سب سے ملنا ہوتا ہے اور لوگوں کے نظریے سمجھنے اور سننے کا موقع ملا ہے یہ نفرت اور دشمنی کی آگ ہوتے ہوتے چلی مگر چنگاری بہت پہلے ڈالی گئی ہو گی اور ہم لوگ اتنے بے خبر۔ مگر ہم لوگ کون؟ میں سمجھتا ہوں اُن کے بنا ہمارا وجود آدھا ہے یہ ہابیل اور قابیل کی جنگ بھی میں جذباتی نہیں ہو رہا۔ مگر اس کے سوا کیا سوچا جا سکتا ہے۔ جب مسلمانوں کے عروج کا زمانہ تھا تو پوری سلطنت

جو مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک پھیلی تھی ایک ہی مرکز کے تحت تھی اور ہندوستان میں آتنی قومیں بستی تھیں اب بھی بستی ہیں پھر فاصلوں کی دُوری کیوں حائل ہوئی؟ اگر مجھے میرے ان سب سوالوں کا جواب بھی مل جائے تو بھی یہ اسرار ہی لگتا ہے کہ اتنے کم عرصے میں ایسا ہو گیا۔ میں نے لیڈروں کی بیان بازیاں خود غرض لوگوں کی تقریریں دردِ دل رکھنے والوں کی اپیلیں پڑھی ہیں مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میں نے نور النساء سے کہا تم بتا سکو گی۔

آئس کریم کھاتے ہوئے اُس نے کہا:

"یہی کہ ہم لوگ نفرت کا شکار کیوں ہوئے؟"

"پہیلیاں کیوں کہتے ہو کن لوگوں کی بات ہے؟" وہ پھر بڑی فراخ دلی سے مسکرائی اور پھر "تم بہت جذباتی ہو آفندی۔"

"اس میں جذباتی ہونے کی بات نہیں میں سمجھنا چاہتا ہوں اُلجھتا ہوں اونچی آواز میں بولتا ہوں اور چونکہ تم برابر میں چل رہی ہو تم سے پوچھتا ہوں۔"

میں تمہارے سوالوں کے جواب نہ دے پاؤں گی۔ باہر سے جو آدمی اس ڈرامے کو دیکھے وہ تو بتا سکتا ہے کہ کس ایکٹر نے کیا کام کیا میں تو اس بہت بڑے المیے کا حصہ ہوں میں کیا بتا سکوں گی۔"

"تم کیسے اس المیے کا حصہ ہوئیں۔ تم مزے میں ہو ہمیشہ کسی نہ کسی اونچی چوٹی سے ڈرامہ دیکھتی ہوئیں لوگ تمہاری توجہ کے انتظار میں تم کو کوئی المیہ چھو بھی نہیں سکتا۔ وہ اور لوگ ہوں گے معمولی۔ عام۔ تمہارا تو اس سڑک پر میرے ساتھ گھومنا مجھے حیران کر رہا ہے جیسے کوئی یونانی دیوی کسی فانی انسان کے ہمراہ چل رہی ہو۔"

اچھا مجھے آج پتا چلا آفندی تم باتیں بہت اچھی کرتے ہو اور تقریر تو بہت عمدہ کر سکتے ہو صرف تمہارے لئے کسی پلیٹ فارم کا بندوبست کر دیا جائے تو تم ہاتھ ہلا کر چیخ کر لوگوں سے اپنا وجود منوا سکتے ہو۔ اپنی شاعری سے لوگوں کو مبہوت کر دو گے ——

اب تم مذاق پر اتر آئیں۔

آتنی اچھی آئس کریم کھا کر آدمی اور کا ہے پر اُتر سکتا ہے میزبان کو کسی نہ کسی طرح تو خوش کرنا ہی چاہیے۔

ہاں کئی لوگ کا کرنا یہ کر رہے تھے ہیں تم مذاق سے حق ادائی کر رہی ہو مگر دیکھو میں نے سیاہ کافی اور کوکا کولا کے سوا تمہارے ہاں اور کچھ نہیں چکھا اس لئے میں تمہیں مذاق بھی نہیں کروں گا صرف یہ جاننا چاہوں گا کہ تمہارے وطن کے لوگ ہم سے اتنی نفرت کیوں کرنے لگے ہیں؟ کیا ہم قابلِ نفرت ہیں؟

آفندی اس سوال کا جواب دینے کا یہ وقت نہیں ہے۔" میں تمہیں اس سوال کا جواب دوں گی۔ تم میرے بھائی ہو آخر اتنا حق تو تم کو پہنچتا ہے۔" اور وہ پھر قہقہہ لگا کر ہنسی۔ ابراہیم فہمی نے آج ایک نیا رشتہ تمہارے اور میرے درمیان قائم کر دیا اور اسی رشتے کے ناتے میں اپنا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔

ہم بہت دیر یونہی پھرتے رہے بچوں کے ایک پارک میں جا کر انھیں کھیلتا دیکھتے رہے پھر باسکٹ بال کا ایک میچ ہو رہا تھا تماشائیوں

میں گھس کر نورالنہار زور زور سے کبھی ایک پارٹی کو داد دیتی اور کبھی دوسری پارٹی کو اچھل اچھل کر داد لاٹن میں سے نکل نکل پڑتی تھی۔ دوسری عورتیں اُسے گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں۔ پتا نہیں وہ کیوں اتنی خوش تھی۔ پھر اس نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے نوجوان کے اور میرے دونوں کے کندھے پکڑ کر اٹھ کر زور زور سے چیختا اور شور مچانا شروع کیا۔ میں نے اُسے منع کیا مگر اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ تھک کر جب ہم باہر نکلے تو اُس نے کہا کتنا مزہ آیا ہے۔ آفندی یہ صرف تمہارے ساتھ ہونے سے ممکن ہو سکا کتنے زمانے گزر گئے تھے یہ شور مچائے۔ میری آواز تو بچپن ہی میں گھونٹ دی گئی تھی۔ میرا بھی جی چاہا کرتا تھا جھولا جھولوں اور پینگ اتنی بڑھاؤں کہ آکاش کو چھو لے تاروں کے سنگ میں چھپوں اور آنکھ مچولی کھیلوں۔

”اب بھی کسی سے کیا کم ہو اور تارے تمہارے ساتھ کھیلنے کو ترستے ہوں گے۔“ میں شکر کر رہا تھا۔

”کتنی ذرا ذرا سی تمنائیں دھول میں چھپے ٹوٹے ٹھیکروں کی طرح دل میں چبھتی اور کلبلاتی رہتی ہیں مجھے زندگی میں ہر چیز مل سکتی ہے میں اگر یہاں بیٹھ کر کسی شے کی تمنا کروں تو جاپان سے منگوانے والے بہت ہیں مگر یہ بتاؤ وہ گزرے زمانے کو واپس لا سکتے ہیں کوئی اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر بھی بیتا وقت نہیں دلا سکتا۔ کتنا بے مول ہے اور ہم اسے کیسے کوڑیوں کے مول بیچتے ہیں“

وہ چُپ ہو گئی۔

”تم تو فلسفی ہو گئی ہو بیگم مدحت حسین۔“ میں اپنے آپ کو بہت بڑا اور اس کا محافظ محسوس کر رہا تھا۔

”بیگم مدحت حسین۔“ اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”تم نے کبھی مدحت کو دیکھا ہے وہ کون ہے کیا کرتا ہے کبھی تم نے سوچا ہے اور مجھے بیگم مدحت حسین کہتے ہو۔“

مجھے یہ سب جاننے کی ضرورت بھی کیا ہے تمہارا وجود اور اُس کے گرد دولت کا ہالہ پھر اسرار اور پھر رازوں کا کچھ نہ کچھ پراسرار کچھ چھپے ہونا یہ کیا کافی نہیں ہے لوگ تمہیں بیگم حسین کہتے ہیں۔ میں بھی کہتا ہوں اصل میں مجھے رازوں سے پردے اُٹھانے کی عادت نہیں اور نہ ہی میرے دل میں کرید پیدا ہوتی ہے۔ یہ سارا معاشرہ ہی ایسا ہے ظاہر کچھ باطن کچھ۔ برسوں کسی سے ملتے رہو بس تمہاری ملاقات دہلیز تک کی جان پہچان تک رہے گی اگر بھولے سے اندر پاؤں رکھو تو لگتا ہے اندھیرے میں اُتر کر گہرے غاروں میں گھوم رہے ہو۔

میں چپ ہو گیا۔

”تم نے کبھی سوچا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟“ اُس نے میرے بازو میں اپنا بازو ڈال دیا ہم تقریباً اُس کے گھر کے برابر ہی آ نکلے تھے۔

”نورالنہار بیگم اگر آدمی سوچنے لگے اور ہر شے کا منبع تلاش کرنے لگے کھوج میں رہے تو جئے کیسے۔ بہت ہی جھٹکے کھانے کے بعد میں نے لوگوں کے متعلق اپنے ذہن سے بھی سوال کرنا چھوڑ دیا ہے۔ پتا نہیں یہ دولت کی ضرورت ہے یا صرف ایڈونچر ہے تجسس یا پھر محض اخلاقی گراوٹ یا شدت سے اپنے اندر خالی پن کا احساس ہونے لگا ہے اور روح کے سارے سوتے خشک ہو رہے ہیں کہ انسان بھٹکتا پھرتا ہے خوشی کی کھوج میں اور۔ اور۔ اور پیاس ہے کہ بجھتی ہی نہیں۔

”تم تو خاصے اخلاقیات کے طالب علم لگتے ہو آفندی حیرت ہے۔“

”نہیں یہ تماشے ہر روز میرے سامنے ہوتے ہیں۔“

"میں بھی ان مداریوں میں سے ایک ہوں بھائی ابھی تم شام کو میرے ہاں ایک تماشا دیکھنے والے ہو۔"

"نہیں میں نے دوپہر سے اب تک کا وقت تمہاری نذر کر دیا اب میں جاؤں گا۔ بلکہ میں خدا حافظ کہنا چاہوں گا۔" میں نے چلتے چلتے کھڑے ہو کر کہا۔

"سنو، بچوں کی طرح روٹھو نہیں میں پھر اس سلسلے میں تمہیں کبھی تکلیف نہ دوں گی کبھی نہیں قسم اٹھوا لو مگر آج شام ضرور آنا تمہیں کپڑے بدلنا ہوں گے اور مجھے بھی اس پرانی دیوار کی مرمت کرنا ہوگی۔" اس نے اپنے منہ کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی وعدہ کر لیا ایک حسین عورت کی منت کو آدمی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ تم نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ مشرق میں آسمان اپنی سیاہی اور ستاروں کی چمک کے ساتھ بہت ہی دلفریب لگتا ہے جیسے گھونگھرو پہنے رات ناچنے نکلی ہو کنواری مدھ بھری جس کے بالوں میں نیلے کنول ہوتے ہیں اور جوڑے میں ہیروں کی بینی نہیں وجد میں آئی ہولے ہولے جھومتی ہے اور ہوا کے ہلکوروں میں گیتوں کا رس اُتر آتا ہے پھر مسجد کے میناروں پر جھک کر سجدہ دیتے فرشتے اور مندروں کے کلسوں پر بیٹھے دیوتا سب ہی اس طاقت کو محسوس کرتے ہیں جو ناچ کے چکروں میں ہے۔ مگر یہاں بے شمار اُونچی عمارتوں پر لدا ہُوا شراب کی بُو اور اس سے حاصل کی لذتوں کو دیکھتا ہُوا سمندر سے اُٹھتا آزادی کے مجسمے کی حفاظت کرتا یو۔ این۔ او کے ایوانوں کی دلیری پر خاموش آسمان بس احتجاج کرتا لگتا ہے جیسے پھول سے خوشبو پھوٹتی ہے اُسی طرح زمین کی خوبصورتی آسمان کو بھی چھونے کے لئے اُٹھتی ہے سارے بندھنوں سے آزاد ہو کر مگر یہاں اسے دیکھنے کی فرصت ہی کسے ہے۔

میں جب نورالنہار کے ہاں پہنچا ہوں تو دیواروں میں سے روشنی پھوٹ رہی تھی جیسے ذرا ذرا سے چشموں سے پانی برستا ہے وہ نہ تمہاری پیاس بجھا سکتا ہے اور نہ تم اُسے اوک میں لے کر اس کی ٹھنڈک محسوس کر سکتے ہو تم تمنا ہی کرتے ہو کہ ذرا سا تھوڑا سا بس ایک گھونٹ اور ہوتا۔ کچھ بھی تو ٹھیک سے دکھائی نہیں دیتا تھا یہ نہ اجالا تھا نہ اندھیرا۔ لوگ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے اور وہ صاحب خانہ خود میں اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ آج جانے کیوں اس نے اپنے آپ کو کیسے سجایا تھا وہ کیا شے تھی اُس نے کیا پہنا تھا مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کسی کونے سے ہنسی کی جھنکار سنائی دیتی جو دوسروں کی محویت کو توڑ نہیں سکتی تھی سراپے ہیولے سائے کچھ واضح نہیں ہو پاتا تھا بیرے بے آواز قدموں سے چل پھر رہے تھے ڈرنکس کا ٹرے لئے۔ نورالنہار اپنے شرقی انداز کو ملحوظ رکھتی ہوگی ورنہ بار پر بھی خاصی بھیڑ تھی۔ کون کون تھا کسی کو معلوم ہی نہیں ہو پاتا تھا جب تک میزبان کسی سے تعارف نہیں کروائے نہ آنے والے کا نام بتایا جاتا تھا۔ میں نے آنکھیں پٹ پٹائیں انھیں پوری طرح سے کھولا مگر خوشبوؤں کے غیر مانوس سے دھوئیں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا جیسے الف لیلوی راتوں میں کارواں در کارواں جنات اُترنے والے ہوں۔ وہ شخصی حکومتیں تھیں جہاں سارا نظام حیات ایک اور طرح ترتیب پاتا تھا اور عورتیں سلطنتوں کی تقدیریں نہیں بنتی تھیں محلات میں اپنی ایک الگ دنیا آباد تھی جس سے متعلق افسانے گھڑنے کا لوگوں کو یونہی شوق تھا اور جہانگیری میں اگر نورجہاں جہاں بانی کرتی تھی تو داستانوں کی بھٹیارنیں عوام کے لیے سیاسی گفتگو کرنے کے لیے جگہ اور موقع مہیا کرتی تھیں متوسط طبقہ اور اس کی خواتین سیاست میں حصہ نہیں لے سکتی تھیں مگر یہ معاشرہ جس میں عورت کی روح تک برہنہ کر دی گئی ہے جس کے اسرار کے پردے نوچ لیے گئے ہیں یہاں کوئی کرشن بھگوان اس کی ستر پوشی کے لیے دریودھن

کے دربار میں نہیں اُترتے ۔

نورالنہار نے میرے پاس بیٹھ کر سرگوشی میں کہا ۔ "آنندی تم بیچارے کوئی گرل فرینڈ نہیں لائے تم اس ماحول میں اجنبی سی لگتے ہو۔"

میں نے اُس کے سفید کنول جیسے چہرے کو جو اس کمرے کے ملگجے اُجالے میں پُراسرار پانیوں پر تیرتا لگتا تھا. بہت قریب سے دیکھا اور ہنس دیا۔ "بھلا تمہارے ہوتے مجھے کسی کی کیا ضرورت ہے۔"

"نہیں نہیں۔" اُس نے ہاتھ کے اشارے سے جیسے میری تعریف کو پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔ "تھوڑی دیر میں ہم لوگ ان کو چھوڑ کر چلیں گے میں تمہیں ذرا دیر انتظار کرنے کو کہتی ہوں۔"

اور مجھے لگا جیسے میں کسی الف لیلوی کہانی کا کردار ہوں بغداد کے بازار سے بہلا کر کوئی نقاب پوش باندی نہایت پیچیدہ قسم کی بھول بھلیوں سے میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر یہاں لائی ہے یہ کسی شہزادی کا رات کا دربار ہے جہاں دیکھنے کی اجازت ہے سوال پوچھنے کی نہیں اور بہت زیادہ غور سے رازوں کو جاننے کی کوشش کرنے والے کا سر قلم کر دیا جاتا ہے۔ تو یہ تو یہ میں بھی کیا کیا سوچ رہا تھا۔ پھر کوئی نہایت ہی دل آویز دھن بجنے لگی اور کمرے میں آخری سرگوشی تک بند ہو گئی جیسے یہ کسی جادو کی آواز ہو کوئی اشارہ ہو۔

نورالنہار نے میرا بازو پکڑا۔ "آؤ"

میں بنا سوال کئے اس کے پیچھے چل پڑا۔ ایک پردے کے پیچھے رُک کر اُس نے رومانہ سے کچھ کہا۔

یہ حقیقی بھول بھلیاں تھیں پتا نہیں کیوں وہ دو چار کمروں کی دوری مجھے اتنی طویل کیوں لگی جیسے چلتے چلتے میرے پاؤں شل ہو گئے ہوں دروازوں کے نیچے سے روشنی کی کرنیں باہر آنے کی کوشش میں لگی تھیں اور آ نہیں پاتی تھیں پھر ہم لفٹ پر چڑھے اور اُوپر اور اُوپر مجھے لگا اب ہم بس چڑھتے چلے جائیں گے جیسے آسمان کی طرف جا رہے ہوں۔ وہ چُپ تھی۔ اپنے ستاروں بھرے پلو کے روپہلے کو سنبھالتی جاتی تھی اُن کی جوت پتہ نہیں کیوں بجلی کے لہریے کی طرح میری آنکھوں کو چندھیائے دیتی تھی۔ جب لفٹ ٹھہری دروازہ کھلا۔ زمین کہیں دور نیچے چھُٹ گئی تھی ہم سفر کرتے کرتے خلا کی وسعتوں میں آ نکلے تھے۔ آسمان کی نیلاہٹ آہستہ خرام ہوا اور پہلی راتوں کے تیرتے چاند کی زردی میں ملی ہوئی تھی بادلوں کی سفیدی کے پیچھے نور سا جھلکتا تھا۔ سردی میں نہ کاٹ تھی اور نہ ہی تیزی۔

نورالنہار نے سگرٹ سلگایا وہ میری طرف پشت کئے کھڑی تھی اور تمباکو کی خوشبو اُس کے جسم کی خوشبو اور اس کے کپڑوں میں بسے سینٹ کی مہک ایک ایسی پینٹنگ کی یاد دلاتے تھے جس میں رنگ گڈمڈ ہو گئے ہوں ایلورا اجنٹا کی وہ تصویریں جن میں جسم کی کشش زبردست اور ناقابلِ فراموش ہوتی ہے۔ جو پتھروں میں سے نکل کر زندگی میں قدم دھرنے والی ہوتی ہیں فلسفیوں نے کہا ہے زمین پر یہ زندگی صرف تصویروں کی سایوں کی حیات ہے جس کی اصل کہیں اور ہے ہم پر جھکی ہوئی نیلاہٹ اور اُس میں ٹنکے ہوئے تارے اور چاند پتا نہیں اس تصویر کی اصل کیا ہوگی؟ اور پتا نہیں نورالنہار کی اصل کیا تھی؟

"آنندی تمہیں یہاں سے نیچے دیکھنے پر کیسے لگتا ہے؟"

میں نے گرد اگرد پھیلی ہوئی روشنیوں کی قطاروں کو دیکھا۔ مندر کی بیشمار سیڑھیاں اور چھتوں کے سکڑتے ہوئے اپنے وجدان کے

الوہیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چبوترے جیسے سوریہ کا مندر یا پھر دراوڑوں کی قدیم تہذیب کے جادوئی نقوش جو مٹتے پر بھی نہیں مٹے اور نیچے سے اوپر تک روشنی ہی روشنی یہاں سے وہاں تک اپنے پُرانے پن میں بھی نہایت نئے اچھوتے اور آدمی کو حیرت زدہ کرنے کی طاقت رکھتے ہوئے اور اوپر اتنی زندہ نگاہیں جھپکتی ہوئی جھکتی ہوئی رنگ بدلتی ہوئیں پر شوق پُر ہیبت پُراسرار جیسے مندر کی چھت پس آنکھیں ہی آنکھیں ہوں اور پھر کسی کے خمدار ابرو کا سا چاند محبت کی شدت سے زرد اور اس کی قوت سے حیران" میں بتاؤں مجھے یہ سب وہاں لے جاتا ہے واخلط منزل کے اندر بوڑھی گنگا کا دھارا رات اور نوکاؤں میں دیئے جلتے ہوئے" وہ میری طرف مڑی" میں نے لاکھوں راتیں یہاں آسمان تلے گزاری ہیں مگر تم کب تک کھڑے رہ سکتے ہو آؤ بیٹھ جائیں" یہ ایک مختصر سا لکڑی کا کیبن تھا جس میں دو کرسیاں تھیں اور ایک صوفہ تھا جسے ضرورت پڑنے پر پلنگ میں تبدیل کیا جا سکتا تھا۔ ہم کرسیاں گھسیٹ کر باہر لے آئے۔

"سگریٹ پیو گے۔" اُس نے دو سرا سلگاتے ہوئے کہا۔" یہ نہایت عمدہ تمباکو ہے۔"

نہیں میرا جی نہیں چاہتا۔ ورنہ مجھے معلوم ہے کہ تم کسی گھٹیا چیز کا تو سوچ ہی نہیں سکتیں۔

اس کا قہقہہ یوں گونجا جیسے ہم کسی گنبد کے اندر ہوں خوفناک بازگشت کی طرح وہ دوبارہ سہ بارہ میرے کانوں سے ٹکرایا جیسے ستارے بھی ہنس رہے ہوں اور اس گنبد میں بند ساری صدیوں قرنوں پرانی آوازیں اس ایک ہنسی کے ساتھ مل کر کھلکھلا رہی ہوں پتا نہیں یہ بے چین کرنے والی آوازیں کہاں سے آ رہی تھیں نور النہار کے ساتھ مل کر یہ کون تھا جو ہنس رہا تھا۔ یا پھر یہ کھلی جگہ آسیب زدہ تھی۔

"بخدا آنندی اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات تم نے کبھی نہیں کہی ہو گی۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ چیزوں کے اس ڈھیر میں انسانوں کے اس ہجوم میں مجھ سے یعنی نور النہار بیگم سے گھٹیا کون ہو سکتا ہے۔"

"آدمی پر ایسی گھڑیاں آتی ہیں جب وہ اپنے اندر جھانکتا ہے تو اپنی پستیوں سے خود ڈر جاتا ہے اندھیرے سے گھبرا جاتا ہے اور پھر اس غار میں اترنے کے لیے ہمت اور جرأت چاہیے تم اس گھڑی بلندیوں سے نیچے کیوں جھانک رہی ہو؟" اتنی گہرائی میں غوطہ کیوں لگا رہی ہو کبھی واپس نہ آ سکو تو؟

"تم سمجھتے ہو یہ کارخانہ میرے بنا رک جائے گا۔ کائنات کا سانس تھم جائے گا؟" اس نے بہت ہی آہستہ سے کہا جیسے سرگوشی کر رہی ہو۔

"ہر آدمی جو دنیا میں آتا ہے۔ نظامِ کائنات کو چلاتا، آگے بڑھاتا ہے۔" میں نے رٹی رٹائی ہوئی بات کی آخر میں اور کیا کہتا۔

میں ہر آدمی نہیں ہوں آنندی میں نور النہار ہوں جس کا وجود کوڑھ کے داغ کی طرح ہے اور داغ کسی خوب صورتی میں اضافہ نہیں کرتے۔ وہ کسی نظام کو نہیں چلاتے۔ کوڑھیوں کو تو بستیوں سے دور رکھا جاتا ہے۔ مگر میں تم سب لوگوں کے درمیان رہتی ہوں اور تمہاری بربادی کا باعث ہو رہی ہوں۔

مجھے ایک جھرجھری آئی کرسی پر بیٹھے بیٹھے پسینہ آ گیا۔ میں نے اٹھنا چاہا مگر میری ٹانگوں میں طاقت ہی نہیں تھی میں نے بولنا چاہا مگر آواز نہیں نکلی۔ خوف سے میں وہیں جم کر رہ گیا میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اُس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے جیسے وہ گہرے کنوئیں کی تہ میں سے بول رہی ہو کہا۔

"آنندی عورت کا وجود راحت آرام اور تسکین کا باعث ہوتا ہے مگر میں سانس میں زہر لئے گھومتی رہی ہوں جس سے بات کی اُس کو برباد کیا جو میرے لیے پھولوں کی سیج بچھاتے رہے میں نے اُن کے لئے موت کی راہیں ہموار کیں۔" اور وہ پھر چپ ہو گئی۔

میں بھی نہیں بولا جس طرح زنجیروں میں بندھا انسان حرکت نہیں کر سکتا۔ مجھے کچھ کہنا مشکل ہو رہا تھا۔ اور وہ اپنے خیالوں میں مگن سر جھکائے بیٹھی تھی جانے وہ کن طوفانوں کی زد میں تھی؟

"مگر اس میں میرا کیا قصور تھا بھلا؟" وہ پھر خاموش ہو گئی۔ وہ مجھ سے زیادہ اپنے آپ سے مخاطب تھی وہ اکیلی اندھیرے غار میں اُتر رہی تھی۔ یا جیسے بنیادی سُر تبدیل ہو رہا ہو موسیقار اپنے اندر گونجتے گیت کے ساتھ اپنے ساز کے تاروں کو بھی ہم آہنگ کرنا چاہتا ہو جیسے بین سے سُروں کو جھوٹے ثابت ہونے سے بچانے کے لیے وہ کوشش کر رہا ہو۔"

"آنند تم کچھ کہتے کیوں نہیں ہو کیا سن نہیں رہے؟" اُس نے تاروں بھری رت کے دامن کو اپنی گہرائیوں سے پکڑنا چاہا۔

سن رہا ہوں مگر تم اس کرب کے عالم میں کیوں ہو؟ یہ بے چینی جو راحت کی زیادتی سے پیدا ہوئی ہے اس پر قابو پاؤ تمہارے مہمان بیٹھے ہیں تم اُن کے درمیان لوٹ جاؤ نورالنہار بیگم۔" "سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتی تھی کیا ثابت کرنا چاہتی تھی۔

جس دنیا کو میں پیچھے چھوڑ کر آئی ہوں تم مجھے اُس گہرائی کی طرف کیوں دھکیلتے ہو مجھے تباہی کے اس غار میں پھر اترنے کو کیوں کہتے ہو آنندی میں نے تمہارا سہارا لیا ہے۔ میں تم سے اور کچھ نہیں چاہتی سوائے اس کے کہ تم اُس نورالنہا۔ کی شکل دیکھ لو جو اُن باغوں اور ندیوں اور گیتوں کے دیس میں پیدا ہوئی اور اس کی تباہی کا باعث بھی ہوئی۔

میں کرسی میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ یہ عورت کیا ترچھی ترچھی کرتی باتیں بنا رہی تھی۔ بھلا ایک کم قیمت پرسکیٹ کیڑا اگر یہ کہے کہ اس نے کسی عمارت کو گرایا ہے تو کون یقین کرے گا؟ دل ہی دل میں میں نے کہا میں ہمہ تن گوش ہوں۔

وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی پھر اُس لکڑی کے کیبن سے باہر نکل کر اُس نے بجھتے ہوئے چاند کی مدھم پڑتی جوت کو دیکھ سگرٹ کو پھینک دیا اپنے ستاروں جڑے پلو کو برابر کیا۔

"کیا تم اس بات پر یقین رکھتے ہو کہ آدمی وہی کرتا ہے جو اس کے نصیب میں ہوتا ہے اور ماتھے کے لکھے کو کوئی مٹا نہیں سکتا۔" وہ اُس راہ میں کھڑی تھی عین دروازے میں جیسے اندھیروں اور اجالوں کے سنگم پر عجیب دگدے کے بیچ فیصلہ کرنا اور نہ کرنے کے درمیان چتا کے شعلوں کا عکس سا اس کے چہرے پر پڑ رہا تھا۔

عزم کئے ہوئے اور پھر بھی رُکی ہوئی جانے وہ کاہے سے ڈر رہی تھی؟ پتا نہیں وہ کیا کہنا چاہتی ہے کون سا گناہ ہے جس کا اعتراف کر کے یہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہے یا محض ایک ڈرامائی صورتِ حال پیدا کر کے خوش ہو رہی ہے محض اداکاری کا کمال ہے کہ اپنے ساتھ مجھے بھی گھسیٹ رہی ہے۔

میں نے کہا جب سے دنیا بنی ہے یہ جھگڑا کہ آدمی کے اپنے اختیار میں کیا ہے اور خدا نے اُسے کیا بنایا ہے۔ چلا آتا ہے۔ اور باقی بات حوصلہ کی ہے کبھی کبھار آدمی مشیت سے بھی ٹکر لے لیتا ہے اور اپنے اور میں وہ اپنی بات منوا لیتا ہے مگر ایسا ہوتا بہت کم ہے۔"

میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں آفندی مگر میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جن کے لئے خدا اپنے بنائے ہوئے نقشے میں تبدیلی کرتا ہے۔ صرف سوچتی ہوں خدا نے مجھے سرماندی کے اندھیرے پانیوں پر بھیج کر سدا اندھیرے میں کیوں رکھا۔ کیا وہ میرے نصیب میں ذرا سی روشنی نہیں لکھ سکتا تھا۔ میں جس رات پیدا ہوئی تھی آسمان برس رہا تھا اور دیئے میں تیل بھی نہیں تھا۔ طوفان گرج رہا تھا اور نوکا نیچے سے نکلتی سیلاب کی لہروں پر تنکے کی طرح بہی چلی جاتی تھی۔ تم نے کبھی بنگال کی برسات دیکھی ہے، کبھی وہاں گئے ہو۔ آدھا سال سیاہ گھٹائیں جھکی ہوئی برستی ہیں۔

"نہیں۔"

تو پھر تمہارے خیال میں بھی نہیں آسکتا کہ وہ موسم کیا ہوتا ہے جب آسمان بھی پانی کا بن جاتا ہے اور زمین بھی پانی بن جاتی ہے انسان ندیوں اور دھاروں اور طوفانوں اور ہواؤں کا مقابلہ کرنے کے لیے بالکل اکیلا ہوتا ہے۔ گرجتے ہوئے بادل آسمان کو آدمی کی نگاہ سے چھپا لیتے ہیں خدا کے اور اُس کے بیچ آجاتے ہیں۔ وہی ندی جو کل تک چپ چاپ اپنے کناروں کے اندر بہ رہی تھی۔ اُبل پڑتی ہے سوئی ہوئی ناگن کی طرح پھنکارتی ہوئی لہروں کی زبانیں نکالے۔ سورج دن میں ایک آدھ بار بے بس سا بوڑھا۔ اپنے لحاف کا کونا اٹھا کر جھانکتا ہے اور آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

یہ سب تو اپنی جگہ ہے مگر کیا خدا میرا نصیب ایسا نہیں بنا سکتا تھا کہ مجھے چاول کے بدلے کہیں اور بھیجا جاتا۔ عمدہ باجی سے میرا واسطہ ہی نہ پڑتا۔ اگر اس گھر کا دانہ میرے نصیب میں تھا تو مجھے کوئی اور کام دے دیا جاتا اُن کی خدمت بھلا مجھے ہی کرنا تھی؟

تم عمدہ باجی کو دیکھتے تو بس دیکھتے ہی رہ جاتے۔ تم نے بڑی بڑی آنکھیں دیکھی ہوں گی مگر وہ آنکھیں تو خدا نے اپنے ہاتھ سے بنائی تھیں اتنی روشن اور جادو کرتی ہوئیں جیسے اُن میں ستارے کوٹ کر بھرے گئے ہوں اُن کی چمک اندھیری سیاہ راتوں میں بھی دکھائی دے جاتی تھی۔" وہ پھر خاموش ہو گئی اور باہر دیکھنے لگی۔

"جانوروں کی آنکھیں بھی رات کے اندھیرے میں خوب چمکتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"شاید۔" اُس نے پھر ہولے سے کہا جیسے بے دھیانی میں کہہ رہی ہو اور پھر ایک دم اُس کو جیسے ہوش آ گیا۔ "آفندی کیا کہہ رہے ہو وہ آنکھیں دیکھ لیتے تو تمہیں سب کچھ بھول جاتا۔ بس یوں سمجھ لو جیسے مندر کے دوار کھل جائیں اور وہ پھر بھونرے کی سی پتلیاں اتنی سیاہ تو تم نے کالی رات میں کبھی نہ دیکھی ہوگی کالی سے کالی گھٹا بھی اُن سے کالی نہیں ہو سکتی تھی اور عمدہ باجی انھیں چہرے پر سجائے جیسے کوئی پھول لیے پوجا کرنے جاتا ہو۔ میں نے پہلے دن انھیں دیکھا تو میرا سانس اوپر کا اوپر رہ گیا۔ اُن آنکھوں میں سے اندھیرا روشنی بن کر جھانکتا تھا۔" وہ کرسی پر سے اٹھ کر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی۔ "مگر میں تمہیں عمدہ باجی کے عشق میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی کیا فائدہ۔" اُس نے اپنے بازو زور سے جھٹکے۔

میں نے کہا "کیا ان آنکھوں کے سوا بھی اس دنیا میں کچھ ہے۔"

اُس نے میری بات سنی ہی نہیں گردن جھکائے وہ اپنے پلو پر ایک دوسرے میں اُلجھے ستاروں کو سلجھا رہی تھی۔ "آفندی تمہیں معلوم ہوگا کہ نجومی ستاروں کی چالوں سے جو پتری ترتیب دیتے ہیں آئندہ کیا ہونے والا ہے سب بتا سکتے ہیں۔ مجھے کبھی کبھار ہنسی آیا

کرتی ہے انسان جس کو روٹی کے ایک ٹکڑے کے لئے در بدر ٹھوکریں کھانی پڑیں اتنے اوپر نامعلوم دوریوں پر ستاروں کے الجھاوے میں گرفتار ہو اور اس کی پیشانی پر لکھی ہوئی عبارت جانتے کیسے اُن کی چالوں کے چکر میں جو ایسی پیشانیاں جن پر نُور چمکتا ہے نہ روشنی ہوتی ہے تمہیں یہ بات عجیب نہیں لگتی ؟

"رات بہت کم ہے اور تم عمدہ باجی کی بات کرتے کرتے کہاں جانکلی ہو۔"

"ٹھیک کہتے ہو کہ میں عمدہ باجی کی بات کرتے کرتے کہاں جانکلی ہوں مگر رات کم ہے یہ غلط ہے رات تو اتنی لمبی ہے کہ اس کی صبح ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔"

مجھے تو اس کے صحیح الدماغ ہونے میں شک ہونے لگا تھا مگر میں کر بھی کیا سکتا تھا بہر حال مجھے اس کی باتیں سُننا تھیں

عمدہ باجی مجھ سے یہی کوئی چار چھ سال بڑی ہوں گی - جوان ہوتی لڑکیوں میں جو ایک بے کلی ہوتی ہے وہ ان میں بالکل نہیں تھی سوئی ہوئی سی نہایت سادہ ذرا سی اداس پہننے والی زرد چہرے والی لڑکی جو زندگی سے ضرورت سے بہت کم دلچسپی لیتی ہو ویسے وہ بیمار نہیں تھیں دھان پان ہونے کے باوجود اُن کی صحت نہایت اچھی تھی - کچھ کرنے کی تمنا لیے ہوئے - مگر یہ سب کچھ تو مجھے بہت بعد میں پتا چلا - آٹھ نو سال کی بھوکی لڑکی جس کی آنکھوں سے وحشت برستی تھی پھٹی پرانی سا ری پہنی تھی جس سے اُس کا پورا تن نہ ڈھک سکے بھلا ایسی باتیں کیا سوچ سکتی تھی ؟ وہ پھر رُکی ۔ "جب آدمی کا پیٹ بھرتا ہے اس کا تن ڈھانپا جاتا ہے تو اُس کی آنکھوں کی وحشت کم ہوتی ہے اُسے نت نئی باتیں سوجھتی ہیں ـــــ" میں نے بہت لاتعلقی سے کہا۔

"یہ نت نئی نہیں بہت پرانی باتیں ہیں - اور جب آنکھیں کھلتی ہیں تو پتا چلتا ہے کہ رات ختم ہونے میں نہیں آتی - مگر یہ تم طعنے کیوں دے رہے ہو کیا تھک گئے ہو؟ وہ اچانک پلٹی چلو آؤ چلیں میں تمہیں بیزار نہیں کرنا چاہتی۔

"تمہیں عمدہ باجی بہت پسند تھیں" میں نے اُس کی بات کو اَن سنی کرتے ہوئے کہا۔

جب سات بھائیوں کی اکلوتی بہن جو تمہاری مالکن بھی ہو تم سے اچھا سلوک کرے تو تم اس کے لیے سوائے سپے اتحاد پیار کے اور کیا محسوس کر سکتے ہو۔" اُن دنوں" نور النسا نے کانپ کر کہا شاید اب اُسے کھلی ہوا اور سردی کا احساس ہو چلا تھا۔ "بھوکے لوگوں کے قافلے شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں مارے مارے پھرتے تھے اور میں دل ہی دل میں خوش ہوتی تھی کہ میں محفوظ ہوں مجھے روٹی مل رہی ہے - بلا سے میرا بابا مجھے بیچ گیا ہے - پر وہاں سدھا کے دھارے پر آدمی بنا کھائے پیئے کب تک جی سکتا تھا - جی اُداس ہوتا تھا مجھے میرا منا بھائی یاد آیا کرتا تھا وہ اور میں مل کر کتنے کھیل کھیلتے تھے مگر اب وہ اور میں چھپنے کا لمبا کھیل کھیل رہے تھے اب تک کھیل رہے ہیں خیر یہ تو ایک علیحدہ بات ہے جب گھسٹتے ہوئے مردہ وجود گلیوں میں ایک مٹھی چاول بھی نہیں پا سکتے تھے تو چپ چاپ کسی دہلیز کے باہر کسی سڑک کے کنارے لیٹ جاتے تھے - تم وس کر بھی نہیں چل سکتے تھے بنا ایسی لاوارث لاشوں کو دیکھے ہوئے۔" وہ بہت دیر چپ رہی۔

"تم نے گیا میں وہ مندر کہاں دیکھا ہو گا بھلا جس میں بھگوان بدھ ایک بچارن عورت سے چاول جھپٹ رہے ہیں سا کی منی گوتم جس کی تعلیمات دنیا تج دینے کی تھیں جس نے جنگلوں میں گھوم کر غاروں میں پہنچ کر گیان کی روشنی کے لیے نروان حاصل کرنے کے لیے عبادت کی - وہ بھی ایک مٹھی چاول کے لیے بیتاب ہوئے - جب پیڑ کے نیچے انھیں نجات کا راستہ نظر آیا ہے تو وہ یقیناً

پیٹ کا دوزخ بھر کر ہی بیٹھے تھے مجھے کو نہ خدا دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی اپنی نجات کی فکر ہوتی ہے۔ مگر تمہیں کبھی کاہے بھوک کے ایسے نظاروں سے واسطہ پڑا ہوگا؟

اُن دنوں بھائی لوگ بہت مصروف رہتے۔ دہلیز پر سے لاشوں کو ہٹانے کا کام بھوکوں کے لئے روٹی مہیا کرنے کا اپنے طور پر مدد کرنے میں جُتنے رہتے۔ بڑے گھر کی ڈیوڑھی میں ذرا دیر کے بعد بھیڑ لگ جاتی اور عمدہ باجی ریڈیو بند کر دیتیں کانوں پر ہاتھ رکھے وہ بولائی بولائی پھرتیں دالانوں اور کمروں میں۔ پھر مجھے زبردستی کھانا کھلاتیں اور کھاؤ اور کھاؤ۔

کالی چرن سرکار بڑے بھائی کے بچپن کا دوست تھا بڑا جوشیلا اور نہایت تیزی سے باتیں کرنے اور نہایت تیز چلنے والا یہ لڑکا جس کی باتوں کی آواز باہر سے اندر چلی آتی تھی۔ امیر لوگ غریبوں کی محبت میں ان کی ہمدردی میں انقلابی بنتے ہیں۔ تمہیں بھی اس بات کا تجربہ ہوگا کبھی کسی بھوکے نے بغاوت کا جھنڈا نہیں اٹھایا۔ میں نے فاقہ کشی کی اذیت سے نجات پائی اور گرد و پیش دیکھا تو فضا میں ایک اور خطرہ منڈلا رہا تھا۔ جنگ کے سائے بڑھا اور پھیل رہے تھے جاپان کی توپوں کی گھن گرج سرحدوں سے پرے سنائی دے رہی تھی جنوبی ایشیا کے آتش فشاں جزیروں پر اوپر سے آگ برسائی جاتی تھی اور سمندر کی پہاڑوں سے بھی بلند موجیں اُس آگ کو بجھا نہیں سکتی تھیں۔ بھائی لوگ اور کالی چرن اور نہ نے کتنے دوست اپنے اُبلتے ہوئے جذبات کی تسکین کے لئے خوف و ہراس کی اس فضا میں سرگوشیاں کرتے تھے وہ تیزی سے آتے جاتے عجیب سے خوابوں میں لگے۔ بتے تہ خانوں میں گیت سنتے اور گاتے نامعلوم سے ٹکرا اور اُسے تباہ کرنے کا عزم لئے ہوئے اس کے باوجود کہ خود ساختہ قحط نے پورے بنگال کو حواس باختہ کر رکھا تھا ایک حد تک تو حکمران اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تھے مگر پھر بھی اُنھیں اپنے قدم ڈگمگاتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ اور وہ جال کی ڈوری کو اور تنگ کرتے جاتے تھے۔ میں نے آنکھ کھول کر اس فضا کو دیکھا اور بارود کی بُو اس سے پہلے کہ میں اس کو دوسری اور بوؤں سے الگ کر سکتی سونگھی تھی۔ انقلاب کا لفظ سنا۔ ہمارے ہاں موسم شدید ہوتے ہیں نا۔ اپنے جذبوں کے اظہار میں بھی نہایت شدت اختیار کرتے ہیں ہم لوگ۔

وہ چپ ہو گئی گویا بہت سی یادوں میں سے منتخب کر رہی ہو جیسے لوگ نمائش کے لیے چیزوں کا چناؤ کرتے ہیں اور میں سوچ رہا تھا اب یہ عمدہ باجی کو بھول چکی ہے۔

کالی چرن مجھے پہلے پہل بہت اچھا لگا۔ بجلی تھی اس کی آنکھوں میں تیزی سے باتیں کرتا ہوا۔ ہنستا ہُوا اس کا چہرہ مجھے بھلا لگا کرتا مصروف اور یکایک خفا ہو کر کسی بھی بات کو برداشت نہیں کرتا تھا اور لگتا ایک بم کی طرح وہ ابھی پھٹ پڑے گا۔ اس میں رکھ رکھاؤ نام کو بھی تو نہیں تھا جیسے بہادروں میں ایک حلم ہوتا ہے وہ اس کی طبیعت میں دور دور تک دکھائی نہ دیتا جھگڑالو اور آگے بڑھ کر مصیبت کو گلے لگانے والا غصے سے سیاہ چہرہ کئے اپنے ہی پیچھے چلنے اور من مانی کرنے والا۔ شاید وہ مجھے اور عمدہ باجی کو اس لیے پسند تھا کہ وہ بھائی لوگوں سے الگ تھا۔ ہمارے گرداگرد مفلٹ اور روپے اور جھنڈے اور بچنے کی سکیمیں پھیلی رہتیں اور ہم ڈرتے کانپتے بھوک کے مارے کال کے مارے لوگوں کے بیچ مستقبل میں اور دُور پرے دیکھتے رہتے۔ یہ ساری باتیں اُن دنوں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ میں نے لکھنا پڑھنا بہت بعد میں سیکھا ہے مگر خیر یہ بھی تو سب بعد کی باتیں ہیں۔ میں بہت ذہین نہیں ہوں باتیں میری سمجھ میں مشکل سے ہی آتی ہیں۔ اُن دنوں بھی یہ سب کیا ہو رہا تھا میری سمجھ میں بھلا کہاں آتا۔ میں کال کی ماری لڑکی

جس کی آنکھوں سے ابھی بھوک کی وحشت بھی دور نہیں ہو پائی تھی۔

"آفندی انقلاب کا کھیل کھیلنے کے لیے جوان ہوتے بچے ہی ٹھیک رہتے ہیں۔ اُن کے دل میں صرف اُمید ہوتی ہے اور بس کوئی لالچ کوئی ذاتی غرض پوشیدہ نہیں ہوتی تو میں یہ قربانی دیتی ہیں آزادی کی قربان گاہ پر یہ بھینٹ چڑھانی ہی پڑتی ہے۔" اُس نے بالکل نئی آواز میں کہا۔

پھر جانے کیا ہوا وہ سب انڈر گراؤنڈ ہو گئے۔ گھر کی تلاشی لی گئی۔

عمدہ باجی سب میں چھوٹی تھیں سبھی اس کا دلار کرتے تھے اور وہ ان دنوں سب سے زیادہ مضطرب رہتیں۔ ہاں ہر وقت نماز پڑھتیں اور انہیں میں نے بہت کم دیکھا تھا۔

آنگن اور دالان اور حویلی کے اندر پیڑوں کے جھنڈ اور بڑا تالاب اب اُن کا گویا یہ بھی بھول گئے تھے۔ ایک سناٹا تھا جس میں خود اپنے پاؤں کی چاپ اجنبی لگا کرتی۔ اتنا شوق ہو گیا تھا اُن صورتوں کو دیکھنے کے لیے جی ترس گیا۔ عمدہ باجی کو چپ لگ گئی۔ کوئی سرگوشی بھی نہ گونجتی۔ سورج نکلتا اور ڈوبتا، بارات آتی اور جاتی۔"

"کبھی کبھار نہ جانے پر بھی آدمی تباہی کا باعث بن جاتا ہے۔ ایک دن مہندی جوڑی بیچنے والی بڑی ڈیوڑھی میں سے گزر کر آئی اور کسی اور کو سامنے نہ پا کر مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ چیزوں کا ہوکا مجھے سدا تھا اور پھر ریشمی چوڑیوں کی کھنک اُن کے دل میں کھُب جانے والے اتنے بے شمار رنگ جیسے بادلوں میں دھنک اور بناپیسوں کے وہ مجھے اتنی چیزیں دے رہی تھی۔ منی تم اس گھر کی بیٹی ہو؟

اس کی آنکھوں میں چھپی ہنسی اتنے زمانوں کے پار سے مجھے آج بھی اُس طرح دکھائی دیتی ہے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور اِٹھلا کر کہا تھا۔ ہاں بالکل۔"

اگر تم اس گھر کی بیٹی ہو تو تمھیں پتا ہو گا کہ تہ خانے کو کون سا راستہ جاتا ہے۔

"ہاں بالکل۔" میں نے سرخ چوڑیوں پر ہاتھ پھیر کر کانوں میں اُن کی کھنک کو محسوس کیا۔

"بھلا بتاؤ تو کدھر کو جانا ہوتا ہے۔" اُس نے بہت ہولے مجھ سے پوچھا۔

اور میں نے عمدہ باجی کے کمرے میں الماری کے اندر سے نیچے اترنے والے راہ کا بتا دیا میں گھر کی بیٹی تو تھی۔

اسی شام میں باورچی خانے کے اندر ڈاب پی رہی تھی اور عمدہ باجی کمرے میں تالاب میں سے نہا کر گئی تھیں جب تلاشی لینے والے پھر سے آ گئے انھیں روکنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ چیختی رہیں اور کسی نے پروا نہ کی۔

وہ ساڑھی لپیٹ رہی تھیں کہ اُنھیں الماری کے سامنے سے نہایت بے دردی سے ہٹا کر پولیس والے اندر گھُس گئے۔ میں کسی کمرے میں جا چھپی۔

آج تک اس گھڑی تک کسی کو نہیں بتایا کہ اُس گھر کی تباہی میرے ہاتھوں ہوئی تھی۔

بھائی لوگوں میں سے تین بڑے انڈمان بھیج دیئے گئے اور باقی چھوٹے عمر قید میں اور کوئی دس سال کے لئے ناقابل معافی جرموں کے بدلے جیل بھجوا دیئے گئے۔ کچھ دنوں مجھے کسی سے بھی آنکھیں ملانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ عمدہ باجی کمرے میں بال کھولے

چپ چاپ بیٹھی رہتیں انھیں کپڑے کا ہوش نہیں تھا۔ کبھی میری طرف دیکھ کر کہتیں "نوری اچھا یہ تم ہو"۔
کالی چرن پر بہت دنوں مقدمہ چلا۔ ام کیس میں اُسے پھانسی ہو گئی۔ کیسی کیسی صورتیں تھیں۔ کیسی کیسی رونقیں تھیں۔ کتنے بھرے پُرے گھر ویران ہو گئے۔ حویلی میں اُلو بولتے تھے۔
مگر زندگی ظالم اور کٹھور اور کسی کے روکے رُکنے والی نہیں نا! آنگن میں کسی نے سہاگ کے گیت نہ گائے اماں بی نہ رہی تھیں عمدہ باجی کو رخصت کر دیا گیا۔ وہ مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑے تھیں! ور اُن کا ہاتھ آتنا ٹھنڈا تھا بالکل یخ۔
بظاہر وہ ٹھیک تھیں مگر اپنے کمرے میں جاتے ہی وہ ساڑھی نوچ کر اُتار پھینکتیں اور پلنگ پر گر جاتیں۔ پھر اپنی پٹاری میں سے چاندی کے روپے نکال کر اپنے چاروں طرف پھیلا لیتیں اور اُن پر چلتیں۔ دولہا میاں شمس الدین ابوالفخر کچھ دنوں ان کی دلجوئی میں لگے رہے اور پھر وہ بھی اپنی دلچسپیاں باہر ڈھونڈنے لگے۔ اور پھر انہوں نے مجھے تاکا دوسری بار اپنی مرضی کے بنا میں جو عمدہ کے لیے جان دے سکتی تھی۔ اس کے راہوں کی روشنی کو بجھانے کا باعث ہوئی۔
"نور النہار" عمدہ باجی ایک دن بڑے رسان سے کہنے لگیں "مجھے خوشی ہے ابوالفخر تمھیں پسند کرتے ہیں"۔ پھر وہ اٹھیں اور انہوں نے اپنی ساڑھیاں زیور سنگار کی چیزیں لا کر میرے سامنے ڈال دیں۔ "ایک طرح سے تو تمہارا بھی ان چیزوں پر حق ہے نوری" میں شرم سے زمین میں گڑ گئی مگر بہر حال حقائق سے آنکھیں کون چرا سکتا ہے جب سورج سامنے ہو تو کون اسے دیکھنے سے انکار کرے گا۔
میرا دل آتی بہت سی باتوں کے لئے کٹا کرتا ہے گزرا زمانہ کبھی صرف ایک گھڑی ایک پل لگا کرتا ہے۔ اور بیتی باتیں جو جانے کب بیتی تھیں ابھی ذرا دیر پہلے کی لگتی ہیں کیونکہ دولت کے انبار اور زیور اور کپڑا اور رعنائی ہوئی عزت سب بیکار ہوتی ہیں، یادوں کے جس دوزخ میں میں جلتی ہوں اُس سے مجھے کبھی چھٹکارا نہیں مل سکتا۔ اگر مجھے فخر کے لئے عمدہ باجی کو دھوکا دینا پڑتا تو اور بات تھی مگر انہوں نے تو پرانے کپڑے کی طرح اُسے یوں اُٹھا کر مجھے دان میں دے دیا جیسے وہ بھکاری کو روٹی دیا کرتی تھیں اور خود انہوں نے جوگ لے لیا۔
"وہ پھر ٹھیک نہیں ہوئیں"۔
اُسی گھر میں روز اُن کے سامنے جانے سے جو میری حالت ہوتی تھی اُس خوف سے جو مجھے ان کی سونی سیج کو دیکھ کر ہوتا تھا بچنے کے لیے میں نے فخر سے کہہ کر انہیں گھر بھجوا دیا۔ اُن کے مائکے ٹھر۔
وہ بہت دنوں زندہ نہیں رہیں۔ میں کس قدر منحوس قدم ہوں جہاں گئی تباہی میرے ساتھ ساتھ رہی"۔ کئی لوگوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے اور اس میں اُن کا کیا قصور۔ بنانے والے نے انھیں ایسا بنایا"۔
میں نے اُسے کوئی تسلی کے لفظ کہے۔ ہمارے سروں کے اُوپر سے ایک جیٹ گرجتا ہوا گزر گیا۔ رات اپنا آدھا سفر طے کر چکی ہو گی۔ سیاہی مائل نیلاہٹ میں سات ستاروں کا چھوٹا سا قافلہ سفر پہ نکلا کہکشاں سائنس کی ترقی کے باوجود اپنے رازوں کے اخفا کے خوف سے اور زیادہ سفید اور ستاروں کے غبار کو اور زیادہ دبیز بنا کر رتھ کو تیزی سے بھگائے جاتی تھی۔
عمدہ باجی بھلا کیسی ہوں گی؟ میں نے جی میں سوچا۔ ہندوستانی اصنام گری کی صنعت میں اُسے کس کے ساتھ رکھا جا سکتا تھا؟

کسی یاکشی کے ساتھ یا وہ بہت جو سانچی کے کھنڈرات سے برآمد ہوئے بُت گروں نے اپنے خیال کے مطابق عورت کے جسم کی ساخت کو جیسے پسند کیا انھوں نے بہت بنانے کو پایۂ کمال تک پہنچائے جانے والے زمانے سے بہت پہلے یہ یاکشیاں بنائیں آدمی اور دیوتاؤں کے بیچ بیچ یہ مرد اور عورتیں جو مافوق الفطرت طاقت بھی رکھتے تھے۔ اپنے مشاہدے اور تجربے سے یاکشیوں کے جو مجسمے فنکاروں نے بنائے اُن میں جسم کے بعض حصوں کو زیادہ پُرکشش بنایا گیا۔ یہ دلآویزی ایک تہہ دار شخصیت کی آئینہ دار تھی۔ سینہ اور کولہے زیادہ نمایاں کثیر اولاد عورت بھرے پُرے گھر کی دیوی جو ماں بھی ہے اور بیوی بھی اور پھر اس کی آنکھوں میں بے چینی ہے مونالیزا سے صدیوں پہلے کی ہے۔ ان مجسموں کی مسکراہٹ جو چہرے سے ہی نہیں پورے جسم کی انگ انگ کی شرکت سے مل کر بنی لگتی ہے۔ پُرسکون ٹھہرے ہوئے مطمئن مجسمے جو عریاں ہیں اور اپنی جادوگری میں بے مثال ہیں۔ زیوروں سے سجے ہوئے بازو اور کان اور سر یہ سنگار کے سارے لوازمات، سینے پر بڑی بالائیں، ناف کو چھوتی ہوئی پیالے کی طرح کا پیٹ کولہوں تک پھیلا ہوا۔ متوازن سے ذرا زیادہ گولائیاں اور رانوں کی قوسیں پاؤں کی ایڑیوں تک لمس آنچ دیتے ہوئے جسم جیسے اپنے پتھروں کے قید خانے سے ابھی باہر نکلیں گے۔ بھلا عمدہ باجی یاکشی سے کیا نسبت رکھتی ہیں؟ وہ جس نے اپنی زندگی کی نفی کی اور اپنے گرد سارے موجود لوگوں کی نفی کی شمس الدین ابوالفخر کی نفی کی نورالنہار بیگم کی نفی کی۔ آدمی جب اپنے وجود کی پرداخت کرتا ہے تو گویا زندگی کو خدا کی طرف سے ایک تحفہ سمجھتا ہے ایک امانت سمجھ کر اُسے سنبھالتا ہے اس سے محبت کرتا ہے ہاں آدمی اپنی ساری کوتاہیوں کے باوجود زندگی کی شدید چاہت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ زندگی اور اُس آسودگی کے مجسمے بناتا ہے اور اُسے فن کا نام دیتا ہے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور اُس کوشش کو مختلف وجود دیتا ہے اور انھیں فن پارے کہتا ہے جتنی بھی ممکنات ایک خیال میں ہوسکتی ہیں اُن سب کو ہیئتوں کی وساطت سے ظاہر کرنا۔ اصل کے ساتھ رشتے قائم کرنا اور اُن مختلف ہیئتوں سے اس ایک نقطے تک پہنچنا جسے انتہا کہا جاسکتا ہے ابد جہاں سب چیزیں معدوم ہوتی ہیں ملتی ہیں اور ایک ہو جاتی ہیں۔ دنیا اور اُس کے کاروبار میں غور کرنے والوں نے اپنے خیالوں کو ایک جامہ دیا انھوں نے اَن دیکھی سمتوں اور طاقتوں اسرار اور عجیب غریب دنیاؤں تک اس کے ذریعے رسائی حاصل کی۔ خدا کا تصور اُن کے نزدیک اسی ایک راستے سے ممکن تھا۔ بُت تو یوں سمجھ لیا جائے نقشے ہیں جو اُس کی ذات کا احاطہ کرنے سمجھنے کے لئے صرف اشارے ہیں۔ خوب صورتی کی ایسی ترتیب جو ہر انسانی خوبصورتی سے بلند و بالا ہو۔ مگر خیال کی رسائی آخر محال تک انسان کے ناتے ہوتی ہے انسانی ذہن اپنے آپ کو کتنا بھی ماورا کے ساتھ منسلک کرے، رہے گا تو آدمی کا ذہن ہی نا۔ اور اس کے باوجود کہ دیوتاؤں کے بُت بناتے ہوئے انھیں لامتناہی طاقت کا منبع ثابت کرنے کے لئے اَن گنت ہاتھ بنائے گئے شکتی کا مظہر پھر بھی انسان ہی رہا۔ ہر انسان سے الگ ہونے کے باوجود اَن دیکھے خدا کو اور اُس کی طاقتوں کو مختلف قوموں نے جتنے بھی نام دیئے اُس کے جتنے بھی بُت بنائے وہ پھر بھی اُن کے ذہن کے احاطے سے بلند رہا۔ بڑے بڑے مندر پُرہیبت معبد تعمیر کئے گئے۔ سورج، اگنی، ہوا، بارش اور پُراسرار طاقتوں کو دیوی دیوتا بنا کر اُن کی پوجا کی گئی مگر خدا ان دیکھا انجانا ہی رہا۔ معبد زمین بوس ہو گئے مندر کھنڈرات میں بدلے انسانی ہاتھوں کے کام فنا کے راہ میں آئے اور مٹ گئے۔ یاکشیاں اور یاکش۔ دیویاں اور دیوتا اور وصال کی ساری پگڈنڈیاں بالآخر خیالوں اور فلسفوں اور بحثوں

کے جنگل میں گم ہوگئیں انسان کی مضحکہ خیز کوششوں کے درخت بار آور ہوئے اور مرجھا گئے۔ جیسے بس ذرا سی آنچ کی کسر میں کیمیاگر اپنی عمر برباد کرتے ہیں۔ خود انسان کو اپنا ذہن اور اپنے راستوں سے شناسائی نہیں ہو سکی۔ ایک آدمی ایک وقت میں ایک کام کرتا ہے سوچتا ہے جیتا ہے آخر کیوں۔ وہ کون سے عوامل ہیں جو اُسے ایک خاص طرزِ زندگی طرزِ احساس عطا کرتے ہیں۔ اُس پر کونسی چیزیں اثر انداز ہوتی ہیں؟

مختلف آب و ہوا اور خطوں میں رہنے والے لوگ ایک دوسرے سے اتنے مختلف کیوں ہیں؟ قومیں مذاہب آخر کیا فرق ڈالتے ہیں!

خون میں جو وراثتیں ملتی ہیں وہ آدمی کو کیا بناتی ہیں؟

اور پھر انسان اتنا مجبورِ محض کیوں ہے؟

انسان نے علم کی انتہا نہ ہونے کے باوجود کون اس بات کی توجیہہ کر سکتا ہے کہ عمدہ اور نورالنہار کیوں مختلف ہیں؟

ہر سوال کے اتنے پہلو ہیں نفسیاتی اور جانے کیا کیا؟

بھلا عمدہ باجی کو کیا دُکھ تھا؟

آدمی کو اتنا سخت جان بنایا گیا ہے کہ وہ ہر مصیبت کو جھیل جاتا ہے وقت کے ساتھ بھول جاتا ہے! مگر عمدہ کیوں نہ بھول سکی اور اگر بھول بھی نہیں سکی تو اُس کی عریانی اُس کا چاندی کے سکوں پر چلنا یہ سب کیا تھا۔ وہ آخر کیوں یہ کرتی تھی!

فضا آوازوں اور شور اور بوؤں اور گرج سے بھری تھی ناپاک اور تلاطم۔ میں اور نورالنہار اب گرجتے طیاروں کے شور کو سن رہے تھے نیلاہٹ میں رنگ برنگ روشنیاں اور ہم دونوں سے بھی کم تر اپنے اپنے خیالوں میں گم نورالنہار بیگم میں ایک بات پوچھنا چاہوں گا۔ کیا عمدہ بیگم پاگل ہو گئی تھیں؟

تم نے کیسے سمجھ لیا آفندی کہ وہ پاگل ہو گئی تھیں؟ اُس نے تیزی سے کہا۔ اُن میں سوجھ بوجھ دنیاداری سگھڑاپا سب کچھ تھا صرف یہ کہ وہ عام لڑکی نہ تھی۔ دوسری لڑکیوں سہیلیوں کے درمیان وہ چاند کی طرح جگمگاتی تھی جیسے شہزادی ہو میں اسے دیکھ کر رشک کرتی تھی کہ اُسے کسی کی نظر نہ لگے۔ اور پھر ہولے سے اُس نے کہا "اُسے ضرور کسی نہ کسی کی نظر ہی لگ گئی۔"

"یہ تم کہہ رہی ہو نورالنہار بیگم اتنی آزاد خیال فیشن ایبل اور تقریباً نئی عورت۔"

جھلک کر نورالنہار نے سگریٹ سلگایا گہرے کش جیسے دھوئیں کی لکیر اپنی سفیدی کی وجہ سے دکھائی دی "میں بیتی ہوں اس لئے تم مجھے نئی عورت کہتے ہو۔"

"بھئی کمال ہے میری بات کا پہنے سے نہیں تمہاری سوچ سے تعلق ہے۔ تم بندھنوں اور روایتوں میں یقین نہیں رکھتیں تم میں بے پناہ اعتماد ہے تمہاری شخصیت میں ایک دل فریبی ہے جو مسحور کرتی ہے۔ میرا مطلب ہے تم گھر میں رہنے والی اُن سب عورتوں سے مختلف تو ہو نا۔" میں رُکا۔

ہاں آفندی تم ٹھیک کہتے ہو اُس نے آہ بھر کر کہا۔ کتنا کتنا میرا جی چاہا کرتا ہے کہ میں بھی وہ شرمیلی لڑکی ہوتی جو اجنبیوں کو دیکھ کر گھبرا جاتی ہے اور ماں کی پُشت پر پناہ کے لئے چھپتی ہے جو باپ سے بھی خوف زدہ رہتی ہے اور اس کے باوجود اُس

کے چھوٹے موٹے کام کرکے خوش ہوتی ہے۔ ———— جو کپڑے دھوتی ہے اور چھوٹے بھائیوں کو گولے پر لادے رہتی ہے۔ ناریل کے جھنڈوں میں آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے بڑی ہوتی ہے اور تالاب میں ڈبکیاں لگاتے لگاتے ذرا ذرا سے خواب دیکھتی ہے۔ چوڑی والے کے آنے پر ریشمی چوڑیوں کے لیے ضد کرکے روتی ہے اور اپنی پھٹی ساڑھی کو نہایت حسرت سے تکتی ہے کہ کس دن اُسے بھی کوئی نیا کپڑا نصیب ہوگا۔ وہ چپ ہوئی تو میں نے کہا: "کیسے جاؤ کیسے جاؤ۔"

"تمہارا بات کرنے کا انداز ایک تحلیل نفسی کرنے والے ڈاکٹر کا سا کیوں ہے؟" وہ ہنسی "لاحول ولا قوۃ تم تو نقطہ پکڑتی ہو اور پھر کہتی ہو کہ تم وہ لڑکی ہو میں بھی تم میں شرمیلی لڑکی بننے کے جراثیم شروع سے ہی نہیں ہوں گے۔"

"ہم دونوں مل کر پاگلوں کی طرح ہنستے رہے۔ آفندی"۔ اُس نے پیٹ پکڑے پکڑے کہا "تم میں بے پناہ مزاح کی حس ہے۔"

"ہوسکتا ہے یہ سب محض اپنے بچپن کی طرف لوٹنے کی میری تمنا ہو جو مجھے تھی گی۔ مگر اُن حسرتوں کا کیا کروں۔ جب کسی مانجھی کو دیکھتی کہ ٹمٹماتی اپنی دلہن کو لئے جاتا ہے اور وہ سہمے سہمے قدم دھرتی اپنی ناؤ میں بیٹھنے کے لیے کنارے کے پتھروں پر ڈگمگاتی جاتی ہے تو میرا دل حلق میں اٹک جاتا۔ آفندی تھوڑے سے اُلٹ پھیر سے وہ میں بھی ہوسکتی تھی جب رنگ برنگ جھنڈیوں سے سجی نوکائیں باراتوں کو لئے آتیں تو میرا جی ڈول جاتا۔ اب بھی ڈر لگتا ہے۔"

"اندر سے آدمی بدل نہیں جایا کرتا۔" میں نے کہا۔" اور یہ بات ثابت ہوگئی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو میں نئی عورت ہوں اور شاید بیکار کی تمنائیں میرے دماغ کو چکراتی رہتی ہیں پھر یہ تو دیکھو"۔ اُس نے میرا کندھا پکڑ کر کہا۔ "ہر عورت کی طرح میری یہ خواہش تھی کہ میں کسی ایک کے قبضے میں ہوتی۔ ایک گھر ایک شوہر۔"

بیکار محض بیکار۔ اس زمانے میں جب لوگ چاند پر جا رہے ہیں اور شادی کا رواج پچھلے زمانوں کی بات ہے تم کیوں یہ سب سوچتی ہو۔ معاشرہ ہر جگہ آزاد ہو رہا ہے

نسلیں اپنی ہئیت بدل رہی ہیں۔ شادی کے بندھن اب فرسودہ ہو چکے ہیں۔ نئی جوان ہوتی دنیا اس مضحکہ خیزی اس ڈرامے کو تفریح بھی نہیں سمجھتی۔ سوچو تو سہی ایک آدمی اور ایک عورت بیوقوفوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوئے چلے جا رہے ہیں جبکہ وہ زندگی کی اور مسرتیں حاصل کرسکتے تھے؟

"مسرت خوشی کیف یہ سب کیا چیز ہے؟ آفندی مجھے یہ سب حاصل ہے آزادی روپیہ سوسائٹی میں مقام" اور اس کے باوجود میں خوش نہیں ہوں اُس نے اپنی انگلیاں چٹخائیں "بدقسمتی راحت کی زیادتی اور کیا۔" میں نے افسوس سے کہا۔ "جو کچھ تمہیں میسر ہے لوگ اس کی تمنا کیا کرتے ہیں اپنے آپ کو شیطان کے ہاتھ فروخت کرکے ان خوشیوں تک رسائی حاصل کرتے ہیں اور ایک تم ہو کہ مانجھی کی شرمیلی دلہن کو یاد کرتی ہو جو کہ تم ہوسکتیں۔ ویسے گھونگھٹ سے چہرہ چھپائے تم مضحکہ خیز لگتیں۔"

"بلا سے مگر دیکھو میری اتنی ذرا سی خواہش کو روپیہ خرید نہیں سکتا۔ یہ اور ایسی خوشیاں کسی قیمت بھی ہاتھ نہیں لگتیں۔ میں شمیمیں جاہوں تو مل سکتی ہے جس نئے کی تمنا کروں مجھے اُس وقت ایک چٹکی بجانے میں مہیا ہو جائے گی مگر پھر بھی۔" اُس نے بات کو ادھورا چھوڑ دیا۔

" دیوانے کے خواب "

نوجوان نسل یہ امریکی اور یورپی نسل اور ان روشنیوں سے چندھیائی گھبرائی احساسِ کمتری کی ماری ہماری مشرقی نسلیں تن آسان عشرت گزیدہ ہمارے بچے اچھا ہے ان کے کوئی خواب نہیں ہیں۔ وہ کسی ماضی میں یقین نہیں رکھتے کسی مستقبل کی پروا نہیں کرتے حال ہے اور یہ گھڑی یہ پل اس کو نچوڑ لو اس کا آخری قطرہ خوشی کی آخری بوند تک زندگی میں کچھ نہ چھوڑو اس کی تلچھٹ تک پی جاؤ۔ اور پھر شاہراہوں پر سڑکوں کے کنارے درختوں کے نیچے سایوں میں گھنے جھنڈوں میں پارکوں میں بنچوں پر ہوٹلوں کے کیبنوں میں داد عیش دو کوئی حسرت اور اس کی چبھن باقی نہ رہے کوئی تمنا اور اس کی خواہش نہ رہے کچھ نہ رہے۔ امریکی معاشرہ جس نے دنیا کو خوب سے خوب تر کی تصویریں دکھائی ہیں جسم اور اس کے راستے جو عیش میسر آ سکتا ہے اس کی تشہیر کی ہے نشہ آور خواب آور ادویات اور اس کی سمگلنگ کے چکروں میں گرفتار ہے۔ کچھ لوگ ستاروں پر کمندیں ڈال رہے ہیں اور باقی جنس زدہ نسل اپنے آپ کو بھلانے کے لئے لگے دم مٹے غم کے چکر میں گرفتار ہے۔ پھر بھٹکتی پھرتی ہے اور بے یقینی کی وہ فضا جو خودکشیوں اور جرموں کو جنم دیتی ہے جب آدمی کے پاس سہارے کے لئے طاق میں سجایا بت ہوتا ہے تو وہ اپنا بوجھ اس کے سامنے ہلکا کر سکتا ہے جب وہ خدا پر یقین رکھتا ہے تو اپنے آپ میں یقین رکھتا ہے۔ ماضی کے بیکار خیالوں کے ساتھ ساتھ اس نسل نے اپنے طاقچے خالی کر دیئے اور ان میں نئے بت سجا لئے آسمان چاند سورج اور ستاروں کی نمائش گاہ قرار پایا۔ دولت کی فراوانی نے معبودوں کی ضرورت سے بے نیاز کر دیا۔ اس زلزلے نے زندگی کی بنیادیں تک ہلا دی ہیں۔ مجھے نیا انسان ایک ایسے پاگل کی طرح لگتا ہے جو کوڑے کے ڈھیر میں ہاتھ مار رہا ہے اور جب اسے کوئی چمکتی چیز کوئی کانچ کا ٹکڑا کوئی رنگین تصویر ملتی ہے تو واہ وا ہاؤ ہو کا شور کرتا ہے باقی دیوانوں کو دکھاتا ہے اسے اپنی گدڑی میں رکھ کر مزید تلاش میں لگ جاتا ہے۔

شاید معاشرے کی یہی حالت تھی جب ساکی منی گوتم نے اپنے چیلوں سے کہا تھا۔

سادھوؤ یہ جسم ایک چھالے کی طرح ہے جو چار عناصر سے ترتیب پاتا ہے۔ پھر ماں اور باپ نے اسے جنم دیا کھنکتی مٹی اور بوند پانی۔ ہر لحظہ بدلتا ہوا مٹ جانے والا رفنا ہونے والا۔ انتشار کا شکار، حل ہو جانے والا۔ اس جسم کے طاقچوں سے جب بھی کچھ نکلے گا وہ گندگی اور بدبو ناقابلِ برداشت ہوگا۔ کیونکہ یہ قدرتی راستے جو اس جسم کے اندر ہیں اس کو ہی تو باہر نکالیں گے جو اس میں ہے۔ سادھوؤ تم اس جسم سے محبت نہ کرنا اس سے نفرت کرو۔"

مگر گوتم بدھ جب یہ کہہ رہے تھے تو وہ اس نفرت کے پس منظر جسم کی وہ ناقابلِ تسخیر کشش محسوس کر رہے ہوں گے۔ خواہش کی طاقت جو تپسیا اور دھرم اور یوگ سب پر غالب آ سکتی ہے۔ بدھ کے پیروکار اس بات سے باخبر تھے کہ جسم کی گرمی اور نفس پرستی کا بھی اپنا ایک مقام ہے اور آدمی اس کشش کو محسوس کرتا ہے۔ بدھ نے جب جسم کی نفی کرنے کا پرچار کیا تو وہ جسم کی لذتوں سے آشنا تھا۔ وہ شہزادہ جو راج محلوں میں خوب صورت عورتوں کے جھرمٹ میں گھرا رہتا تھا۔ جیسے سورج کے گرد اپسرائیں ہوں کچھ اپنے جسموں کی گرمی سے اسے بیدار کرنا چاہتی تھیں جیسے ساز کو مضراب سے۔

ایک نے ڈگمگا کر اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر دھر دیا اس پر جھک گئی اور نازک بیلوں کے بازوؤں سے اسے اپنے حلقے میں لے لیا۔

دوسری نے خوشبودار سانس اُس کے منہ پر چھوڑتے ہوئے اپنے سرخ ہونٹ اُس کے کان کے قریب لاکر سرگوشی کی میری بات سنو راجکمار۔"

تیسری نے مہک سے بھیگے کپڑے اپنے گرد لپیٹ کر اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہا۔ پوجا کا سمے آگیا ہے راجکمار۔" ایک اور اپنے نیلے لبادے کو سنبھالتی جو بار بار اس کے کندھوں سے ڈھلک رہا تھا۔ جھومتی ہوئی الگ کھڑی تھی اور بادلوں میں بجلی کی طرح اُس کی زبان اُس کے منہ میں دکھائی دیتی تھی۔

کچھ باریک لبادوں میں لپٹی چلتے اور ناز دکھاتے ہوئے اپنے کولہے مٹکا رہی تھیں اور کچھ اپنے بازوؤں کو سر سے اونچے کئے آم کی شاخوں کو پکڑے کھڑی تھیں کہ اُن کے سینے زیادہ نمایاں ہو گئے تھے۔

کنول کے کنج میں سے آنے والی نے کنول مکھ راجکمار کو ہنس کر دیکھا اور پھول اُس کے چہرے کے برابر رکھ دیا۔ جیسے وہ پوچھ رہی ہو۔

مہکتے ہوئے سایوں میں ساز بجانے والیاں اشاروں سے اُسے بلاتی تھیں اپنی آواز کے زیر و بم سے جادو جگاتی ہوئیں۔

پھر راس رچانے والیوں نے اُسے تماشہ بنالیا اور کہا۔" تم کو عورتوں نے فتح کر لیا ہے۔ اب جاؤ اور دنیا کو فتح کرو۔" شہد کی مکھیوں کا شور اور پھولوں کی مہک اور بے لپٹی ہوئی لتائیں جیسے نرم و نازک کنواریاں تلوکا کے درخت کے گرد اور پھر تال میں راج ہنس کا جوڑا چونچ سے چونچ ملائے اور گھنے ٹھنڈے سائے میں کوئل اپنے ساتھی کی آواز سن کر دنیا سے بے نیاز ہوئی جاتی ہو۔ اور گوتم نے اس دنیا کو تج دیا۔ کیونکہ وہ عورتوں سے فتح ہو جانے کے بعد دنیا کو فتح کرنے نکلا تھا دنیا کی مٹھاس نے اُسے ادب دیا تھا۔ عیش کوشی کی قیمت بہرحال اُسے ادا کرنا تھی اپنی صلیب اُٹھائے ہوئے اپنے آپ کو پھانسی پر لٹکانے اور اپنے آپ کو بچانے اور قائم رکھنے کے لئے یہی ایک راہ باقی رہ گئی تھی۔ وہ اپنے خیالوں اور اپنے ماحول کے زہر سے بچنے کے لیے جوگ کو ضروری سمجھتا تھا۔ کیونکہ بہرحال وہ ایک سوچ بچار کرنے والا راج کمار تھا اس کے اندر اتھاہ گہرائیاں تھیں جو اس کے گرد کی دنیا کے لیے نئی تھیں۔

ہوسکتا ہے اس تاریک دور سے بھی دنیا کبھی جسم کی پرستش سے باز آجائے اور خوشی صرف اور محض خوشی کی تلاش ترک کر دے۔ خوشیوں سے جو اور چیزیں حاصل ہو سکتی ہیں۔ رہنے والی اور فنا سے ماورا۔ چاند ستاروں پر کمندیں ڈالنے نئی دنیاؤں کو فتح کرنے زمین کے نیچے خزانے تلاش کرنے سمندروں کے رازوں سے آشنا ہونے آسمان کی وسعتوں میں نئی ممکنات دوسری مخلوقات۔ اور کائنات سے نئے رشتے قائم کرنے والی قومیں اپنا سارا زور صرف کر کے آدمی کو وہ شے کیوں نہیں دے سکتیں جس کی اُسے تلاش ہے۔ وہ فنا ہوتی ہوئی ہر گھڑی موت کی طرف جاتی گھاٹی پر کوئی مینارہ نور ڈھونڈتا ہے وہ اگر کسی طرح اپنی روح کو بچا سکے۔

آج سے پہلے زمانوں قرنوں پہلے صفحۂ ہستی پر ایسے لوگوں کا وجود تھا جو ترقی یافتہ تھے ہم سے زیادہ جانتے تھے اور پھر وہ تاریکی میں گم ہو گئے ایک ایک ہوتے ہوتے قدرت ان مہروں کو بساط پر اُلٹ پلٹ کرتی ہے اور پھر کھیل ختم ہوتا ہے تو واپس تاریکی میں رکھ

دیتی ہے۔

نورالنہار بیگم انسان کبھی اپنے آپ سے خوش نہیں رہ سکتا کیوں کہ وہ ایک حالت میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ تلاش میں ادر آئے اور آگے کھوجتا ہوا چلتا جاتا ہے اُس کا سفر اگر کشتی سے آواز سے تیز جیٹ پر چڑھنے تک ہوتا تو وہ مطمئن ہو جاتا مگر نہیں! تم افسوس سے جو یہ گزری بیتی باتیں مجھے سُنا رہی ہو اُن کے ذائقے اُن کی کشش کو محسوس کر رہی ہو تمہارے لیے بھی عظیم بدھ کی طرح ایک ہی راستہ رہ گیا ہے تم بھی دنیا کو تج دو۔

وہ ہنس کر کہنے لگی " تم نے میری ایک مشکل حل کر دی ہے شکریہ۔"

کیا مشکل حل کر دی تھی میں مشکل حل کرنے والا بالکل نہیں ہوں ایک اناڑی آدمی ہوں جس نے اپنے آپ کو آزمایا تک نہیں میرے جی میں ایک بات آئی میں نے کہہ دی تم اسے سنجیدگی سے مت لو۔ تم تو اس دنیا کی رونق ہو۔ خوبصورت عورتیں اچھے لباس پہنے سجی سجائی خود آگاہ اگر نہ ہوں تو یہاں رہنے کو بھلا جی چاہے گا؟"

نورالنہار اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اس نے کیبن کے دروازے کو بند کیا پھر کھولا۔ میں نے سوچا۔ بھلا اس کی عمر کیا رہی ہو گی؟ جیسے بادشاہ کے سامنے پیش کی جانے والی عورتوں میں سب سے خوبرو بیش قیمت اور ایک خزانے کی سی جس کا قد نہ چھوٹا ہے اور نہ بہت لمبا جو نہ بہت دُبلی ہو اور نہ ہی موٹی گدرائے ہوئے جسم والی چمپئی رنگت والی جو حسین ہونے پر بھی بہت حسین نہیں لگتی جو عورت ہوتے ہوئے بھی دیوی لگے۔ چھونے میں نرم اور پھسلتی ہوئی مگر گرمی میں اس کا قرب فرحت بخش اور سردی میں خوشگوار دھوپ کی طرح مہکتی ہوئی جیسے صندل ہو اور اُس کا منہ کنول کی سوگندھ دیتا ہُوا۔"

مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں نے یہ کہاں پڑھا تھا کس نے مجھے یہ سنایا تھا۔ جیسے شعر یاد آئیں۔ مگر شاعر کا نام ذہن سے اُتر جائے عورتوں میں سب سے دل نشین، بات کرنے میں نرم ہے جو اپنے محبوب کے پیچھے چلتی ہے اور اس کی خوشی کے لئے اپنی راحت قربان کر دیتی ہے اور جو کبھی خیالوں میں بھی اپنے شوہر سے دغا کا نہیں سوچتی۔

" نورالنہار بیگم مدحت حسین ہے تو پھر شمس الدین ابوالفخر کیا ہُوا؟" میں نے سوچا۔

ہم باتیں کرتے کرتے کہاں سے کہاں نکل آئے ہیں اُس نے کہا وقت کیسی تیزی سے گزر جاتا ہے کتنا وقت گزر گیا ہے۔"

" ہاں رات تھوڑی ہی باقی ہے۔" اب میں بھی تیز ہوا کی کاٹ محسوس کر رہا تھا جو ستاروں کو چھو کر نہایت ہلکی بہت خوشبودار تھی

" زندگی کونسی زیادہ باقی رہ گئی ہے۔" اُس نے آہ بھری اندھیرے میں ہاتھوں کو پھیلائے دیکھتی رہی۔ " تم ہاتھ کی لکیروں کو پڑھنا جانتے ہو کیا؟

" میں ایسی باتوں میں یقین ہی نہیں رکھتا۔"

تم یقین نہیں رکھتے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مگر مجھے بالکل یقین ہے آج تک کہی ہوئی باتیں تو درست ثابت ہو گئی ہیں۔ جب میں اور عمدہ باجی اُن کے بابا کے گھر میں تھے تو ایک شام ایک عورت آئی۔ مالائیں پہنے ماتھے پر سیندور کی لکیریں بیراگن جوگیا ساڑھی میں لپٹی آنکھیں سُرخ اور بڑی بڑی، میں تالاب کے پاس بیٹھی ریت سے برتن چمکا رہی تھی وہ سیدھی وہاں ہی چلی آئی۔ گھبرا

کر سِنے ہوئے ہاتھ لیے میں کھڑی ہوگئی۔

" بیٹھو بیٹھو۔" اُس نے کہا۔" اپنا کام کرو یہ برتن صاف کرکے پھر ہاتھ دھو کر آؤ۔"

میں نے پکڑ دھکڑ کرتے دل کے ساتھ کام ختم کیا۔ عمدہ باجی بھی وہاں آگئیں پر اُس نے اُن کو پلٹ کر دیکھا ہی نہیں وہاں کھڑی درختوں کی طرف دیکھتی رہی پھر حویلی کی دیواروں کو گھورتی رہی۔ عمدہ باجی نے بڑے پیار سے کہا بھی " آؤ بیٹھو موسی۔"

مگر اُس نے کوئی توجہ نہ دی۔ چل پان کا پوچھا مگر اُس نے ہر شے سے انکار کر دیا۔ اُوپر کے دالانوں میں بڑی اداسی تھی اور کمروں کے دروازے بند تھے نیچے کے آنگن میں پھول بوٹے بہت تھے اور مادھوی کی بیلیں ستونوں کے ساتھ لپٹی تھیں۔ اُس نے ہاتھ پر ہتھیلی ٹکالی۔

میں نے ہاتھ پھیلایا ریکھاؤں میں میل بھرا تھا مجھے بڑی شرم آئی میں نے ساڑھی کے پلو سے انھیں پھیر۔ کہا کوئی بات نہیں گھبراتی کیوں ہو تھوڑے دن کی بات ہے سب کشٹ دور ہو جائیں گے۔ سارا طرف آگے پیچھے دولت کے ڈھیر ہوں گے محلوں میں ہوگی راج کرو گی پر تمہارے نصیب کے تانے میں دُور دیس کا بانا ہے یہاں سے بہت دور بہت دور سمندروں کے پار خوب گھومو گی جہازوں پر ریلوں میں راج کرو گی یہاں وہاں دنیا کے کناروں تک جانے کہاں کہاں دھوم ہوگی بہت دھن ہوگا تمہارے پاس۔

میرا جی چاہا پوچھوں کون ایسا ہوگا جس کے پلو میں بندھوں گی۔ ہر لڑکی کی طرح شرمیلی گھبراہٹ سے مجھے پسینہ آگیا۔

عمدہ باجی نے پوچھا۔" موسی کیسا گھر ہوگا اس کا؟"

" گھر کیسا ہوگا۔" جوگن سوچنے لگی۔

" ہاں یہ تو رانی بنے گی نا تم کہتی ہو۔" عمدہ نے پھر کہا۔

" نہیں نہیں راج کرنے سے کوئی رانی نہیں ہو جایا کرتی۔ رانی ہونے کے لئے راجا کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اور ...." وہ رُک گئی۔

" ہاں کہو کہو۔" انہوں نے کہا۔

" کیا کہوں مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔" اُس نے ایک ٹک عمدہ باجی کی طرف دیکھا پھر آہ بھری۔

" راستوں کے بیچ بہت خون ہے اور جنگل ہیں اور اُبلتی ندیاں ہیں۔ ناؤ ڈولتی ہے ہاں اور اُلٹ جاتی ہے۔" جیسے وہ کسی تصویر کی بات کر رہی ہو۔ پتا نہیں وہ ہم دونوں میں سے کس کی بات کر رہی تھی۔ مانگ میں سیندور نہیں ہے۔ بالکل نہیں کبھی نہیں۔"

اُس کے جانے کے بعد ہم دونوں ہنستی رہیں۔ ایسی اوٹ پٹانگ باتیں تھیں اس کی۔ وہ جس طرح آئی تھی اسی طرح آندھی کی طرح نکل گئی۔

" دیوانی ہوگی۔" میں نے کہا۔

کاش دیوانی ہوتی مگر اُس کی باتیں حرف بحرف ٹھیک ہوئیں۔ تم نے دیکھا میری مانگ کبھی آباد نہ ہوئی۔ فخر میاں نے مجھ سے شادی تو نہیں کی تھی نا کسی نے مجھے اتنا کبھی نہیں چاہا کہ وہ میرا نام اپنے نام میں ملائے۔ لوگ میری دولت دیکھ کر حیران ہوتے ہے

اور بس جیسے ان جانے سے اندھیروں سے غاروں سے خوف آتا ہے لوگ مجھ سے خوف زدہ رہے ان جانے کا اپنا ایک جادو اور کشش ہوتی ہے نا بس مجھ میں بھی انھیں وہی جادو لگا۔

"مگر تم نے تو مجھے بتایا ہے کہ عمدہ باجی کے میاں تمھیں دان میں ملے تھے۔"

میں نے کب کہا ہے کہ انہوں نے مجھ سے بیاہ کر لیا۔ بیاہ تو اُن کا عمدہ باجی سے ہی ہوا تھا۔ میں انکی باندی اُن کی زر خرید چاول کے بدلے بکنے والی لونڈی تھی میں انسان نہیں جائداد کا ایک حصہ تھی اور شیا برج کے لوگ جہاں جہاں بھی تھے اُن کے دماغ سے شاہی کا طنطنہ اپنے اجداد کی تمکنت انسان کو چیز کی طرح خریدنا اور بیچنا موجود تھا۔ میں کنیز تھی اور پھر میری مانگ سونی رہی اس میں نہ سیندور بھرا گیا نہ افشاں چھڑکی گئی۔

حیرت ہے میرا تو خیال تھا عورت کی غلامی انگریزوں کے دورِ حکومت میں ختم ہو گئی

"اتنے بہت سے تمغے کھتے ہیں کہ پتہ نہیں سکتے"۔ نورالنہار نے کہا۔ باہر کے رواج انہوں نے بدلے ہوں گے مگر خاندان کے اندر نہیں اور پھر یہ قحط بھی تو اُن کا پیدا کردہ تھا جس میں میں بکی میری اور بہت سی ہم وطن بکیں تم کیا سمجھتے ہو ابھی عورت کی غلامی ختم ہو گئی ہے۔ یورپ میں زیادہ سمگلنگ عورتوں کے ہاتھوں کروائی جاتی ہے WHITE TRAFFIC انھیں دور مشرق میں لے جا کر بیچا جاتا ہے۔ عمدہ باجی کے میاں نے تو مجھے ایک لونڈی سمجھ کر رکھ لیا تھا انہوں نے مجھ سے زیادتی تو نہیں کی۔ یہ تو میری سوچوں کی خرابی ہے میں نے دنیا سے بہت کچھ چاہا ہے

نصیب سے وہ سب کچھ جو اس کتاب میں نہیں لکھا تھا مانگا ہے۔ میں نے عمدہ باجی کی نیکی کا بدلہ یہ دیا کہ انھیں اکیلی حویلی میں بھجوا دیا۔ خدا نے مجھے جس طرح پیدا کیا تھا اور جیسے میرا نصیب تھا میرے ساتھ تو وہی ہوا پر عمدہ باجی کے لیکھ میں وہ سب کچھ کیوں لکھا جن کے بزرگوں نے بادشاہت کی اُن کا انجام ایسا کیوں ہوا؟

اچانک میرے ذہن میں جیسے بھک سے روشنی ہو۔ نورالنہار کیا عمدہ کالی چرن کو چاہتی تھیں۔

تمھیں یہ خیال کیونکر آیا۔ تمھیں کیا معلوم۔ کیا میں نے کچھ کہا ہے؟ وہ بہت حیران تھی۔

نہیں میں نے یونہی اندھیرے میں تیر چلایا ہے تم بتاؤ کیا یہ بات سچ تھی؟

چاہت کیا ہوتی ہے آفندی اور پھر کچھ دیر چپ رہ کر مجھے معلوم نہیں کہ چاہت کا لفظ بھی کچھ ہوتا ہے یا اس کا کوئی مطلب عمدہ مجھے بہت پیار کرتی تھیں میں اُن کی رازداں تھی اس حد تک ایک باندی اور مالکن میں رازداری ہو سکتی ہے۔

انہوں نے مجھے کبھی کوئی پیغام دے کر کالی چرن تک نہیں بھیجا۔ کالی چرن مردانے کے سوا کبھی کہیں نہیں آیا تمھیں شاید معلوم ہی نہیں کہ جن گھروں میں مردانے اور زنانے الگ ہوتے ہیں وہاں زندگیاں دو محوروں کے گرد گھومتی ہیں۔ اندر کی دنیا بالکل الگ دوسری دنیا سے کسی رشتے واسطے سے جڑی ہوئی بھی نہیں۔ عمدہ باجی کو میں نے کبھی تاک جھانک کرتے بھی نہیں دیکھا بھائی لوگ اندر آتے تھے تو آپس میں گفتگو کرتے عمدہ برابر ہر بات میں دخل دیتی تھیں۔ وہ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھیں۔ جو انھیں معلوم ہوتا تھا۔ مجھے بھی معلوم رہتا تھا۔ مجھ سے چھپا کچھ نہیں تھا۔ جن دنوں سختی زیادہ ہوئی ہے۔ خطرہ اور بڑھا ہے۔ آزاد ہند فوج

بنی ہے اور جانے اور بہت کچھ ان دنوں حویلی کا تہ خانہ جس کا راستہ عمدہ باجی کے کمرے سے ہوکر جاتا تھا چھوٹی سی فیکٹری میں بدل گیا تھا میں ناسمجھ تھی مجھے اس سے دور ہی رکھا جاتا تھا مگر پھر ان کی اور میری تباہی کا سبب بھی وہی بنا۔ عمدہ کالی چرن سے نہ چھپتی تھیں نہ سامنے آتی تھیں اِدھر اُدھر ہو جاتیں۔ ہاں مجھے یاد پڑتا ہے جب اُس کی آواز سنتیں تو ایک دم زرد پڑ جاتیں یہ آج اتنے زمانوں بعد تمہارے کہنے پر مجھے یاد آ رہا ہے شاید یہی بات ہو۔ مگر تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟

میں سمجھتا ہوں زندگی کو تج دینے کی اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی؟

"تم سمجھتے ہو زندگی سے محبت کرنے کی کوئی وجہ باقی رہ گئی تھی ساتھ بھائی باپ ماں سب زندگی سے نکل گئے آگے پیچھے کوئی ایسا نہ رہا جو اُن کی سرپرستی کرتا۔

یہ سب سمجھ میں آتا ہے مگر پھر بھی ایک بات اندھیرے میں رہی۔ کیا وہ سدا سے ایسی تھیں میرا مطلب ہے کپڑوں سے بے نیاز ہونا کیا اُن کی پرانی عادت تھی؟

نہیں نہیں یہ تم سے کس نے کہا ہے تم نے کیوں یہ سوچا ہے؟ اُس نے خفگی سے کہا" بیاہ سے پہلے تک وہ اتنی شرمیلی ایسی حیادار تھیں اور بعد میں بھی وہ کسی کے سامنے تھوڑے ہی ایسا کرتی تھیں۔ بس اپنے کمرے میں جا کر خلوت میں بند دروازوں کے پیچھے وہ اچانک اپنا آپ بھول جاتیں۔ ان کی ٹیاری ردیوں سے بھری رہتی تھی۔ مجھے تو کبھی سمجھ میں نہیں آیا کہ ردیوں پر چلنے سے انھیں کیوں خوشی ہوتی تھی شاید وہ اپنی نفرت کا اظہار یوں کرتی تھیں دولت سے بیزاری کا مگر حیرت یہ ہے آفندی مگر باہر کمرے سے باہر وہ نہایت منکسر المزاج تھیں نخوت اور غرور کا کہیں دور دور بھی پتا نہ تھا نعمتوں پر شکر گزار ہونا بھی اُن کا مزاج تھا" کہکشاں اور نیچے اتر آئی تھی جیسے ہم اُچک کر اُسے چھو سکتے ہوں۔ شیشے کے دروازوں کے پار سے یوں لگتا تھا ہم بھی آسمان پر بیٹھے ہوں سب کچھ ہماری پہنچ میں ہو۔ ستاروں کا غبار اور کائنات کے راز ہزاروں برسوں کی دوری پر چمکتے ہوئے دوسرے سیارے سب سامنے تھے۔

عمدہ باجی شاید کالی چرن کو پسند کرتی ہوں اور ناپسند کرنے کی بھی تو کوئی وجہ نہ تھی۔ وہ تو سب کا چہیتا اور سب کا لاڈلا تھا اُس کی طبیعت سیمابی ہونے کے باوجود اُس کے جوش کی وجہ سے سب ہی تو اُسے پیار کرتے تھے۔

نہیں نورالنہار اب جبکہ تم اس کو بھی ممکنات میں شمار کرنے لگی ہو اپنے دماغ پر زور دے کر یاد کرو کوئی ایسی بات کوئی ایسا اشارہ ہو سکتا ہے تم یاد کر سکو۔"

کیا محبت جو موت کی مانند زبردست ہے کبھی زہر بھی بن جاتی ہے۔ محبت کرنے والا محسوس کرنے اور تڑپنے والا دل یوں بھی اپنے آپ سے بدلہ لے سکتا ہے۔ مگر یہ میرا ایک مفروضہ تھا جس سے میں سیاہی میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا۔ دنیا میں ایسے بے شمار راز ہیں جن پر سے کبھی پردہ نہیں اٹھا۔ خواب اور خیال کی ایسی دنیائیں ہیں جن کو کسی سیاح نے ابھی نہیں ڈھونڈا۔ بھلا اب جبکہ عمدہ نہیں رہیں میں اگر اس کی کوئی توجیہ کر بھی لوں اگر مجھے یہ پتا بھی ہو کہ وہ کالی چرن کو چاہتی تھیں اور اُس کی چاہت میں دیوانی ہوئیں تو پھر کیا؟

نورالنہار نے غیب داں کی طرح افسوس سے اپنا سر ہلایا جیسے وہ جادوگرنی ہو اور اپنے آئینے میں دیکھ کر مایوسی سے مجھے نا اُمید

کرنے سے پہلے اپنے حساب پورے لگا رہی ہو۔

"اُن کے صندوق کی تہوں میں کہیں نیچے ایک گروپ فوٹو تھا مگر اُس میں تو سب تھے۔

"بھائی لوگ بھی اور وہ بھی۔ مجھے بتاؤ نا تم نے یہ کیسے اور کیوں فرض کر لیا ہے کہ وہ کالی چرن کو شدت سے چاہتی تھیں؟ اُسے تو میں بھی بہت چاہتی تھی۔ محبت کے نام پر یہی کچھ میرے دامن میں ہے کہ میں اُس کی صورت دیکھتے ہی کھل اٹھتی تھی میرے پاؤں میں آپ سے آپ پر لگ جاتے میرے دل میں وہ گیت گونجتا جو وہ کام کرتے کرتے ہولے ہولے گایا کرتے تھے۔ میں تو ہر آہٹ پر کان لگائے رہتی تھی اُس کی صورت دیکھنا مجھے کتنا خوش کر دیتا تھا۔

عمدہ باجی کو میری طرح کے موقعے کب ملے تھے مگر میں تو اُن دنوں بالکل کم عمر تھی۔ اور پھر مجھے تو بھائی لوگ بھی اچھے لگتے تھے۔ اماں کہا کرتی تھیں کہ اُن کے بڑے دادا واجد علی شاہ کی کچھ شباہت اُن میں سے ہر ایک میں تھی۔"

"ہاں بیچارے واجد علی شاہ جو مٹیا برج میں رہ کر انگریزوں کا سایہ تک دیکھنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ وہ خوبصورت چھوٹا سا لکھنؤ بسا کر اپنے دل کو تسلی دیتے تھے۔ بھلا خواب بھی کبھی حقیقت بن سکتے ہیں۔ وہ کنہیا اور گوپیوں کا کھیل بھی اپنے جی کو بہلانے کے لئے کھیلتے تھے۔ راس رچاتے تھے اور بے شمار کنیزوں میں اپنے کو مگن رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ شادیاں کرتے تھے اور آہیں بھرتے ہوئے اُن تمام بے وفا عورتوں کے نام غزلیں لکھتے تھے جنہوں نے اُن سے کنارہ کر لیا تھا۔ واجد علی شاہ جن کو انگریز تاریخ دانوں اور سوانح نگاروں نے ایک عیاش حکمران کی صورت میں پیش کیا ہے دراصل بہت پُرعزم جوان ہمت اور نت نئے خیالوں سے بھرا دماغ رکھتے تھے۔ جب بڑے گھر کی بنیادیں ہل چکی تھیں اور مغلیہ تاج و تخت محض لال قلعہ کے اندر تک کی حکمرانی کا نام تھا تو وہ سراج الدولہ کے سے دیوانے بننے کی بجائے اپنے اندر دیوانے بن گئے اور انہوں نے اپنے کو بھلانے کے لیے وہ سب کچھ کیا جو تاریخ کے مضمون کی سیاہی نے ترتیب دیا ہے۔ وہ اُن کی طرح کے کئی حکمران اپنی عزت کی حفاظت اس دیوانگی سے کرتے رہے اور اپنے پیچھے وہ تمام نامکمل داستانیں چھوڑ گئے جو انگریز نے اُن کی شان میں اپنے حق کے لئے ترتیب دیں۔"

دیوانگی بھی وراثت میں مل سکتی ہے مجھے اس کا یقین اب ہو گیا تھا۔ آدمی کبھی کبھار اپنی حفاظت یوں بھی کیا کرتا ہے۔ دنیا کے اور اپنے بیچ ایک حد ایک دیوار بنا تا ہے پھر اپنے میں مگن اور خوش رہتا ہے۔ کچھ لوگ دولت کے لیے دیوانے ہوتے ہیں کچھ اس کے نہ ہونے سے دیوانے ہوتے ہیں کچھ عدم تحفظ سے گم ہوتے ہیں اور کچھ زیادہ تحفظ ہونے سے بہت غیر محفوظ محسوس کرتے ہیں۔ خُدا نے بندے کو اپنی صورت پر پیدا کر کے بھی اُس کے رازوں کو نہ سمجھے جانے والے مسائل کی صورت بنا دیا ہے۔

فلسفیانہ موشگافیاں اور صورت حال سمجھنے کی کوششیں بھی کبھی کبھار ناکام ہوتی ہیں تحلیل نفسی کا امام اعظم فرائڈ جانے اس کو کیسے سمجھا کر مجھے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی سوائے اس کے کہ عمدہ باجی دنیا سے بیزار تھیں اور موت کے انتظار میں انہوں نے اپنے کو مصروف رکھا اپنے آپ کے ساتھ۔ نور النہار کو بھی اُن کے بچپن کے حالات معلوم نہ تھے۔ نہ کسی محبت کا قصہ نہ کسی وابستگی کی داستان نہ کوئی لمبی چوڑی دنیاداری دیکھی کا جو انھیں لگا بظاہر وہ اُس سے بھی عہدہ برآ ہو گئیں۔ شادی ہوئی۔ پر شاید جو چوٹ انھیں لگی تھی اُس نے اندر ہی اندر انھیں کھا لیا زخم کبھی مندمل نہ ہو سکا وہ زندگی کے دل میں پھر کبھی رس بس نہ سکیں۔ جتنے

دن انہوں نے بسر کئے وہ خودکشی کی ہوئے ہوئے کوشش تھی۔ وہ نہ میرا بائی تھیں کہ اپنے دل کا دکھ بھجنوں میں سمو دیتیں نہ جہاں آرا تھیں کہ شعر کہتیں۔ پتا نہیں کتنی عورتیں کتنی لڑکیاں یوں چپکے چپکے بھسم ہو جاتی ہیں ۔

جیسے میرے خیالات کو پڑھ کر لوزا انہار نے کہا، "کالی چرن کو پھانسی دی گئی ہے۔ دن بہت چمکیلا تھا تیز دھوپ اور ہوا ٹھہری ہوئی۔ تڑپتا ہوا سورج سایوں میں آرام کرنے کے لئے بیتاب تھا۔ اور جب عمدہ باجی مری سارا دن گھٹا چھائی رہی ہوئے ہوئے بوندیں برستی رہیں جیسے چپکے چپکے بادل رو رہے ہوں۔ رہ رہ آشو کائے جھنڈ میں کوئل بولتی لمبی آواز نکالتی اور خاموش ہوتی۔ فخر کسی کام سے پاس کے گاؤں میں گئے تھے اور میں دریا کی طرف دیکھتی سارا دن کھڑکی میں سے جھانکتی رہی اپنے گھنوں کپڑوں سے خوش اپنے گھر سے جو عمدہ باجی کے بعد میرا تھا۔ میں سوچتی رہی تھی کہ حویلی کتنی سونی ہوگی ۔

تم دیکھو نا مجھے ایک طرح سے تو اُن سے بہت پیار تھا بے حد اُنس وہ میری محسن میری مالکن تھیں فخر کو میں نے اسی طرح اٹھایا تھا جس طرح بھیک کے ناتے کوئی کسی چیز کو اپنا سمجھے اور اٹھالے۔ تم یقین کرو کہ میں نے اپنے طور انھیں دکھ سے بچانے کے لیے ہی تو حویلی بھجوایا تھا اور انھیں فخر سے دست بردار ہونے پر کوئی دکھ نہیں تھا۔ ورنہ وہ نہایت اطمینان سے اُسے یوں دے نہ ڈالتیں ان کی کوئی ازدواجی زندگی کبھی نہ رہی تھی یہ بعد میں مجھے فخر نے بتایا۔

"اُن کی شادی کس نے کی تھی میرا مطلب ہے فخر کو اُن کے لیے کس نے پسند کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

بڑے بھائی کی ایک جگہ بات چل رہی تھی بعد میں وہی لوگ عمدہ باجی کی دیکھ بھال کرتے رہے اور انہوں نے ہی فخر کی بات ٹھانی فخر بھی قریبی رشتہ دار تھے وہ بھی مٹیا برج والے تھے۔ مگر اُن کے ہاں دولت نہیں تھی اور دو نسلوں کے بعد انہوں نے بھی انہی طریقوں سے پیسہ کمانے کا راستہ اختیار کیا جس سے لوگ راتوں رات امیر ہو جانے کی سوچا کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے عمدہ باجی کو چھوڑنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوگی۔ میں ایک عام عورت جس کے آگے پیچھے نہ کوئی روایت تھی اور نہ ہی خون میں گھلی طرز کی کوئی سند میرے پاس تھی۔ بھلا میں ان کے جتنا بھی کام آ سکتی کہ تھا۔ پھر انہوں نے مجھے کتنی اونچی جگہ دی تھی۔ جب عمدہ باجی کو انہوں نے حویلی بھجوانے کے لیے سوار کروایا ہے تو میں ڈیوڑھی کے دروازے کے باہر جوڑ گاڑی کا قید خانہ دیکھ کر دل پکڑ کر رہ گئی تھی ۔

آفندی عجیب بات ہے جسم کا رشتہ کچا ہوتا ہے اور روح ایسی ایسی چیزوں کو پکارتی ہے ایسے ایسے انسانوں کی تلاش میں رہتی ہے ایسی محبتوں کے پیچھے بھاگتی ہے جو اُس نے خود گنوا دیں۔ دریا پر کتنی کشتیاں چلتی ہیں مگر جی ڈوبی ہوئی ناؤ کے لیے تڑپتا ہے وہ سارے پیارے جو اس راہ پر سفر کر گئے اور تیز دھارے کی نذر ہو گئے۔

"یہ ضمیر ہے جو تمھیں عمدہ باجی کو برباد کرنے پر ملامت کیا کرتا ہے،" میں نے تیزی سے کہا۔

نہیں آفندی میں نے انھیں برباد نہیں کیا کم از کم دانستہ نہیں۔ میری حیثیت نہ تب تھی نہ آج ہے۔ حیثیت تو ایسے بنا کرتی ہے جب چار پشتوں کا خون لیے داغ رگوں میں ہو۔ شرافت۔ عزت۔ شہرت عروج دیکھے ہوئے زمانے نے جن کے ناز اٹھائے ہوں میں ایک زر خرید کنیز۔ بھلا میں عمدہ باجی کو کیسے برباد کرتی؟

"اگر تم چار پشتوں کی بات کرتی ہو پھر تو آج کی دنیا میں تمہارے گرد میرے گرد دیسے ہی لوگوں کا ہجوم ہے۔ جنہوں نے ایک پشت

بھی نہیں گزاری اور جن کی قوم نسل عز و فخر محض ان کی وہ دولت ہے جو انہوں نے جائز اور ناجائز ذرائع سے پیدا کی۔

"اگر دولت کسی کی نسل بن سکتی نجابت شرافت خرید سکتی تو پھر میں تو سب سے بڑی ہوں سرکاری حلقوں میں ملکی غیر ملکی ہر جگہ لوگ میرے لیے آنکھیں فرش راہ کرتے ہیں۔"

"خاندانی وجاہت اور پرانا پن وہ قدامت جو سنجیدگی اور طمانیت اور شانِ جہاں نگری بے نیازی لاتی ہے وہ تو نہیں ہو سکتی البتہ تم میں ایک رکھ رکھاؤ اور محتاط انداز ہے جو نہ تمہارے اتھلے پن کی چغلی کھاتا ہے اور نہ ہی تمہارے نہایت نیا ہونے کی پردہ داری کرتا ہے۔"

واہ وا آفندی خدا تمہیں خوش رکھے مگر میں نے اس کے لیے بڑا ریاض کیا ہے میرا مطلب ہے مجھے ریاض کروایا گیا ہے۔ فخر نے مجھ کو وہ بنانے کے لیے جو میں ہوں خاصی محنت کی ہے انھیں شاید مستقبل میں دور تک دیکھنے کی آنکھ ملی تھی کہ انہوں نے میرے لئے استاد رکھے مجھے انگریزی اور حساب اور شلجلہ اردو کچھ فرانسیسی پڑھائی گئی۔ لباس پہننے کے طریقے۔ "کتنا وقت اس سب پر لگا؟"

"بہت سا تقریباً پانچ سال۔ میں سیکھنے میں تیز اور بات سمجھنے میں ذہین تھی اور پھر مجھ پر ہر وقت استاد مسلط رہتے تھے۔ شاید عمدہ باجی یہ سب سیکھ نہ پاتیں۔"

"ابو الفخر اُن پر اتنی محنت کبھی نہ کرتے انھیں تم میں جو جوہر نظر آیا وہ اُن میں تھا نہیں۔ روایتی قسم کی لڑکیاں اور عورتیں ایک خاص ماحول میں پلی بڑھی اپنے ماضی سے محبت کرتی ہیں ہر اچھا بُرا رواج ہر بھلی بُری عادت انھیں جان سے عزیز ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"عمدہ باجی کی موجودگی میں ہی وہ میری تربیت میں لگ گئے تھے۔" اس نے بڑی کمزور سی آواز میں کہا۔

"تم مجھے بتا سکو گی یاد کر کے کہ کب عمدہ نے اپنے کمرے میں اپنے کو کھونا شروع کیا تھا۔"

ہاں ہاں یہ تو سب مجھے آج کی طرح یاد ہے بیاہ سے دو تین دن بعد ہی۔ انہوں نے آج تک کبھی کپڑے بھی میرے سامنے نہیں بدلے تھے مگر اُس دن جب انہوں نے ساڑھی کو بڑی تیزی سے نوچا ہے تو میں بھی وہیں تھی پھر انہوں نے پٹاری کو کھولا ربول کی چھن چھن سنگر میں مڑی تو وہ آن پر پاؤں دھرتی ہوئی ادھر اُدھر آ جا رہی تھیں اس سے بے نیاز کہ میں وہاں تھی۔ میری طرف دیکھ کر وہ مسکرائیں نہ شرم کے جیسے انھیں خبر ہی نہ ہو۔

میری حیرت سے پھٹی آنکھیں دیکھ کر انہوں نے کہا۔ "پانی پر چلنے سے پاؤں کے تلوؤں سے ٹھنڈ دماغ کی طرف جاتی ہے ایسا مزہ آتا ہے جیسے تالاب کے اندر ریت پر پیل رہے ہوں اور ہوا لہروں کی طرح جسم کو سہلاتی ہے۔" پھر وہ کافی دیر تک ربول پر ادھر سے اُدھر آتی جاتی رہیں اور مجھے طوفانی رات کی تصویر یاد آئی گرہوال اسکول کی مصوری کا شاہکار سیاہی اتنی دبیز اور گہری ہے کہ اس کے پار کچھ نظر نہیں آتا۔ درخت کے نیچے کھڑی ایک اسپرا ہے قدم آگے بڑھاتی ہے مگر پیچھے مڑ کر اُن بلاؤں سے بھی اپنے آپ کو بچانا چاہتی ہے جو اس کے دامن میں لپٹے جاتی ہیں۔ سانپ اس کے آگے پیچھے بجلی کی لہروں کی طرح چمکتے ہیں۔ زبانیں نکالے ڈسنے کو تیار اُن کے جسم کوڑوں کی طرح سخت مگر لچکیلے ہیں۔ اس سیاہی میں وہ مکھ بھورا سا کھینچے ہوئے ابرو مدھ ماتی آنکھیں سولہ سنگار

کئے بادلے کے جھم جھماتے دوپٹے میں لپٹی جو اُس کے بھاری گھاگھرے کی سلوٹوں پر سے پھٹتا ہوا اُس کے پیچھے زمین پر گھسٹ رہا ہے کلائیوں
تک بھری چوڑیاں کہنیوں تک مہندی سے رنگے ہوئے ہاتھ اور نازک انگلیوں کی پوریں تک رنگ میں ڈوبی ہوئیں۔ منہ پھیر کر اپنے پیچھے دیکھنے
میں اس کی گردن کا خم اتنا مکمل اور حسین جس سے اُس کی ناک میں پڑی نتھ جھوم کر ہونٹوں کو چھو رہی ہے اور آویزے رخساروں کی طرف
جھکتے ہیں جیسے ہلکورے لے رہے ہوں ایک ہاتھ سے گھاگرے کو ذرا سا سنبھالنے میں پنڈلی نمایاں ہو گئی ہے اور گھنیری زلفوں کا جال گھٹنوں تک
سنبھل کر گرتا ہوا پھیلا ہوا اور کستا ہوا تنگ چولی کی پشت پر سے کمر کو چھوتا ہوا۔ گلے میں سچ سچ جھولتے ہوئے ہار موتیوں کے گلوبند سے
گر کر ناف تک آتے ہوئے۔ اور پاؤں الٹے مُرغ جیسے سنگ مرمر کی نہایت مکمل مورتی ہو جو جانے کیسے آفتوں میں کھڑی ہوئی ہے
درخت کے پتے چمک رہے ہیں اور اُن شاخوں کے ملنے سے نمایاں ہو گئے۔

ہندو صنم تراشی جہاں جسم کی ساخت نمایاں کرتی اور اس کی پرستش پر اکساتی ہے وہاں اس کے بعد کے اسکول جو مسلمان بادشاہوں
کے زیر اثر بنے جسم کی پردہ داری سے اُس کی تقدیس کو بڑھانے اور اُسے زیادہ قابلِ توجہ بنانے میں لگے رہے مسلمانوں کے عروج
میں یوں بھی پردے کا رواج تھا اُن کا مذہب تو تصویر کشی کی اجازت نہیں دیتا تھا مگر اسلام بہت پہلے اُس سادگی اور بدویت کو
خیر باد کہہ چکا تھا۔ جو اُس کا طرۂ امتیاز تھی۔ فتوحات پھیلنے کے ساتھ ساتھ عیش کوشی اور اُس کے ساتھ ہی فنونِ لطیفہ کی طرف توجہ
بڑھی مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں علوم کی جتنی خدمت کی اور انھیں جتنی ترقی دی ہے دنیا ان کی احسان مند ہے۔ بابر اس
کے باوجود کہ فرغانہ سے بہت عجلت میں آیا تھا اور طالع آزما تھا۔ اُس نے اپنی تزک لکھی اور زندگی کی خوبصورتیاں اُس کی خصلتیں
اُس کی باریکیاں فلسفہ اور علوم سے اپنی محبت ظاہر کی۔ مغل بادشاہوں نے بلا امتیاز ہر مذہب کو اپنی شان قائم رکھنے اور اپنے طور پر پھیلنے کے
مواقع فراہم کیے۔ یہ ہندوستان کا نہایت پُرامن حسین اور شاندار دور تھا۔ اُن کی سرپرستی میں فنونِ لطیفہ نے بے انتہا ترقی کی
صنم گری، مصوری، نقاشی اور موسیقی سے لے کر فنِ حرب تک میں موشگافیاں ہوئیں۔ بادشاہ خود علم دوست اور عالم ہوا کرتے تھے وہ
صرف حکمران ہی نہیں۔ نابغے پرورش کرنے والے اور محسن تھے۔ جہاں کہیں کوئی جوہرِ قابل نظر آیا اُسے دربار تک رسائی حاصل ہوتی
تھی اس سرپرستی نے لوگوں کے حوصلے بڑھائے اور آقا کی طرف سے اُمید نے انھیں زیادہ دلجمعی اور فرصت سے فنون کی طرف مائل کیا
رزق کی طرف سے فراغت اور اجتماعی آسودگی نے راگ کی محفلوں کو استحکام بخشا اور رنگوں کی دنیائیں آباد ہوئیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں سے پہلے فن کو مذہب کا درجہ حاصل تھا۔ لوگ مظاہرِ قدرت کو پوجتے تھے اور دیوی دیوتاؤں سے
اُن کے غار اور مندر آباد تھے۔ ہوا۔ بادل۔ سورج۔ چاند۔ زمین اور کائنات کے کارخانے کے سارے کارندے اُن کے نزدیک قابلِ
پرستش تھے۔ کیونکہ وہ سب اُس وحدت کو سمجھنے کے لئے انسان کے معاون تھے۔ پھر ہندو ان فروعات میں پڑ کر اصل کو کھو دینے کی
حد تک بڑھ گئے۔ اگنی اور لکشمی اور ساری طاقتیں جن سے آدمی ڈرتا اور اس کے باوجود انھیں اپنے تصرف میں لانا چاہتا ہے پوجی گئیں
تاکہ وہ رام ہو جائیں اور قابو میں آجائیں۔ پھر صلح اور آشتی اور محبت کے اور بہادری کے اوتار بھی خداؤں کا درجہ اختیار کر گئے۔
جسم اور روح کے وصال کی کہانیاں رادھا گھنے جھنڈوں میں اندھیرے کنجوں میں ڈری سہمی کرشن مراری بانکے بہاری کی راہ دیکھتی ہے اور
اس کی خوبصورتی آدمی کے ذہن کی حد سے بڑھی مادہ پرستی سے وجود میں آتی ہے۔ کالی آنکھیں جیسے پھولوں پر بھونرے محبت سے

زرد چہرہ لئے اُس کے بالوں کی مانگ جیسے کنواری اُس کے پتیوں کے سے نرم و نازک پاؤں عورت کے حسن کی ایک دل پذیر داستان کنہیا گوپیوں میں مگن کھنڈرا مدھوبن میں انھیں بلانے والا۔ بندرابن میں راس رچاتے ہوئے بھگوان کرشن من موہن۔ جن کے انگ زہر سے کالے پڑ گئے ہیں۔ میرا کا گردھر ناگر۔ اور پھر رادھے کرشن کے ملاپ کے قصے اُن کے ملن کی داستانیں۔ بھگوان نے آدمی کا روپ دھارا اور زمینی محبت کی ساری گہرائیوں سے آشنا ہوا دل گرفتگی اور اداسی اور مجبوری تمناؤں کی بے چینی پا لینے اور کھو دینے کے سارے مراحل سے گزرا۔ مرلی بجاتے ہوئے جس کی آواز میں رادھے کو سب کچھ ڈوبتا ہوا لگا اپنا اور کاہنا کا وجود۔ مرلی کی صدا اُسے سارے جہانوں سے بے نیاز کرتی ہوئی۔ برق فنا کا جلوہ۔

یہ ذہنی عیاشی نہیں مذہب ہے۔ خوب صورتی کی نمیں کا مذہب جس کو بعد والوں نے بدل ڈالا۔ مسلمانوں کو رادھا کا نہایت حسن ایرانی روپ میں بھی دکھائی دیا اور یہ پیوند کاری ہندی عورت کے وجود کو بدل گئی۔ وہ راگ راگنیوں میں ابھری محبت کی شے نہیں فن کے اظہار کا ایک ذریعہ بن کر۔ مذہب اور عبادت نہیں۔ مذہب اور عبادت تک جانے کا واسطہ بن کر۔ وہ مقام شوق نہیں صرف شوق بنی اور اپنی اونچی پدوی سے اُتر کر لوگوں میں آئی اُس کے سراپا میں رنگ راگ گھلتے ملے۔ وہ میگھ ملہار کی تان اُڑاتی ہوئی درختوں کے نیچے ہرنوں سے باتیں کرتی ہوئی چاندنی رات میں اپنے وجدان سے الوہیت تک پہنچتی ہوئی دیوی سے صرف خوب صورتی بن گئی۔ مہابلیشور کے مندروں میں کانچی درم کی عبادت گاہوں میں اُسے جو لباس نصیب نہیں ہوا تھا اب اُس کا مقدر بن گیا۔ وہ مجسم خوبصورتی حیات اور ہر فن کی معراج قرار پائی۔ لوگوں نے ایلورا اجنتا کے اندھیروں میں کھلتے اور تازہ رنگوں سے سبق حاصل کیا۔ رامائن کی سیتا۔ مہابھارت کی دروپدی نئی زمینوں میں داخل ہوئیں طریقہ وہی تھا جو اجنتا کے فرسکوز کا تھا۔ راجپوت اسکول جہاں سنجیدہ جذبے کی تصویر کشی لیے وہیں پر اُن کی سادگی میں بناوٹ اور ملاوٹ نہیں ہے ذہن تک کی بھی نہیں سیدھا دل پر اثر کرنے والی غزل کی طرح اور تصویریں جو راجستھانی، پہاڑی اور بھاپائی گھڑوال اسکول کہلاتے ہیں جو راجپوت اسکول کا ہی ایک حصہ ہیں مغلوں کے زیر اثر ان چھوٹی تصویروں میں دربار کی زندگی شکار کے واقعات اور اکیلی عورتوں کے خوبی سے بنائے گئے خاکے اور محبت کی خوشبو سے مہکے ہوئے سراپے ہیں۔

عمدہ باجی بھی مجھے ایک ایسی ہی تصویر کی طرح دکھائی دیں۔

جب میں نے اُن سے پوچھا نہیں نہیں میں نے اُن کے کندھوں پر چادر ڈالی تو انہوں نے ہاتھ جھٹک کر کہا "نوری یوں اچھا لگ رہا ہے" "بہت اچھا لگ رہا ہے کتنی ٹھنڈک ہے" اُن کا سراپا آنندی کسی بُت تراش نے اتنا بے داغ مجسمہ نہیں بنایا ہوگا کیونکہ مجسمے کو بنانے کے لیے تو پتھر کو چھونا پڑتا ہے اُسے توڑنا اور قوسیں زاویے بناتے ہیں اُس کی حرمت نہیں رہتی جیسے چاندنی ادھ کھلی کلیوں پر روپ اور پاکیزگی بن کر اُترے میری آنکھیں چندھیا گئیں روشنی کے سامنے کیسے کھلی رہتیں۔ روز کتنی دیر وہ چلتی رہتیں یونہی اور میں دروازے پر بیٹھی رہتی۔ پھر میں اس حفاظت سے اکتا گئی اور میں خود کبھی تو جلنے کے دریا میں کود دی تھی مجھے اپنی کشتی بھی تو کھینا تھی۔ پھر یوں ہوتا کہ وہ کمرے سے باہر نکلتی ہی نہیں تھیں اور ساڑھیاں انہوں نے مجھے اُٹھا دی تھیں۔ زندگی کے ساتھ اُن کا ناتا ہی کونسا رہ گیا تھا۔ فخر نے اور میں نے آپس میں اُن کی بات ہی نہیں کی تھی اور فخر نے میرے ساتھ بھی کونسی باتیں کی تھیں انھیں تو دُھن تھی مجھے بدلنے کی۔

"کیا وہ بات نہیں کرتی تھیں میرا مطلب ہے پاگل ہوگئی تھیں؟" میں نے سیدھا سوال کیا۔

"آفندی وہ پاگل نہیں ہوئیں یوں کمرے میں تو بڑی عمدگی سے بات کرتیں رسان سے باہر جب بھی نکلتیں کنگھی چوٹی کئے ہوئے۔"
پھر تیزی سے اُس نے کہا: "میں تم سے سچ کہہ رہی ہوں وہ پاگل نہیں تھیں اور مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ انہیں کیا مرض تھا۔ آنگن میں درختوں کے پاس بیلوں میں سے پھول توڑتیں ہر وہ کام جو عام زندگی میں ایک آدمی روز کرتا ہے اُس میں حصہ لیتیں نہیں بھی لیتی تھیں آنکھوں میں وحشت نہ تھی اور اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں بتا سکتی۔ تمہاری دلچسپی بے فائدہ ہے اُس نے ہنس کر کہا۔ جب مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ انہیں کیا عارضہ تھا تو تمہیں بھی کچھ معلوم نہیں ہو پائے گا۔ یہ تمہارے فرائڈ اور ینگ اور انسانی ذہن کو سمجھنے کی اُن کی کوششیں اپنی جگہ بہت بڑی ہیں صحیح ہیں کہیں کہیں پر وہ پوری اترتی ہیں مگر انسان اتنا آسان نہیں ہے آفندی خدا کی صناعی کا مکمل نمونہ ہے خدا نے اُسے اپنی صورت پر پیدا کیا ہے وہ نہایت پیچیدہ ہے اور اُسے سمجھنا بھی تقریباً ناممکن ہے۔

"میں تمہاری بات سے بالکل متفق ہوں نور النہار بیگم اور مجھے تو ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ تم آج ماضی پر کیوں جھولا دار ہوئی ہو تمہارا ماضی جیسا بھی ہے بہت کم لوگوں کو اُس سے آگاہی ہے تقریباً سوائے تمہارے کسی کو نہیں۔ ابوالفخر نے تمہاری ساری شخصیت کو یوں صیقل کیا کہ تمہارے اوپری سطح وہ دیہاتی پن تم میں کہیں نہیں۔"

"یہاں پر تم غلط ہو" اُس نے سنبھل کر اپنا سگریٹ پھر سلگایا۔ "یہ دیہاتی پن نہیں تو اور کیا ہے کہ میں اب تھک گئی ہوں آرام چاہتی ہوں جس بوجھ کو اٹھائے اُٹھائے کب سے چل رہی ہوں اُسے اتار کر سستانا چاہتی ہوں بالکل دیہاتی عورت کی طرح تمہیں پتا ہے نور النہار بیگم دیہاتی پن کیا ہوتا ہے؟ وہ نفاست اور نزاکت جو تمہارے ستھرے پن میں ہے اس کا کیا جواز پیش کرو گی؟

"ستھرا پن۔" اس نے نہایت ہوے سے کہا میں بحث میں نہیں پڑوں گی مگر آفندی تمہیں بھی لفظوں کا مذاق اتارنا خوب آتا ہے تم نے دیکھی ہیں دیہاتی عورتیں؟ راگنیوں کی سی گھنے جنگلوں کے کنارے کنارے بانس کے جھنڈوں کے پاس کھیتوں کے بیچ جانے کے بانوں میں رنگوں کے میلوں میلے میں ننگے پیروں چلتی ہوئیں جیسے پھول دھول پر گرے لہریوں میں ڈوبی ہوئیں۔ کٹیلی نشیلی آنکھوں کے لوگوں سے اپنے گھونگھٹ میں چھپی نگاہوں سے بادلوں بھرے آسمان میں گیت کے بول ستاروں کی طرح ٹانکتیں جنہیں دیکھ کر ہرن چوکڑی بھول جائیں"
"نور النہار تم نے کبھی شعر کہے ہیں؟"

"ندی کا دھارا اور اندھیری رات اور بادلوں میں چمکتی بجلی اور جنگلوں پہ برستی بارش اور لہروں پہ ڈوبتی ابھرتی تنکے کی سی بے سہارا ناؤ ہر آدمی کو شاعر بنا دیتی ہے اور پھر ابوالفخر نے جو محنت مجھ پر کی۔ وہ کنہیا تھا اور میں رادھا۔ وہ چپ ہوگئی۔
سوال یہ ہے کہ اُس نے تم کو یہ سب کیوں بنایا؟

"مثیا برج کی روایت میں سے اگر بجلی نکال دی جائے جلا وطنی کا درد نکال دیا جائے۔ شاہ اودھ کی رنگینی نفی کر دی جائے یا دور کو پھینک دیا جائے تو باقی رہ جاتا ہے کتھک"۔
"شاید۔"

"شاید کیا بالکل یہی کچھ رہ جاتا ہے۔" اس نے تیزی سے کہا۔ سپاہی نے اپنی بندوق رکھ دی اور سارنگ اٹھا لیا اور پاؤں میں گھنگھرو باندھ لئے اور ابرق کے پرتوں پر کرشن بھگوان کی تصویر اتر آئی جو نٹ راج کی طرح ناچ کے سارے بھاؤ سے آشنا ہے جس کا انگ انگ پکارتا ہے سب مٹ جانے والا ہے فنا فنا!

میں نے سوچا نورالنہار کی چال میں توازن بلا وجہ نہیں ہے۔

انہوں نے یہ سب مجھے خود سکھایا تھا۔ پرانی حویلی کے لمبے خاموش برآمدوں میں لکڑی کے فرش پر وہ گھنٹوں میری تربیت کرتے وہ اس ماضی سے اپنا رشتہ بنائے ہوئے تھے جو نہ واپس آ سکتا تھا اور نہ ہی کہیں تھا۔ محض خواب کی طرح سلطنت کے بدلے آدمی کو محض خواب مل جائیں۔ تو وہ مطمئن نہیں ہوتا وطن کے بدلے ایسی سرزمین جو نہ خوابوں کو سہار سکتی ہے اور نہ ہی پناہ گاہ بن سکتی ہے۔ بارگاہیں اندر محلات اور ڈیوڑھیاں اور باغات سارے آباد ہو سکتے ہیں پر اُجڑا دل کبھی آباد نہیں ہوتا۔ اس لق و دق صحرا کو بسانے کے لیے انسانی عزم سے بھی کچھ زیادہ ہی چاہیے اور جب دنیا کی ساری طاقتیں آپ کے خلاف نبرد آزما ہوں تو؟" وہ چپ ہو گئی۔

"کیسے جاؤں کو نہیں۔" میں نے اپنے اندر ایک عجیب بے چینی محسوس کی غبار سا جو پتا نہیں کیوں دل کے گرد جمع ہو رہا تھا۔ جیسے اُسے دبا رہا ہو ایک ایسی بے نام سی تڑپ جو جانے کیوں تھی۔ میرا اُس ماضی سے کبھی کوئی رشتہ نہیں رہا وہ ماضی جو فخر کا رہا ہو گا وہ گزرے زمانے جس کے خواب اُس نے دیکھے ہوں گے اور پھر بھی اس تلخی کو خون میں گھلتا محسوس کرتا تھا جیسے صدیوں کا بوجھ میرے جی کو دبا رہا ہو مٹیا برج کی کوٹھیوں میں پھرنے والے جانِ عالم پیا کے دل پہ جو روز گزرتی ہو گی اُس کا ذرا سا احساس نہیں بلکہ احساس کی ایک جھلک بوجھ کا تصور بھی نہیں تصور کا بھی ایک خاکہ جیسے بادلوں میں اچانک ہمارے سامنے کوئی شکل بنے اور پھر بجھ جائے۔ شام کی سرخی میں دوسروں سے الگ واضح روشن ایک شبیہہ نہیں شبیہہ کا شبہ سا ہو۔ روشنی اور اندھیروں کے کھیل میں تیرتے ہوئے سفید بادل کا ذرا سا ٹکڑا ہمارے سامنے ہمارے خیال کی تصویر پیش کرے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسے میں آدمی اپنے کو کیوں کر بھلا سکتا ہے دھوکا دے سکتا ہے خوش رہ سکتا ہے۔ ہنس بول سکتا ہے۔ گوپیوں کے سنگ راس رچا سکتا ہے، اندر سبھا میں راجہ اندر بن کر بیٹھ سکتا ہے۔ نٹ راج کے سارے ناچوں میں سے ایک جو اس پر مسلط کر دیا گیا تھا اس کو کیسے سدا کے لئے ناچ سکتا ہے اور مجبور محض مجبور مقہور بندی خانے کے دروازوں سے پرے۔

آہ کہ صیاد کے دل پہ نہیں اختیار

اور اختیار ہے کیا؟ اے خالقِ کون و مکان اختیار کیا شے ہے؟ مجسمے پتھر کے وجود میں قید ہوتے ہیں اور ایک ہی حالت میں صدیوں قرنوں زمانوں انھیں اُسی حالت میں رہنا پڑتا ہے۔ اُن کے لئے ازل ہی ابد ہو جاتا ہے۔

"فخر دیوانے تھے تھوڑے تھوڑے سے بلکہ پاگل۔" نورالنہار نے کہا۔ "انھیں اپنے بزرگوں کی تصویریں جمع کرنے کا شوق تھا۔ وہ جو انھیں کچھ دے نہ سکتے تھے نہ شان نہ عزت نہ رہائی۔"

"فخر قیدی تو نہ تھے۔" میں نے اکتاہٹ سے کہا۔

Scanned by CamScanner

آدمی قید ہوتا ہے اور نہیں ہوتا وہ ساری حالتوں پر خود قادر ہے ۔ عام زندگی ہے اور اس کا طلسم ہے کسی کو وہ گرفتار کر سکتا ہے اور کسی کو نہیں اس جادو میں لگ کر کبھی ذرا پرے سا فیوور گنگولی ۔ یین کے مندر کی گھنٹیوں کی آواز اسے سنائی نہیں دیتی اور جب وہ اُسے سنتا ہے تو پاگل ہونے لگتا ہے ۔ یہ سوچ کر وہ لکھنؤ میں کیوں نہیں ہے قیصر باغ اور اُس کی رونقیں اس کی ڈیوڑھیاں اور شان و شوکت سب اُس سے چھن گئی اُس کے بزرگوں کے حصّے میں بھی صرف رونا آیا اور اُس کے حصّے میں بھی ۔ میں انھیں دیکھتی ان تصویروں کے ہجوم میں جیسے اکیلے اُن سے گھرے کھڑے ہوں اُن کو گھورتے ہوئے اُن سے باتیں کرتے بحث کرتے ہوئے پھر وہ منزلوں پر زور سے چڑھتے خالی گھر میں فرشوں پر دھم دھم کر کے چلتے اور اپنا غصہ اتارتے ۔ یا پھر خاموشی سے منجھے ندی کو دیکھتے رہتے شاید یہ سوچتے ہوئے کہ یہ دھارا جانے کب سے ہے اس دریا نے وہ شوکت دیکھی ہوگی ۔ عہد بہ عہد اس نے سلطنتوں کو بنتے بگڑتے دیکھا ہوگا اس کے پانی میں پہلے مغلوں کے بجرے تیرتے تھے اور راگ رنگ کی محفلیں برپا ہوتی تھیں پھر دور دیس کے لوگوں نے ان کناروں پر اپنے کارخانے قائم کئے کوٹھیاں بنائیں تجارت کے ساتھ ساتھ وہ اس سرزمین کے مالک بنے اور بڑے بڑے سائے بینے اونچے بال باندھے عورتوں کے ہجوم مردوں کے بازوؤں پر ان سیر گاہوں میں گھومتے رہے کمپنی کے نشان کے ساتھ ساتھ چورنگی اور کالی گھاٹ اور بو بازار اور دکانوں کی رونقیں بڑھیں ان کناروں پر بگھیوں میں ہوا خوری کے لیے صاحب لوگ نکلتے اور سیاہ فام لوگ دبک کر ان کی راہوں سے ہٹ جاتے ۔ جانتے ہو آنندی ہم لوگوں نے صرف ڈر کر دبکنا اور راہ سے ہٹنا ہی سیکھا ہے ہم لوگوں کے خون اتنے سرد کیوں تھے بھلا؟ وہ دور دیکھ رہی تھی جیسے پرے ماضی میں اپنے سوال کا جواب ڈھونڈ رہی ہو ۔ خون سرد کیوں ہوتا ہے؟ میں نے سوچا شاید اس کی کوئی وجہ ہو جو بیالوجی جاننے والوں کو سمجھ میں آ سکے ۔ پتا نہیں سرد خطوں میں رہنے والوں کا خون اتنا گرم کیوں تھا کہ انہوں نے سات سمندروں کے پار اپنی حکومتیں قائم کر لیں کیا وہ ہم سے زیادہ منظم تھے تعداد میں زیادہ تھے طاقتور تھے سمجھ میں نہیں آتا نور النہار شاید اسی سوال کا جواب پانے کے لیے میں ہیتھن میں تھی اور آخری چھت پر اس کیبن میں میرے ساتھ بیٹھی تھی ۔ جہاں ستارے قریب ہیں آسمان زیادہ نیلا ہے اور اُس تک رسائی آسان ہے مگر آسمان تک تو ہماری پہنچ کبھی آسان رہی ہے اصل تو یہ ہے کہ ہم نے زمین سے زیادہ آسمان کے ساتھ اپنا رشتہ استوار کرنے کی کوشش کی ہے ۔ زمین اور اس کی ساری نعمتیں ہیچ ہیچ سب ہیچ ان دیکھی نعمتوں کی تلاش میں ان جانی خوشیوں کی کھوج میں جو اوپر سے تعلق رکھتی ہیں ہماری منزل ستاروں سے پرے جنت ہے جہاں دودھ کی نہریں ہیں اور فرشتے سکون سے عبادت میں مصروف ہیں جہاں ہرتے ہاتھ ہلائے خدا ہمارے قریب ہو سکتی ہے ۔ اسلام کی تعلیمات میں پیچیدگی نہ ہونے کے باوجود لوگوں نے اسے محض خوش آئند خوابوں کا مذہب بنا لیا ۔ خدا نے کہا میں نے تمہارے لئے یہ ستارے اور چاند سورج مسخر کئے تو ستم ظریفوں نے سمجھا یہ سب تابع ہو گئے ۔ توحید کا پرچم لے کر نکلنے والوں کی اولاد نے توحید کے ساتھ ساتھ دنیا کو بھی صرف اپنا حق سمجھ لیا ۔ اور اُس کے لئے جدوجہد اور کوشش کو سعیٔ بیکار سمجھ لیا اور خوابوں کی آغوش میں پناہ لی ۔ فلسفے اور بحثیں آغاز ہوئیں ۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا رہنے والوں کی بھیڑ لگ گئی طبعیات اور مابعد الطبعیات اور الٰہیات اور علم الکلام اور علموں کا دریا بہہ نکلا ۔ لہریا ریت پر خیمے گاڑنے والوں کی بارگاہیں جب دریاؤں کے کنارے پر آرام دہ سرسبزوں اور نرم ہوائیں چلنے والے خطوں میں آباد ہوئیں تو زمین پر رہ کر زمین سے محبت کر کے زمین کے لئے سوچنا خام خیالی بن گیا ۔ یہاں تک کہ

جب سراج الدولہ ویرانے میں زخمی ہرن کی طرح شکار ہو گیا اور بنگال کی سرزمین غیروں کے پاؤں تلے روندی گئی تب بھی کہیں سے آہ و فغاں نہ اٹھی۔ سراج الدولہ کا مکان جنت میں بن چکا تھا سوچنے والوں کے لیے یہ کافی تھا کہ وہ شہید ہوا اور اس نے وطن کی محبت میں جان دی۔ پورا ہندوستان مرے ہوئے اس شہادت کو اپنا نصب العین سمجھ کر خوابوں کی آغوش میں جا سویا یہاں تک کہ لال قلعے پر انگریز کا پرچم لہرایا اور دہلی کی گلیوں میں خون آلود فرش پر غیروں کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی رہی۔ انگریزوں نے پھوٹ ڈالی اور حکومت کی ایک کے بعد ایک اس نے دیو کی طرح باری باری شکار کے لیے حکمرانوں کو پانا اور نگلنا شروع کیا۔ کسی کا واویلا کام نہ آیا۔ سب ہوئے ہوئے خاک میں سو گئے کھو گئے۔ پتا نہیں فخر اپنے پرکھوں میں کسے الزام دیتے اور کسے ڈھونڈتے تھے وہ کس کی تلاش میں تھے کون ان کی راہ نمائی کر سکتا تھا۔ جب چاند سورج گہنا رہے تھے تو انگریزوں کا ستارہ عروج پر تھا۔

"مجھے ایک اینگلو انڈین خاتون انگریزی پڑھانے آیا کرتی تھی۔"

میں نے سوچا اس کے اتنے مکمل لہجے کے لیے میں اس عورت کو مبارک دوں گا۔ دوسرے کی زبان کو اس طرح سے بولنا کوئی آسان بات نہیں۔

"ناخنوں تک انگلی کی آخری پور تک وہ حکمران طبقے کی نمائندہ تھی۔ آداب میں مکمل کردار میں مکمل کم گو کم آمیز اس کا ذہنی وطن انگلستان تھا جس کو اس نے کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔ فخر کہتے تھے غلام آقا سے بڑھ کر ہوتا ہے شاگرد استاد سے ایک قدم آگے پتا نہیں انہوں نے اسے کہاں سے ڈھونڈ نکالا تھا۔ حقارت سے اپنے چاروں طرف دیکھتی وہ کالے لوگوں کے درمیان ایک پھول کی طرح نمودار ہوتی۔ آنکھیں جھلکتے ناک۔ اس کی نگاہ کسی کو دیکھ کر سیلی نہ ہو وہ پیانو بجاتی تو اس کی انگلیاں اس پر بہتی تھیں اور حویلی کے دالانوں میں گیت کی گونج سنائی دیتی۔ عجیب بات ہے آفندی ذہنی طور پر ہم لوگ آج بھی ان سے اتنے ہی مرعوب ہیں جتنے پہلے تھے۔ آخر مجھے بتاؤ تو سہی ہم لوگ دوسروں سے اتنی جلدی مرعوب کیوں ہو جاتے ہیں؟"

ہم مرعوب نہیں ہوتے یہ مصلحت وقت تھی۔ پہلے انگریزوں نے حکمرانوں کے طور طریق اپنائے بنگال میں کلائیو نے میر جعفر کی بیوی منی بیگم کا بیٹا بن کر اس کے خاندان میں دخل حاصل کیا۔ عورتیں اور مرد ایک صدی تک حقہ پیتے اور شکار پر جان دیتے تھے کنچنیوں کے عشق میں گرفتار ہوتے اور گانا سننے کے لیے طوائفوں کے کوٹھے پر جاتے تھے شاعری کرتے تھے اور نرت پارٹیوں کے لیڈر ہوتے تھے۔ ہندوستانی عورتوں سے شادی رچاتے اور مغل حکمرانوں کی طرح مے نوشی کرتے تھے۔ وہ نواب کہلاتے تھے اور نیل کی تجارت کے مالک تھے۔ ان کی اپنی عورتیں مشرق کی روایت پرستی کے سحر میں گرفتار تھیں۔"

"پھر کیا ہوا تھا آخر کہ پانسہ ہی پلٹ گیا۔" نورالنہار نے پوچھا۔

ہاں پانسے اس لیے ہوتے ہیں کہ پلٹتے رہیں۔ سلطنتیں ختم ہوتی ہیں دنیا فنا کی زد میں آتی ہی رہتی ہے۔ ایک شہر کے کھنڈر پر دوسرا شہر آباد ہوتا ہے ایک تہذیب کے ویرانوں پر دوسری اس سے بہتر نئی تہذیب جلنے جاتی ہے یہاں تک کہ اسے موت آئے۔ یوں سدا سے ہوتا آیا ہے ہوتا رہے گا۔"

آفندی کچھ باتیں سمجھ میں نہیں آتیں مثلاً مجھے یہ بات ہمیشہ گڑبڑا دیتی ہے کہ جو تہذیب ختم ہوتی ہے وہ دوسری نئی تہذیب کے

مقابلے میں کیوں لائی جاتی ہے؟ اُسے کمتر ثابت کیوں کیا جاتا ہے؟

تم دنیا کے تانے بانے میں کیوں الجھتی ہو نٹ راج کی زلفوں پر پیار تھا کرتی گنگا دیوی کی طرح چپ چاپ عبادت کیا کرتے ہوئے جیتے جاؤ۔ مراقبے میں لگی رہو آخر یہ بھی کیا ضروری ہے کہ سب بات تمہاری سمجھ میں آئے ہی ضرور۔ ڈمرو بجتا ہے اس کا مطلب سمجھنا اہم نہیں۔

میں مطلب نہیں سمجھنا چاہتی اور پھر مطلب سمجھ کر کیا ملے گا جب مسز روتھ جانسن اپنی ناک ہوا میں اٹھا کر کہتی تھیں کہ ہمارے اصول بہتر ہیں اور ہم اس لئے حاکم ہوئے کہ ہم نے تم لوگوں کو تہذیب سکھائی ہے تو میں سر جھکا کر چپ رہتی تھی اُن دنوں میں کچھ جانتی نہ تھی اور اب" ہاں بیگم صاحبہ اب تم سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔" میں شدت سے بیزار ہو رہا تھا اور سوچ رہا تھا بچپن سے یہی سنتے آئے تھے اور اب تک ہر جگہ غیر ملکیوں کی اتھی ہوتی۔ کہیں اُن کا انداز فخر زندگی کی دوڑ میں اُن کی کامیابی سائنس کے میدان میں اُن کی ترقی آسمانوں تک اُن کی پرواز آدمی کی سوچ اور اُس کی پہنچ ان سب میں وہ جانے کہاں سے کہاں نکل گئے ہیں اور ہم اُن کی گردِ راہ کو بھی نہیں پا سکتے۔ ماضی میں اُجڑے کھنڈروں کا تذکرہ کر کے اپنے احساسِ کمتری کی تسکین دے لیتے ہیں۔ اُجڑے کھنڈروں اور خواب ناک کہانیوں سے ہمارا ماضی عبارت ہے۔ ہم لوگ مشرقی لوگ یا تو گذرے وقتوں میں رہتے ہیں یا پھر سوچتے ہیں اور ہر کام ہماری شان کے خلاف ہوتا ہے ہماری عزتِ نفس ہمیں اُس کی اجازت نہیں دیتی جب مسلمان مسلمانوں سے چھنا ہے اور حکومت بدلی ہے تو مسلمانوں نے انگریزی تعلیم کو قبول کرنا کم تر سمجھا اور اپنے مدرسوں اور خانقاہوں میں گم رہے۔ ہندوؤں نے جھرجھری لی اور جاگے وہ نہ حاکم رہے تھے نہ محکوم تھے وہ ایک حکومت میں برابر کے حصہ دار تھے دوسری حکومت میں بھی کسی نہ کسی تخت پر یا چوکی پر جگت سیٹھ بن کر براجنا اُن کو عزت ہی بخشتا تھا۔ انہوں نے نئی راہوں پر اپنے گھوڑے دوڑائے اور روشنیوں کو اپنے گھر کے اندر آنے دیا۔ وہ گماشتے تھے سیٹھ تھے کلرک تھے سرکاری کارخانوں میں مودی تھے۔ ہر طرف سے انہوں نے مالکوں کے بدلنے کے ساتھ اپنے اطوار بدل لئے انگریزوں کو حکومت کے لیے ایسے وفادار لوگوں کی ضرورت تھی جو اُن سے زیادہ اچھی طرح حالات کو سمجھتے اور مزاجوں کو جانتے ہوں۔ رفتہ رفتہ زندگی کے ہر شعبے پر وہ چھا گئے۔ روپے کی روح کو بنیے سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔ وہ پائی کے اندر روپے کو دیکھ سکتے ہیں جس طرح بیج کے اندر تناور درخت کو۔ وقت ان کا غلام تھا وقت اُن کے تابع تھا وقت اُن کا منتظر تھا اور وہ وقت کو اپنے کام لائے۔ نوابوں کی حویلیوں میں اُلّو بولے اور اُن کی اولادوں کے ذہنوں سے ماضی کی شوکت و شان کو زبردستی نکالا گیا۔ زمینیں چھن گئیں تو عیش کوشی سے بسر کرنے والے بھکاری بن گئے ان کی نگاہوں کے سامنے سے پردے ہٹے اور وہ تلخ حقائق سے آنکھیں نہ ملا سکے۔ ہنٹر نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ گرتی ہوئی حویلیوں کے اندر پردہ دار بیبیاں پیوند لگے کپڑے پہنے کسی معجزے کا انتظار کرتی کرتی گزر گئیں۔ پیٹ بھر کر روٹی کبھی نہ ملی اور دنیا میں اپنا مقام بنانے کے لیے نئی نسلوں کو صرف خواب نصیب ہوئے۔ انگریزوں نے اُن کو اُن کے وقار کو ان کی زندگیوں کو مٹی میں ملانے اور پاؤں تلے روندنے کی پوری کوششیں کیں۔ نہ ان کے پاس زمینیں رہیں نہ عزت نہ حکومت رہی اور نہ ہی کوئی نشان۔ اُن کے مقابلے میں کمتر ین ذاتوں کو آگے بڑھایا گیا تو زندگی میں مروت، لحاظ، حیا اور ساری اقدار میں کیسا ایک انقلاب آ گیا جو پہلے

مہذب لوگوں کا زیور تھیں متروک ہوئیں۔ بنگالیوں کے لیے انقلاب بہت پہلے آیا تھا اور انھیں بے آسرا بے سہارا کر کے چھوڑ گیا۔
جب قوم میں خود اعتمادی کا فقدان ہو تو وہ ترقی کہاں سے کر سکتی ہے۔ وہ سوتے جاگتے خواب دیکھتی ہے اور ان دیکھے خدا سے اور
عنایات کی نہیں صرف رحم و کرم کی اُمیدوار رہتی ہے۔ سجدوں میں گر کر گڑگڑاتی ہے اور اُسے اپنی پہچان نہیں رہتی۔ زندگی مسلسل
طوفانوں کی زد میں اور پناہ نہ آسرا۔ ہوتے ہوتے بے حسی طاری ہو جاتی ہے دنیا کی بے ثباتی پر یقین اور اس کے لیے کسی مشقت
کی تمنا کوئی جوش اور کوئی ولولہ باقی نہیں رہتا۔ ایک زمانے میں یہ بے حسی پورے ہندوستان کا زیور تھی۔ ملک ایک خواب کی گرفت
میں تھا اُس پر ایک جادو کر دیا گیا تھا ایسی نیند میں ڈوبا ہوا جس کو اپنے ماضی سے شرمندگی تھی اور اپنے بزرگوں کو اپنے خون
بھی اپنی رگوں میں باقی ہونے پر کوفت تھی۔

سستی اور شکست خوردگی ذہنی بیماری تھی اور جھوٹی عزت۔ پڑھ لکھ کر سرکاری شعبوں میں کلرک ہونا ہی نصب العین تھا۔
اور پھر غیر ملکی حکومت کی اتنی بڑی مشینری کے ادنیٰ کل پرزے ہونا اور ان کی نقل میں کپڑے پہننا رہنا سہنا اور ان کے انداز میں سوچنا
ہی فیشن قرار پایا تھا۔ لوگوں کو کچھ سوجھتا نہ تھا اور ذلت کے گڑھوں میں گرنا ہی اُن کی منزل تھی۔ ساری دولت اور اُس کے
ساتھ سارا سرمایہ حیات جس میں اخلاق اور اقدار بھی تھیں غیروں کی جیبوں میں چلا گیا۔ مغل عہد حکومت کے ساتھ ساتھ ہندوستان
پر ایک سیاہ رات چھا گئی جس میں نہ تارے تھے اور نہ ہی ہوا کا ایک جھونکا۔ سناٹا پر ہیبت اور ڈرانے والا خاموشی جو بھاری
بوجھ بن کر خوف زدہ کرتی ہے۔

انگلستان سے آنے والے اُن سب راہوں پر قابض تھے جو دولتِ دنیا کی طرف جاتی ہیں۔ صوفیہ اور پنڈت۔ اللہ والے
اور رام نام جپنے والے بے ثباتیٔ عالم کا درس دیتے رہے گنگا میں نہاتے اور شب زندہ داری کا سبق دیتے رہے اور صرف ایک قوم
جو بیدار تھی اپنے مقاصد پر نظر رکھتی تھی آگے بڑھتی گئی۔ بیباکی کے ساتھ نہایت اعتماد سے عزم کے ساتھ۔ پرانی بساطیں سمٹتی گئیں اور
وفاداروں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جو سورج کی پرستش کرتا تھا اور زندگی کی پوجا میں لگا رہتا تھا۔ سارے پیغام پس پشت ڈال
دیے گئے اور مشرقی لوگ دامن پھیلائے دوستی کا ہاتھ بڑھائے رہے۔ اکتارے پر معرفتی گانے اور دنیا پر مُرلی منوہر کے گیت ——
حمد و نعت اور ٹیپو سلطان کا شبدوں سے دل بہلانا کھیل ثابت ہوا جو کام اورنگ زیب ایک زندگی دکن میں رہ کر نہ کر پایا تھا وہ نئے
حاکموں نے چند سالوں میں کر دکھایا۔ سوداگروں نے اپنا چولا بدلا وہ اپنے اصل روپ میں ظاہر ہوئے اور سات سمندر پار سے
آئی ہوئی معمولی طالع آزما سپاہیوں کی نہایت معمولی بیویاں بگھیوں میں دندناتی پھرتی تھیں جن کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ خالی سڑکوں
پر سنائی دیتی تھی اور اعلیٰ مذہب اعلیٰ اقدار اور اعلیٰ نسل کے لوگوں کا مذاق اڑاتی گئی تھی۔

[illegible] والوں کے دماغ سے پشتوں کے بعد بھی حکومت کی بو نہیں گئی وہ اب بھی ویسے ہی ہیں۔"
آفندی اُن دنوں بھلا مجھے کیسے پتا چل سکتا تھا کہ فخر کی وجہ سے وہ بیچاری اتنی پریشان رہا کرتی تھیں۔
"فخر کی وجہ سے" میں جیسے نیند سے جاگی۔
ہاں فخر کبھی اُن سے بات جو نہیں کرتے تھے۔

مگر ابھی تو تم نے کہا ہے کہ ان کی ناک خود ہوا میں اٹھی رہتی تھی اور وہ کسی سے کم نہیں تھیں۔ اصل نسل اینگلو انڈین تھیں۔ انگریزی لب و لہجہ اور لباس آداب عادات و اطوار پھر تمہیں کیا معلوم ہوا کہ انھیں شکایت تھی۔

یہ مجھے بہت بعد میں پتا چلا جب اُن کی میری دوستی ہوگئی۔

"تم بھی عجیب و غریب ہو لوزا النہار بیگم" اور وہ تمہارے فخر بھی عجیب و غریب تھے"۔ اچھا تعجب ہے میں سمجھتی ہوں تم ان کے متعلق بات کرنے میں ذرا انضباط نہیں کر رہے۔ نہایت سختی سے جانچتے ہو ورنہ وہ بیچارے تو اپنے بزرگوں کے خون کو جو ان کی رگوں میں دوڑ رہا تھا حفاظت کر رہے تھے۔ اور اُن کا ہی کیا ہے پورا بنگال ایک بخار کی حالت میں تپ رہا تھا۔ ہم لوگ جذباتی ہوتے ہیں ندی میں آنے والے جوار بھاٹے کے سے مزاج۔

"مگر فخر تو بنگالی نہ تھے"۔ میں نے کہا۔

"ہاں ایک لحاظ سے وہ بنگالی نہیں تھے مگر ایک صدی نے اُن کے مزاج کی خو بو کچھ تو بدل ہی ڈالی ہوگی ان کے اندر وہ تندی و تیزی نہیں۔ یہ ہوگی پہاڑی ندی کی سی وہ ٹکرانے اور فنا کر دینے کی عادت اور اُن بیچاروں کا ہی کیا ہے آخر مٹھی بھر لوگوں نے اُن پر حکومت کی۔"

"مٹھی بھر لوگوں نے؟" میں نے دہرایا۔

ہاں بھئی آفندی تمہیں میری باتیں معمہ کیوں لگ رہی ہیں۔ انگریز سوداگر بنگال کے راستے آئے اور سارے ہندوستان میں چھا گئے۔ بنگال سب سے زرخیز صوبہ تھا سونا اگلتی سرزمین۔ اُس زمین کے باوجود نے انھیں گرفتار کر لیا انہی کے جلاد نے واجد علی شاہ کو قید کیا۔ واجد علی بیچارے اس مرطوب آب و ہوا میں ہار کر بیٹھ گئے جلا وطنی کو انہوں نے سجا لیا اپنی الگ دنیا بسا لی۔ وہ اپنی کشتیاں اپنے پیچھے جلا کر آئے تھے ایسے لوگوں سے وفا کی امید کر رہے تھے جو پورے بنگال کی دولت سمیٹ کر لے جا چکے تھے اور جن کے لئے نہ کوئی اخلاقی قانون تھے اور نہ ہی کوئی اصول حیات حکمرانوں کے طور اطوار نہیں یہ لوٹ مچانے والوں کا مزاج تھا مہربانی اور مروت کے لئے اُن کے پاس وقت کہاں تھا اور پھر اپنوں کو بیچنے کی ریت بھی تو تمہارے ہاں سے ہی چلی تھی بکتے بکتے نوبت تم تک پہنچی۔

"ہاں میں نے کب کہا ہے کہ بکتے رہنے کی عادت نئی ہے" اُس نے بہت آہستہ سے کہا۔

ہمارے خون میں کیا تھا جس نے ہمیں آن لائے حس بنا دیا۔ ہماری آب و ہوا میں کیا بات تھی؟ شاید آدمی روز روز کی تباہی کا عادی ہو کر چیزوں سے محبت کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ طوفان اور آفتیں روز کا معمول ہوں تو گھر بنانے اس کی حفاظت کرنے اس کے لیے پریشان ہونے کی تمنا باقی نہیں رہتی سمندر سپاٹ میدانوں پر چڑھ دوڑتا ہے ندی نالے اُبلتے ہیں آسمان برستا ہے بھلا ایسے میں کوئی کس کس شے کو سمیٹ لے گا۔ دریا گزرگاہیں بدلتے ہوئے آبادیوں کے نام و نشان مٹتے ہوئے بے پایاں بے کنار پانی ہی پانی جس میں ڈوبی ہوئی زمین زندگی کے نشانوں سے خالی آدمی پناہ گاہیں ڈھونڈتا ہوا۔ ایسے میں تم کسی شے سے محبت کر سکتے ہو؟

میں نے صرف سر ہلا دیا۔

ایسے بے یقین موسموں نے آدمی کے مزاج کو بھی اپنے مطابق بنا لیا وفا شعاریاں نہ رہیں اور سب سے زیادہ نقصان خود اپنے

آپ کو ہوا فخر ایسی تیز ہوا میں اپنا دیا جلائے طوفانوں کا مقابلہ کرنے نکلے تھے اور انہوں نے اپنا ساتھی مجھے بنایا۔ وہ کوئی انقلاب نہیں لانا چاہتے تھے مگر اپنے بزرگوں کے خون اور ورثے میں ملی فن کی خدمت کو وہ بھلانا اور پھینکنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ گوپیوں کی پٹنیں تو رکھ نہیں سکتے تھے انہوں نے مجھ میں۔ میں جو اُن کی تخلیق تھی ساری صفتیں صنعت کی طرح ٹھساٹھس بھر دیں۔ روتھ کہتیں "تم لوگ بدل نہیں سکتے تمہاری بیماری ازلی ہے روح کی بیماری۔ جسم کو تو ٹھیک کیا جا سکتا ہے روح کو کوئی کہاں سے بدل سکتا ہے؟"

کیوں آفندی تم روح میں یقین رکھتے ہو۔

"ایک حد تک" میں نے کہا۔

ہاں اگر روح میں تم پورا یقین کرنے لگو تو پھر آدمی کو اگلے جہان کی فکر کرنا پڑتی ہے آتما کے امر ہونے کے ساتھ ساتھ تم اس روح کے ساتھ جو کچھ کرتے ہو اُس کو بھی تو برباد ہوتا نہیں دیکھ سکتے اور اگر آدمی کو یہ معلوم ہو کہ اُس کے پیچھے اُس کے اچھے بُرے کرموں کا پھل بس لگ جائے گا تو وہ ذرا سنبھل کر چلے ذرا ہوش سے قدم دھرے اور یوں اپنے کو اور دوسروں کو برباد ہونے سے بچالے۔ کم از کم بچانے کی کوشش کرے۔

رت کا پنچھی پھر اُس صدا جاگتے شہر کے اوپر منڈلا رہا تھا اور اپنے مہمانوں کی خبر بھی تو لینا ہو گی۔" پتا نہیں یہ کیا کہنا چاہتی ہے اور کیوں میں اب تک یہ ہی نہیں سمجھ سکا تھا۔

کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ روح فنا ہوتی ہے یا نہیں۔

"کچھ روحیں فنا شدہ پیدا ہوتی ہیں ڈوبی ہوئیں پہلے سے برباد شدہ اُن کے لئے یہ کہنا کہ فنا ہے یا نہیں بیکار ہے۔" پتا نہیں میں کیوں یونہی تلخ ہوا جا رہا تھا۔

روحیں جو بھاری پتھروں میں بندھی ہوئی ہوتی ہیں۔ روحیں جو لاکھ کوشش کے باوجود رہائی نہیں پا سکتیں۔" مگر نور انہار بیگم جب آدمی نہیں رہتا تو اُسے کیا خوف کہ کیا ہوتا ہے۔"

"آفندی مجھے ڈر لگتا ہے پتا نہیں مجھے کیوں ڈر لگ رہا ہے۔" اس نے میرا بازو تھام لیا۔

"اگر موت کے بعد عذاب دائمی ہوا تو۔"

"موت" مجھے ایک جھرجھری آئی۔

ہاں آفندی موت۔ روتھ کہتی تھیں اگر مرنے سے پہلے آدمی گناہوں کی معافی مانگ لے توبہ کرے اعتراف کر لے تو وہ عذاب سے بچ جاتا ہے۔ مجھے اُن دنوں دل ہی دل میں اس کی بات پر ہنسی آیا کرتی تھی۔ گناہ کا تعلق تو آدمی کی روح سے ہوتا ہے اور یہ بوجھ جب اُس کے تانے بانے میں ہو تو پھر اعتراف سے کیا بن سکتا ہے۔ کئے کی سزا تو بھگتنا ہوتی ہے نا!

"شاید یہ بھی تمہاری سرزمین کی خصوصیت ہے لحظہ لحظہ بدلتی ہوئی تمہاری گفتگو۔ ابھی دریاؤں کی روانی ہے ابھی وہ کناروں سے اچھلا پھیلا اور فنا کے مقام تک آ پہنچا۔ بھئی تم آج رات اتنی اکھڑی ہوئی کیوں ہو۔ پھر کبھی باتیں کریں گے۔ میں وعدہ کرتا ہوں چلو اب چلیں۔"

"تم گواہ ہونا تم نے ابھی کہا تھا کچھ روحیں پیدا ہی اس طرح ہوتی ہیں بھاری پتھروں میں بندھی۔"

"اب میرا کہا تم پلو میں تو مت باندھو ایک بات جی میں آئی میں نے کہہ دی ہو سکتا ہے یہ سب غلط ہو اور خدا نے انسان کو اپنا راستہ خود چننے اور اس پر چلنے کا پورا اختیار دے رکھا ہو۔ نور النہار بیگم اصل میں ازل سے جو ہونا ہوتا ہے وہ مقدر ہو چکا ہوتا ہے مگر یقین سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ یہ جو میں اور تم اس گھڑی یہاں ہیں گفتگو کر رہے ہیں وقت اور گھڑی اور تمہارا اور میرا یہاں موجود ہونا اس کا نقشہ بہت پہلے بن چکا ہو اور ہم صرف اور محض دو سایوں کی طرح اُن احکامات کی تعمیل ہی کر رہے ہوں ہماری اپنی مرضی کو اس میں کوئی دخل نہ ہو۔ ہم جو کر رہے ہوں اُس میں ہم سے پوچھے بنا ہی ہماری دخل کے بنا ہی کسی اور عظیم تر ہماری عقل کی رسائی سے پرے کسی طاقت کا ہاتھ ہو جو ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ یا ہو سکتا ہے میں جو کچھ کہہ رہا ہوں یہ سب میرا وہم ہو اور یہ سب پہلے سے طے شدہ نہ ہو۔ بلکہ یہ خیال بھی اس خاص لمحے کی جو تم پر سے اور مجھ پر سے گزر رہا ہو پیداوار ہو۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا کسی سوال کا کوئی حتمی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ نیکی اور بدی کیا ہے اس کو کون جانے ؟ گناہ کتنا حسین پرکشش اور دلکش ہوتا ہے اور اس کے باوجود اس کے اندر اُس کی اپنی بربادی کے بیج ہوتے ہیں۔ تباہی خود اُس میں سے نکلتی ہے۔ آتش فشاں کی طرح وہ اُس کے اندر خوابیدہ ہوتی ہے اور پھر وہ یکایک بیدار ہوتی ہے اور کبھی کبھار نیکی بھی بلکہ اکثر اُس کی زد میں آ کر اُس کی لپیٹ میں فنا ہوتی ہے۔ آدمی نہایت اچھے دل سے بہت ہی یقین سے ایک اچھا کام کرتا ہے امن اور آشتی اور پاکیزگی کا تصور دل میں لے کر نکلتا ہے سیدھے راہ پر اسے بھٹکنے کا کوئی ڈر نہیں ہوتا اور پھر کائنات جھنجھلاتی ہوئی اس کے خلاف نہایت تندی اور مستعدی سے لگتی ہے اور اس کا نقش تک مٹا کر رکھ دیتی ہے۔ نور النہار بیگم میں نے جتنی دنیا دیکھی ہے اس میں جتنے تماشے دیکھے ہیں انہوں نے مجھے گنگ کر دیا ہے اس لیے میں تمہارے سوالوں کے جواب یقین سے نہیں دے سکتا۔ انسان کی حیثیت اُس بڑی کائنات کے مقابلے میں ہے کیا کہ وہ ان سوالوں کے جواب دے بڑے بڑے انسان عظمتوں کے چراغ لے کر فنا کی راہ پر نکلے اور گم ہو گئے کوئی لوٹ کر نہیں آتا کہ یقین اور اعتماد سے کسی کو مطمئن کر سکے۔"

"پھر یہ خوف کیوں ہے؟" نور النہار نے پوچھا۔

"کوئی ضروری بات نہیں کہ خوف ہو تم جسے خوف کہتی ہو وہ شاید حیرت ہو۔ رات ستاروں بھری اربوں کھربوں دنیاؤں پر محیط اور آسمان جھکا ہوا اور پھر بھی پہنچ سے دُور اور عقل اس کو احاطہ نہیں کر سکتی اور پھر بھی انسان اپنے آپ کو کائنات کا محور جانتا ہے اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات کبھی سنی ہے۔ مگر خدا اُسے اشرف المخلوقات کہتا ہے اور وہ ٹھیک ہی کہتا ہوگا۔ سوچو تو سہی تم اور میں نہایت کمزور اور کم عقل ان چاند ستاروں اور ان دنیاؤں سے بھی عمدہ اور اعلیٰ کیونکہ ہم حیران ہو سکتے ہیں اور اس پر غور کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ جب اتنی خوب صورت کائنات کا وجود ہے تو موت ڈرا نہیں سکتی اس لئے کہ انسان جب ایک بار پیدا ہوتا ہے تو اس کا حصہ بن جاتا ہے وہ عدم سے وجود میں آتا ہے اور پھر موت اُسے فنا نہیں کر سکتی۔ وہ روح بن کر ان سب چیزوں میں جاری و ساری رہتا ہے۔" میں چُپ ہو گیا۔

"یہ خیال کافی خوش کُن ہے مگر بقول تمہارے اس کا بھی کیا اعتبار" نور النہار نے کہا۔

”تم کبھی بھجن کیرتن سُننے گئی ہو“ میں نے پوچھا

”یہاں“۔ امریکہ میں تو نہیں مگر اپنے وہاں کوئی ایک گان تو نہیں ہوتا نا۔ نغموں کی سرزمین ہے وہ دیس مرشدی گان، معرفتی گانوں کے تو فخر بھی استاد تھے پھر وہ گانے والوں کی ٹولیاں جو رات رات بھر ہزاروں کی تعداد میں شمعوں کی روشنی میں گاتے تھے۔ دریا پر بہنے والی کشتیوں کو کھینے والے بھٹیالی گیت گاتے تھے جو مجھے یاد ہے میرا باپ اکتارہ بجانے میں استاد تھا۔ یہ حزن جو میری طبیعت میں ہے یہ بھی اسی علاقے پر سے مجھے ملا: یہاں نارل دھاروں کی وہ بے اعتبار زمین ہے۔ بانس کے گھنے جنگلوں سے ڈھکی ہوئی ندیوں پر بوجھ اُٹھائے لنکاس، جلکیا اور پانچوی کشتیاں بہتی ہوئیں اپنے خوف سے نجات پانے کے لیے گاتے ہوئے مانجھی تیزی سے مڑتے اُبلتے پھیلتے دریا۔ چاول کی خوشبو میں جنگل کی باس اور نمی سے بوجھل دھوپ۔ ذرا ذرا سے مچھلیوں سے بھرے تال اور اُن سے پرے چنگھاڑتے ہاتھی اور چائے کے باغوں میں گم ہوتے راستے گہری سیاہ کاجل سی گھٹائیں اور دریا جن کا دوسرا کنارہ نظر نہیں آتا اور بے پناہ شور سے تباہی بن کر آتی ہوئی بُور کی آواز۔ دو منزلہ شہروں کی موت بن کر اٹھتی لہریں۔ جینے اور مرنے کے درمیان لٹکتے ہوئے لوگ۔ ہم لوگوں کے لیے اگر کوئی پناہ ہے تو گیت ہیں مجھ سے تم پوچھتے ہو میں کبھی بھجن کیرتن سننے گئی ہوں؟ اور پھر فخر تو بہت ہی حزن پسند تھے میں نے انھیں ہنستے کبھی نہیں دیکھا ہمیشہ اداس رہنے والے۔ اصل میں پورے ہندوستان میں مسلمان تہذیب کی بربادی جس کو انگریزوں نے اپنا نصب العین بنا لیا تھا فخر پر کچھ زیادہ ہی اثر انداز ہوئی۔ میں ان کے خاندان کے اور لوگوں کو دیکھتی بڑے دل سے سرکاری نوکریوں میں لگے ہیں۔ تہذیب کو اپنا رہے ہیں اور مٹیا برج کی بڑھتی آبادی پر ایک دم انگلستان کے نہایت قدیم متوسط طبقے کا گمان ہونے لگا تھا لڑکیاں فراٹے سے انگریزی بولتی تھیں اور موٹریں چلاتی تھیں یہ طرزِ زندگی اُمرا کے طبقے کی خصوصیت تھی آدھا لکھنؤ مٹیا برج میں بستا تھا اور مٹیا برج کی روایتیں لکھنوی ہونے کے باوجود خالصتاً کلکتے کی بھی تھیں گھروں میں اُردو بولی جاتی تھی اور خادموں کی زبان کلکتے کی بنگلہ تھی۔ مگر فخر اُن سب سے مختلف تھے وہ اپنے خاندان والوں سے بھی بہت کم میل ملاپ رکھتے تھے۔ اُن کے خواب جلنے کاہے سے عبارت ہوں گے کیوں کہ میں نے انھیں بہت کم بات کرتے دیکھا تھا۔ حکم دیتے تھے مگر اس میں حکم کا شائبہ نہیں ہوتا تھا۔ جیسے التجا کر رہے ہوں وضع داری اور مروت اُن پر ختم تھی اور پھر میں تو اُن کی تخلیق ہوں پتا نہیں انہوں نے مجھے دیکھ کر ایسے ہی سوچا ہو گا جیسے ایک بُت تراش پتھر کو دیکھ کر سوچتا ہے اُس میں چھپے خد و خال کو وہ دن کی روشنی اور زندگی دے گا۔

”ان کا کیا بنا مطلب یہ ہے تم ایسے بات کرتی ہو جیسے وہ اب نہ ہوں“ میں نے پوچھا۔

”وہ وہیں ہوں گے بڑی سی ڈھنڈار حویلی کے باغوں سے گھر کے دالانوں اور بوسیدہ چھتوں کے سایوں میں ٹہلتے ہوئے۔ جب روقہ کے ساتھ میں نے انھیں چھوڑا تھا“

”چھوڑا تھا“ میں نے پھر دہرایا۔ ”تم انھیں چھوڑ کر چلی آئیں۔ تم جو خود اُس بات کو قبول کرتی ہو کہ انہوں نے تمہیں وہ بنایا جو تم ہو“ میں نے حیرت سے کہا۔

”ہاں آفندی میں انھیں چھوڑ کر چلی آئی حالانکہ انہوں نے میرے ٹھہرے ہوئے اندھیرے کو روشنی دی تھی میری بے جان آنکھوں کو روشنی عطا کی تھی۔ مجھے زندگی سے آشنا کیا تھا۔ پر جیسے ڈوبتا ہوا دن کانپتے ہوئے اُجالے سے لرزاں غیر محدود محبت

مانگے جیسے بھوکی اندھی آنکھیں روشنی کی چاہ کریں جیسے موسموں کے چکر میں کھِلتے کنول سے کوئی اس کی خوشبو کو چھیننا چاہے انہوں نے مجھے بنایا اور پھر بے لفظوں کے وہ مجھے کتنا چاہتے تھے ۔ بنا کہے کسی احسان کے بغیر۔ مجھے وہ شام یاد آ رہی ہے جب پہلی بار انہوں نے اکتارہ سکھانے کے بعد مجھے اجازت دی تھی کہ میں پورے خاندان کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کروں ۔ کتنی گہما گہمی تھی روشنیاں اور رونق اور میرا رنگین آنچل بادلوں بھری شام کا سا نیا اکتارہ موتیوں سے جڑا ہوا اور میری سوتی مانگ پھولوں کے گہنے سے چھپی ہوئی اندر سے کانپتے دل کے ساتھ کانپتے قدموں کے ساتھ عورتوں کی سرگوشیوں اور لڑکیوں کی جھنکار بھری ہنسی کے درمیان اُن کی تیکھی نظروں کے سامنے میں نے اکتارہ تھاما ہے تو سینے میں پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی۔ فخر ایک کونے میں سر جھکائے بیٹھے تھے جیسے اُن کا اس سارے ہنگامے سے کوئی تعلق ہی نہ ہو کسی نے کہا کیا بس ایک کونے سے آواز آئی ان کو نور محل کا خطاب دے دیجئے۔ میری جھکی ہوئی نظریں اور بند آنکھوں کے پیچھے پتلیاں اور ہاتھوں میں جان کانپ گئی جیسے لرزہ چڑھتا ہے میں نے اکتارہ پرے لڑھکا دیا اور فخر کے غصے سے سرخ چہرے کو دیکھا ۔ انہوں نے سُنی اَن سُنی کر دی اور ساز کو خود بجانا شروع کیا۔ یہ کہنے والے کی بات کا جواب تھا ۔ پھر بڑی بی بی اُن کی بھتیجی اکتارہ بجاتی رہیں اور اُس کی سُرخ انگلیوں سے جیسے اُڑ رہا تھا محفل میں رنگ ہی رنگ پھیل گیا ۔ آفندی یادیں یوں چلی آ رہی ہیں ۔ وہ ذرا دیر کو رُکی۔

حویلی کی دیواروں سے پرے اُن والانوں سے پرے جو سویرے طلوع ہو رہے تھے ۔ جو اُجالے پھیل رہے تھے زمانہ جس طرح بدل رہا تھا روشنی کی باتوں نے مجھے جس طرح دیوانہ بنایا وہ بڑی لمبی کہانی ہے ۔ مدحت نہ میرے دوست تھے اور نہ میرا ان سے کوئی رشتہ تھا میں نے صرف اُن کا سہارا لیا اور نئی دنیا کے اندھیرے میں ایک لمبی چھلانگ لگا دی جب اوپر اُبھری ہوں تو سب کچھ بدل چکا تھا ۔ بن بادلوں کے سورج کی ایک لمبی دوپہر نے میری ناؤ کو پگھلا دیا مانو یہ بھی کسی دھات کی بنی تھی کہ گرمی سے سارے جوڑ کھل گئے ۔ ایسے میں تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے میں تیرنا تو نہ جانتی تھی۔ نالوں اور دریاؤں کے دیس نے اس پنے کو آئی مگر میرا دل سدا مٹیا بُرج میں پڑا رہا۔ جیسے ساری سمتیں کھو کر بس میرے لیے ایک ہی سمت باقی رہی ہو۔ وہ بھولا ہوا گھر جو ہوش کے جھٹ پٹے میں کہیں مجھ سے چھن گیا تھا اپنی لبھاتی آوازوں کے ساتھ مجھے بلاتا ہو وہ چپ ہو گئی جیسے کان لگائے اُن صداؤں کو سننے کی کوشش میں ہو۔

" یہ عرصہ یہ تمام وقت تم نے آج سے پہلے کا اس لمحے سے پہلے کا کہیں تو گزارا ہوگا۔ وہ سارا دن جو اپنی روشنی کی طاقت سے تمہیں جلا بخشتے رہے ہوں گے وہ جو تمہیں بناتے رہے ہوں گے ۔" میں نے بنا کسی بھید کو جاننے کی کوشش کے کہا۔

" آفندی اگر میں تمہیں کچھ بتانا نہ چاہوں تو تم مجھے دوش نہ دو میرا دل بہت بھاری ہو رہا ہے یادوں سے اور نا امیدیوں سے گناہوں سے جو مجھ سے جانے اور اَن جانے سرزد ہوئے مگر مجھے اپنی مٹی سے بہت پیار رہا ہے شاید یہی میری روح کو سدا کے لیے ڈوبنے سے بچالے۔

تب بالکل ایسے جیسے کائنات میں سے کوئی کہانی سنتے سنتے ہنکارا بھرے کسی پرندے کی تیز آواز آئی تاروں کے نیچے پروں کی پھڑپھڑاہٹ ہوئی مشرق کی ایک تاریک لکیر سی پھیلنی شروع ہو گئی ۔ نور النہار سر جھکائے یوں کھڑی تھی جیسے اَن دیکھی انجانی قوتوں کے سامنے ہو اور پرانے مندر کے اندر دیوتا کے آسن پر جھکنے جا رہی ہو ۔ ستاروں کا مدھم اُجالا اُس سفیدی میں گھلا ہوا تھا جو مشرق کی طرف واضح ہوتی جاتی تھی۔

آفندی زندگی خوبصورت رہی ہے مکمل اور موت بھی اگر ایسی ہی مکمل ہو تو کتنا اچھا لگے میں کسی دوسرے جنم میں یقین تو نہیں رکھتی پر اگر دوسری بار بھی فرصتِ زندگی ملے تو اس رات کی طرح پُر سکون مکمل اور خوشبو سے لبریز ہو پھر اس نے ادھر اُدھر دیکھا اپنے بازو اوپر اُٹھا کر ہوا میں لہرائے "آؤ چلیں"۔

جب میں اُس کے دروازے پر الوداع کہہ رہا تھا تو اُس نے کہا اپنا پتا تو مجھے بتاتے جاؤ۔ میں نے پتا بتا دیا اور چلا آیا۔ اخبار والے لڑکے اور دودھ کی گاڑیاں تیزی سے گزرتی موٹروں کی روشنیاں مجھے صبح صادق کی خوشگواری میں ملیں جیسے یہ سب خوش آمدید کہہ رہے ہوں۔ عجیب عجیب خوشبوئیں اور رنگ برنگ بتیاں ڈیوڑھیوں میں جلتی ہوئیں۔ دربان عمارتوں کے سامنے اونگھتے ہوتے مگر پتا نہیں کیوں بے خوابی کا کوئی اثر مجھ پر نہ تھا میں تازہ دم تھا اور فلک بوس عمارتوں کے سایوں میں بڑی جلتی روشنیوں سے منور مارکیٹوں کے سامنے سے میں گزرتا چلا گیا۔ جیسے خالی شہر میں اکیلا ہی ہوں۔ بہت سے بھولے بسرے گیت میرے ذہن میں آتے رہے۔ میں سوچ رہا تھا نور النہار عجیب و غریب عورت ہے اپارٹمنٹ میں گھُسا ہوں اور دروازہ کھولا ہے تو فون کی بجتی گھنٹی کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔ ایسی صبح میں کون ہو سکتا ہے مجھے حیرت تھی؟ اتنے بھرے پُرے شہر میں کسے ایسے میں میری ضرورت آن پڑی۔ اکسی کے مارے میں نے اُسے یونہی بجنے دیا۔

گھنٹی دوبارہ بجی کافی کے لیے میں نے کیتلی کا سوچ آن کر دیا تھا جوتے پلنگ کے نیچے پھینکے کپڑے اتار کر یونہی بستر پہ بکھیر دیے اُس پر کوئی شکن تک نہ تھی کھڑکی کھول کر میں نے بادلوں کی ٹھنڈ کو اندر آنے دیا اور پھر ریسیور اُٹھا کر ہیلو کہا۔

"آفندی بہت دیر میں گھر پہنچے ہو۔"

"اوہ نور النہار بیگم صبح بخیر میری کھڑکی میں سے آسمان دکھائی دیتا ہے۔"

"شب بخیر آفندی"۔ اُس نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "جی چاہا تھا کہ تمھیں ایک بار پھر الوداع کہہ لوں"۔ اور اس نے دوسرے سرے پر بات ختم کر دی مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ ملا۔ سیاہ تیز گرم کافی کا مگ پکڑا اور کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا سردی کی لہریں مجھے کپکپا رہی تھیں۔ ستارے اکا دکا اکیلے مسافروں کی طرح اپنے سفر میں لگے تھے جیسے تھک کر بس اپنی منزل کے قریب پہنچنے والے ہوں۔ رات اپنی بوجھل پلکوں کے نیچے نیند میں ملتی ڈولتی نہ تھی اور آسمان کا جتنا حصہ سامنے کی فلک بوس عمارت کے گرد سے نظر آتا تھا وہ اتنا تازہ لگ رہا تھا بالکل سفید ہوتا ہوا جیسے خدا نے پہلے دن اُسے بنا کر ابھی ختم کیا ہو۔ بادل بے رنگ تھے اور اُن کی مختلف شکلیں تیر رہی تھیں بھگوان جو ہے پر سوار ہوں بجر نگ بلی کہیں سے آ رہے ہوں اور اُتر رہے ہوں۔ بلبل اپنے نغمے کو لئے ہوا میں اُڑی جا رہی ہو۔ بڑی سی نوکا میں بڈھا آدمی اکیلا اُداس بیٹھا ہوا اپنی گرد گردی بیتا ہوا بے حد بے چین اور نوکا بھی جا رہی ہو پھر وہ اُس ایک سو ایک منزلوں والی بلڈنگ سے پرے تیزی سے بہتی ہوئی غائب ہو گئی اُمنڈتے ہوئے دریا کی بڑی سی لہر کشتیوں کو ڈبونے کے لیے چلی آ رہی ہو۔ چھوٹے چھوٹے جزیروں کو اپنی رو میں فنا کرتی ہوئی۔ بڑے بڑے درخت تنکوں کی طرح اُس کے ساتھ ہوں پھر بیٹھے ہوئے لوگوں کی ایک ٹولی جیسے مراقبے میں ہوں اور تخت پر مہاراجہ براجمان ہوں پتا

نہیں اُن کی آنکھیں بند ہیں کہ کھلی اتنی دوری سے مجھے پتا ہی نہ چل پایا۔ اپنے چکر والے پاؤں کو گود میں رکھے چُپ چاپ من ہی من میں مسکراتے ہوئے مایا اور مایا جال کو اپنی ہونٹوں کے کناروں کو چھوتی آنکھوں میں گلابی ڈوروں کی طرح پھیلتی مسکان سے دیکھتے ہوئے کیوں کہ وہ اُس کے نیدمن سے باقی سب نیدمنوں سے اُونچے اُٹھ چکے ہیں۔ مایا کا جادو اس وقت تک کام کرتا ہے جب تک اُس کی خواہش کرتے رہو۔

آنکھیں مل کر میں نے اُن صورتوں کو پھر سے دیکھا بادل کے یہ ٹکڑے گزر چکے تھے اور میری نگاہوں کے سامنے دور تک پھیلا پتا نہیں کتنا اونچا کا ہے کا بنا ہوا بہت ہی مطمئن آسمان خالی تھا جس کے اندر سے روشنی کی گلابیاں اب بس نکلنے ہی والی تھیں پتا نہیں کافی پینے کے بعد مجھے ایک دم تھکن کیوں محسوس ہوئی جیسے پوری زندگی میں چلتا رہا ہوں اور اگر بستر پہ نہیں گرا تو ڈھے جاؤں گا۔ میں نے کھڑکی بند کر دی دفتر سے غیر حاضری کے لیے ایک چٹ لکھ کر دروازے کے باہر کی طرف رکھ دی اور سو گیا۔

جب میں اُٹھا ہوں اور شام کے اخبار پر نظر ڈالی ہے تو دنیا خالی ہو چکی تھی۔ کلچرل ڈیلی گیشن کی لیڈ ساندھیروں کے اس پار جا چکی تھی۔ تیزی سے بہتی ہوئی لو کا اُکٹ گئی تھی اور چاول کے بدلے بکنے والی بیگم مدحت حسین سے اگر تم کوئی سوال بھی کرو تو اُس کا جواب نہیں مل سکتا تھا۔ کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ خودکشی کرنے کے لئے آدمی کو کتنی ہمت کی ضرورت ہوتی ہے؟

یہ صورت گر
کچھ خوابوں کے
طاہر مسعود
قدرت اللہ شہاب
مجنوں گورکھپوری
جمیل جالبی
سلیم احمد
انتظار حسین
غلام عباس
جمیلہ ہاشمی

یہ صورت گر کچھ خوابوں کے

(عہد حاضر کے ۲۴ اہم ادیبوں کے انٹرویو)

طاہر مسعود

مکتبہ تخلیق ادب ۸۴ ○ کراچی ۲۷

اشاعت اوّل : جنوری ۱۹۸۵ء۔ اشاعت دوم ستمبر ۱۹۸۵ء

کتابت : یونس

طابع : عظیمی پرنٹرز
ناظم آباد نمبر ۱ کراچی نمبر ۱۸

قیمت : ۵۶ روپے

خط و کتابت کا پتہ : ایس۔ ون، ۲۱۰ سعود آباد
کراچی ۲۷

فہرست

○

جمیلہ ہاشمی

جمیلہ ہاشمی افسانہ نگار و ناول نویس ہیں مگر ان کے اندر ایک شاعرہ کی روح ہے۔ قرۃ العین حیدر کو تاریخ کی شاعرہ کہا گیا ہے۔ یہی بات جمیلہ ہاشمی پر بھی صادق آتی ہے۔ عجب نہیں کہ انہوں نے قرۃ العین حیدر کے زیر اثر تاریخی کرداروں کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہو۔ وہ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں اپنے پہلے ناول "تلاش بہاراں" کے ساتھ بحیثیت ناول نگار منظرِ عام پر آئیں۔ اس ناول کو پسند کیا گیا اور اسے داؤد ادبی انعام بھی ملا۔ ناول میں حقوقِ نسواں کو موضوع بنا کر برصغیر میں عورت پر ہونے والے مظالم کی تصویر کشی کی گئی تھی پھر یکے بعد دیگرے ان کے دو ناولٹ چھپے۔ "آتشِ رفتہ" میں انہوں نے پنجاب کے گھرانوں کے طرزِ زندگی کا نہایت خوبصورت نقشہ کھینچا اور "روحی" میں چولستان (بہاولپور) کے صحرا کی زندگی کے بارے میں ایک دلکش کہانی لکھی۔ "آپ بیتی، جگ بیتی" میں افسانے اور "اپنا اپنا جہنم" میں تین طویل افسانے شامل ہیں۔ ان طویل افسانوں میں ان کے ہاں موضوع اور کہانیوں کی فضا تبدیل ہوتی ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے ان افسانوں میں عصرِ حاضر کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کو موضوع بنایا اور بالخصوص نئی نسل کے ذہنی اور جذباتی مسائل کی عکاسی کی ہے۔

"چہرہ بہ چہرہ رُو بہ رُو" میں انھوں نے قرۃ العین طاہرہ اور "دشتِ سُوس" میں حسین بن منصور حلاج جیسے تاریخی کرداروں کے گرد اپنے افسوں گر قلم سے سحر کا جالا بُنا اور مؤخرالذکر کو ایک غنائیہ قرار دیا۔

جمیلہ ہاشمی کا اسلوبِ نگارش رومانی ہے جس کے باوصف ان کی کہانیوں میں تخیل، واقعیت پر غالب رہتا ہے یعنی تخیلی باتیں، اصلی واقعات سے کہیں اہم ہوتی ہیں۔ وہ چیزوں کو ایک مخصوص فاصلے سے دیکھتی ہیں جس کی وجہ سے ان کے نقش و نگار میں دھندلاہٹ، مدہم پن اور دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ جمیلہ ہاشمی اپنے تخلیقی سفر کی ابتدا میں قرۃ العین حیدر سے بے پناہ متاثر تھیں لیکن اب وہ ان کے اثر سے آزاد ہیں۔

جمیلہ ہاشمی ۱۷ر نومبر ۱۹۲۹ء کو فیصل آباد میں پیدا ہوئیں، ان کا آبائی وطن امرتسر ہے۔ جامعہ پنجاب سے ۱۹۵۴ء میں انگریزی میں ایم اے کیا اور اسکول میں درس و تدریس کے فریضے پر مامور ہوئیں۔ شادی ایک زمیندار گھرانے میں ہوئی ان کے شوہر سردار احمد اویسی مرحوم ایک بڑے زمیندار ہونے کے علاوہ ایک گدی نشین پیر تھے جن کے سینکڑوں مرید تھے خوش قسمتی سے انہوں نے روشن نظری کا ثبوت دیتے ہوئے جمیلہ ہاشمی پر لکھنے پڑھنے کے سلسلے میں کبھی کوئی قدغن نہیں لگائی بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کے نتیجے میں جمیلہ ہاشمی سنجیدگی اور انہماک سے افسانہ و ناول نویسی میں مصروف رہیں۔

سردار احمد اویسی کے انتقال کے بعد جمیلہ ہاشمی پر زمینوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی آپڑی۔ اب وہ اپنا بیشتر وقت لکھنے پڑھنے کے علاوہ زمینداری میں صرف کرتی ہیں۔ قلم و قرطاس سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ کو ان کے سسرال میں بے معنی اور لاحاصل کام تصوّر کیا جاتا ہے لیکن ان کی اکلوتی صاحبزادی جو ان کی دوست بھی ہیں اور غمگسار بھی، ایسے مواقع پر ان کی ہمت بندھاتی ہیں اور حوصلوں کو مہمیز کرتی ہیں۔

جمیلہ ہاشمی ایک خوش گفتار خاتون ہیں۔ وہ اگست ۱۹۸۴ء میں آنکھوں کے آپریشن کے سلسلے میں کراچی آئیں تو ان کے ساتھ ایک طویل نشست میں یہ انٹرویو ریکارڈ کیا گیا۔

سوال: ادیب کی زندگی میں کبھی ایسا مرحلہ بھی آتا ہے جب اسے لکھنے سے اکتاہٹ سی ہونے لگتی ہے۔ آپ نے متعدد ناول اور بے شمار افسانے لکھے ہیں۔ کیا کبھی یہ سوچ کر کہ "بہت لکھ لیا!" آپ کو لکھنے سے بیزاری تو نہیں ہوتی؟

جمیلہ ہاشمی: یوں نہیں ہے، بلکہ میرے اندر اتنی کہانیاں نامکمل حالت میں ہیں کہ اگر میری آنکھیں میرا ساتھ دیں تو میں نے جتنا کچھ لکھا ہے، اس سے کہیں زیادہ لکھوں۔ میری ادبی زندگی مختلف نشیب و فراز سے گزری ہے۔ ابتدا میں، میں نے پے در پے رومانی افسانے لکھے تھے۔ یہ افسانے میری ادبی تربیت کا حصہ ہیں لیکن عمر کے اس موڑ پر میں سوچتی ہوں کہ میں نے زندگی سے اب تک جو کچھ سیکھا ہے، اسے سلیقے اور مہارت سے ادب کو سونپ دوں۔

ان دنوں میں اسپین کی تاریخ و تمدن اور شاعری و ادب پر کتابیں پڑھ رہی ہوں اور میرا ارادہ مسلم اسپین کے عروج و زوال کے پس منظر میں ناول لکھنے کا ہے۔ اس کا خیال مجھے ۱۹۷۶ء میں سفرِ اسپین کے دوران آیا۔ اقبال کی طویل نظم کے ذریعے مسجدِ قرطبہ سے میرا پہلے ہی تعارف ہو چکا تھا۔ اس نظم کو میں نے جانے کتنی بار پڑھا ہے اور ہر بار مجھ پر عجیب سی رقت طاری ہوئی ہے۔ جب میں نے اسپین پہنچ کر مسجدِ قرطبہ کے دروازوں کو ہاتھ لگایا تو میری آنکھوں سے بے ساختہ آنسو رواں ہو گئے۔ میں دیر تک روتی رہی۔ پھر میں نے مسجد میں دو رکعت نفل نماز ادا کی اور حیرت اور ملال کے ساتھ اس شہر کو دیکھا۔ پھر میں نے ارادہ باندھا کہ میں اسپین پر ناول لکھوں گی اور یہ ایک مختلف زاویۂ نگاہ سے لکھا جانے والا ناول ہوگا۔

سوال: آپ کے دو ناول "دشتِ سوس" اور "چہرہ بہ چہرہ رُو بہ رُو" تاریخی کرداروں کا احاطہ کرتے ہیں۔ میں پوچھنا چاہوں گا کہ آپ نے تاریخی کرداروں کو موضوع بنانے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟ کیا اس کا یہ مطلب لیا جائے کہ آپ کو اپنے اردگرد کے ماحول میں ایسے کردار نہیں ملے جنھیں آپ ناول کا موضوع بناتیں اور جس کی وجہ سے آپ نے تاریخ کی جانب سفر کیا اور وہاں سے کرداروں کو ڈھونڈ نکالا اور ان پر ناول لکھے؟

جمیلہ ہاشمی: یہ بہت اچھا سوال ہے۔ بات یہ ہے کہ تاریخ نے مجھے ہمیشہ مسحور کیا ہے اور میں نے تاریخ کا مطالعہ عہدِ حاضر کی تاریخ کے تناظر میں کیا ہے۔ کیا آپ کے خیال میں قرۃ العین طاہرہ جیسی عورتیں آج پیدا نہیں ہوتیں؟ یہ جو آزادیٔ نسواں کی تحریکیں یا اپنے ماحول سے نبرد آزما ہونے کی کوششیں ہیں، قرۃ العین طاہرہ اس کی پیش رو ہے۔ اسی طرح وہ لوگ جو اپنے کسی خواب کے لئے، کسی اعلیٰ مقصد کے لئے دار پر چڑھ گئے۔ میں نے انہی لوگوں کو اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے۔ آپ بین السطور پڑھنے کی کوشش کریں تو اندازہ ہوگا کہ اس زمانے کے درباروں میں اور اس عہد کے ماحول میں جو سانحے میرے ناول کے کرداروں پر بیتے ہیں، ہو سکتا ہے وہ آج کے انسانوں پر بھی بیت جاتے ہوں۔ کل جس شخص کو دار پر چڑھایا جاتا، ممکن ہے آج اس کو الیکٹرک شاک سے ہلاک کیا جاتا ہو۔

میں نے ہمیشہ تاریخ سے ایسے کرداروں کا انتخاب کیا ہے جن کی آفاقیت نے مجھے متاثر کیا ہے۔ لوگ تاریخ کو ماضی کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ میں تاریخ کو اپنے عہد کے تناظر میں دیکھنا چاہتی ہوں۔

سوال : آپ کے افسانوں اور ناولوں کا اسلوب بنیادی طور پر رومانی ہے۔ حالانکہ دیکھا جائے تو اردو نثر رومانوی اسلوب کو پیچھے چھوڑ آئی ہے مگر آپ کی تحریریں اسی اسلوب کی پیروی کرتی ہیں۔ کیا آپ اس بات سے اتفاق کرتی ہیں۔؟

جمیلہ ہاشمی: میں اسے تسلیم کرتی ہوں۔ رومان صرف عشق و محبت کی داستان نہیں ہوتا۔ رومان تو ہر انمول چیز میں ہوتا ہے ہر نامعلوم چیز میں، ہر اندھیرے میں رومان ہوتا ہے اور اس کی تلاش ہر رومانی ذہن کو ہوتی ہے۔ ہمیشہ نامعلوم کی تلاش .... میرے نزدیک یہی رُومان ہے۔

سوال : شاعری اور افسانے میں نظم اور نثر میں جو تفریق کی جاتی ہے اس کی بنیاد تخیل پر ہے یعنی شاعری تو تخیل کے ذریعے ہی کی جاتی ہے لیکن نثر میں تخیل کا عنصر اتنا زیادہ نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ نثر کو شاعری بنا دے۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو آپ کی نثر شاعرانہ نثر ہے۔ کیا آپ اسے فنی اعتبار سے سُقم تصوّر نہیں کرتیں۔؟

جمیلہ ہاشمی: آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں نے ایک بار لکھنے کے بعد دوبارہ کبھی مسوّدے کو دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میں نے ہمیشہ قلم برداشتہ لکھا ہے۔ افسانہ یا ناول، یہ جس طرح سے میرے ذہن میں اترے ہیں۔ میں نے ان کا اظہار اسی طرح سے کیا ہے لیکن میری کوشش رہی ہے کہ میں اپنے موضوع کے ساتھ ساتھ اپنے اسلوب کو تبدیل کرتی رہوں۔ اگر میں سکھوں کی کہانی لکھتی ہوں تو انہی کی زبان استعمال کرتی ہوں مثلاً پنجابی کے ایسے الفاظ جو عام طور پر سکھوں میں مستعمل ہیں۔ جب میں نے قرۃ العین طاہرہ کی کہانی لکھی تو میں نے فارسی ترکیبیں استعمال کیں۔ اس کے علاوہ میں سمجھتی ہوں کہ اس میں کوئی برائی نہیں ہے کہ میں نثر میں شاعری کروں۔

سوال : آپ کی تخلیقات کے بارے میں میرا ذاتی تاثر یہ ہے کہ آپ مضمون یا خیال کے مقابلے میں اسلوب کو بہت اہمیت دیتی ہیں اور اس پر محنت بھی بہت کرتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں وہ خیال یا وہ کہانی جسے آپ بیان کرنا چاہتی ہیں آرائشِ اسلوب کے بھاری بوجھ تلے دب کر رہ جاتا ہے۔ مزید یہ کہ آپ اپنے کرداروں سے زیادہ موسموں، خوشبوؤں اور رنگوں کو اہمیت دیتی ہیں۔ آخر آپ اپنی کہانیوں کو اتنا قیمتی پوشاک کیوں پہنانا چاہتی ہیں۔؟

جمیلہ ہاشمی: میرے ہاں جو رنگ، ہوائیں اور بادل ہیں۔ وہ سب کے سب میرے افسانوں کے کردار ہیں۔ وہ اس خیال کو جسے میں بیان کرنا چاہتی ہوں، آگے بڑھاتے ہیں۔ اس کو واضح کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ آپ نے میرے اسلوب کے متعلق جو کچھ کہا ہے میں اس سے اتفاق بھی کر سکتی ہوں لیکن حقیقتاً یہ اسلوب میں نے ارادتاً اختیار نہیں کیا ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ میں تو اپنے مسوّدے پر دوسری بار نگاہ بھی نہیں ڈالتی جس کی وجہ سے غلطیاں بھی رہ جاتی ہیں۔ میری تخلیقات میں آمد ہے، آورد نہیں ہے۔

سوال : یعنی جب لکھنے پر طبیعت آمادہ ہوتی ہے تو لکھتی چلی جاتی ہیں۔؟

جمیلہ ہاشمی: جی ہاں۔ میں نے کبھی پہلے سے طے کر کے نہیں لکھا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو دو تین تین سال تک قلم کو ہاتھ بھی نہیں لگاتی۔ میں ...ہِ بہ چہرہ رُو بہ رُو" لکھنے کے پانچ سال بعد صرف دو کہانیاں لکھیں۔ میرے گھر پہ ہر سال

"شبِ افسانہ" ہوتی ہے تو میں محض اس میں شرکت کے خیال سے افسانہ لکھ لیتی ہوں۔ البتہ "دشتِ سوس" کے لئے میں نے کافی تیاری کی، بہت پڑھا، پھر جاکر اسے لکھا ہے۔

سوال : آپ نے تاریخی کرداروں پر ناول لکھنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے تو کیا آپ اس کی باقاعدہ منصوبہ بندی کرتی ہیں کتابوں کا انتخاب، ان کا مطالعہ، کرداروں کی تلاش، کہانی کی بُنت۔ ان ساری تیاریوں کی کیا صورت ہوتی ہے ؟

جمیلہ ہاشمی : دیکھئے! جیسے حسین بن منصور حلاّج کا کردار میرے ذہن میں آیا اور میں نے اسے ناول کا موضوع بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی حسین بن منصور حلاّج کے متعلق میرے ذہن میں کئی سوالات اُبھرے۔ مثلاً وہ کون سے عوامل تھے جس نے اُسے دار تک پہنچایا ؟ اور وہ کیا چیز تھی جس کے پیشِ نظر وہ ہنستا کھیلتا اس منزل تک پہنچ گیا ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے کے لئے مجھے اس کے دَور تک کا سفر کرنا پڑا۔ میں نے حسین بن منصور حلاّج کے فلسفے کا اور اس دور کے علمائے کرام کے فلسفے کا مطالعہ کیا اور پھر اس تصادم اور ٹکراؤ پر غور کیا جس کے نتیجے میں منصور کی موت واقع ہوئی اور یوں میرے ناول کا خاکہ تیار ہوا جسے میں نے قلمبند کیا۔

سوال : تاریخی اعتبار سے حسین بن منصور حلاج کی شخصیت نہ صرف متنازعہ بلکہ تاریخ کے ایک عام طالب علم کو کنفیوز کر دینے والی ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ اور حضرت سید علی بن عثمان ہجویریؒ جیسے عظیم صوفیائے کرام منصور حلاج کی تعریف میں رطب اللسان ہیں تو دوسری طرف سید سلیمان ندوی جیسے مستند مؤرخ اور مولانا ظفر علی خاں جیسے راسخ العقیدہ مسلمان ہیں جو تاریخی شواہد کی بنا پر حسین بن منصور کے متعلق نہایت منفی رائے رکھتے ہیں اور اسے سیاسی مجرم تصوّر کرتے ہیں۔ کیا آپ بتانا پسند کریں گی کہ ایک متنازعہ تاریخی شخصیت کو آپ نے اپنے ناول کا موضوع کیوں بنایا ؟

جمیلہ ہاشمی : اگر لوگوں کو حسین بن منصور حلاّج کے متعلق رائے رکھنے کا حق ہے تو کیا مجھے نہیں ہے ؟ کیا مجھے اسے سمجھنے کا حق نہیں تھا ؟

سوال : لیکن اپنے ناول میں اس کی شخصیت کا ایک رُخ دکھا کر آپ نے تاریخ کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ آپ پر اُن نقطہ ہائے نظر کی بھی نمائندگی واجب تھی جو حسین بن منصور کے خلاف جاتے ہیں۔ کیوں ؟

جمیلہ ہاشمی : میں نے منصور کی "کتاب الطواسین" پڑھی ہے اور بار بار پڑھی ہے۔ یہاں تک کہ وہ مجھے اَزبر ہوگئی ہے اور مجھے اس میں کوئی ایسی "باطنیت" نظر نہیں آئی ہے۔ جن لوگوں کو اس سے اختلاف ہے وہ یقیناً شریعت کے نقطۂ نظر سے ہوگا۔

سوال : صرف یہی نہیں بلکہ تاریخی شواہد کی بنا پر بھی مؤرخین اُسے شعبدہ باز اور گمراہ کن عقیدہ کا مالک قرار دیتے ہیں۔

جمیلہ ہاشمی : بات سنئے! میں تاریخ کی کتاب تو نہیں لکھ رہی تھی۔ اگر سیّد سلیمان ندوی کو حسین بن منصور حلاج پر لکھنے کا حق تھا تو مجھے بھی اختیار تھا کہ میں اپنے طور پر اس کی سوانح حیات لکھوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ تاریخی کردار ہے اور اس

ناول کی شکل میں میری جسارت اگر ناقابلِ معافی ہے تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ میں نے حسین بن منصور حلاج کو اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کی ہے جنھیں "دشتِ سوس" سے اتفاق نہیں ہے وہ بیشک اس سے اختلاف کرنے میں آزاد ہیں۔

سوال : "دشتِ سوس" سے نہیں، حسین بن منصور حلاج سے اختلاف ہے۔؟

جمیلہ ہاشمی : حسین بن منصور حلاج میرے بچپن کا ہمسفر ہے۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے۔ جب میں چھوٹی سی تھی اور اکثر چاندنی راتوں میں چھت پر لیٹی چاند کو تک رہی ہوتی تھی تو پڑوس سے ایک ریکارڈ کے بجنے کی آواز فضا کو ساکت و جامد کر دیتی تھی۔ یہ ایک پنجابی گیت تھا :

ع سولی چڑھ منصور پکارے

پتہ نہیں کیا کیا باتیں بھول جاتی ہیں اور کیا کیا یاد رہ جاتی ہیں۔

سوال : بعض تاریخی کردار تخلیقی ادب کا موضوع بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن کہا جاتا ہے کہ اس میں ایک پیچیدگی یہ ہوتی ہے کہ واقعات کا ریکارڈ پہلے سے موجود ہوتا ہے جس کی وجہ سے تخیل کی مدد سے اس کی بازیافت مشکل ہو جاتی ہے واقعات رکاوٹ بن جاتے ہیں کیونکہ لکھنے والا اس کے حصار سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اس لحاظ سے یہ بڑا چیلنج ہے جو ناول نگار کو درپیش ہوتا ہے۔ آپ نے اس چیلنج کا مقابلہ کس طرح کیا؟ اور کیا ناول شروع کرنے سے پہلے آپ کو ان مشکلات کا احساس تھا۔؟

جمیلہ ہاشمی : میں نے "دشتِ سوس" لکھتے وقت مولانا اشرف علی تھانوی کی تصنیف کردہ سیرت حسین بن منصور حلاج کو سامنے رکھا ہے اور کوشش کی ہے کہ تاریخ کے قدم بہ قدم چلوں۔ اس کی زندگی میں جتنے نشیب و فراز آئے تھے۔ میں نے ان سب کا احاطہ کیا ہے۔ میں نے تاریخ کو رد نہیں کیا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں نے حسین بن منصور حلاج کو اپنے طور پر پہچانا ہے۔ "چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو" میں بھی میں نے اسی طریقۂ کار کو اختیار کیا۔

سوال : ایک نقاد کا اعتراض ہے کہ آپ نے "چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو" میں قرۃ العین طاہرہ کی تصویر ایک گھریلو عورت کے طور پر پینٹ کی ہے جو آپ کی لاشعوری الجھنوں کا نتیجہ ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے ؟

جمیلہ ہاشمی : عورت جب ایک آدمی کی بہو، ایک کی بیوی اور ایک بچے کی ماں بنتی ہے تو کیا وہ گھریلو عورت نہیں ہو گی۔ آج کے عہد میں اور قرۃ العین طاہرہ کے عہد میں فرق ہے۔ طاہرہ عہدِ حاضر کی جدید عورت تو تھی نہیں کہ رات کو کلب جاتی، وہاں رقص کرتی اور گھر آ کر سو جاتی۔ اس نے جو بھی فیصلہ کیا ہو گا۔ ایک گھریلو عورت کے طور پر کیا ہو گا۔ وہ ایک شدید احساس کی عورت تھی جو آج کی عورتوں میں ناپید ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں جو کچھ چھوڑا وہ کس کے بس کی بات ہے۔ تھک ہار کر پھولن دیوی بھی ہتھیار ڈال دیتی ہے لیکن قرۃ العین طاہرہ نے ہتھیار نہیں ڈالا۔ وہ بہت عظیم عورت تھی اور اگر وہ گھریلو عورت تھی تو اس میں برائی کیا ہے؟

سوال : آپ نے قرۃ العین طاہرہ پر لکھتے وقت کلارا ایچ اور مارتھا روٹ کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہوگا۔ آپ نے کلارا ایچ کے ناول "طاہرہ" کو کیسا پایا ؟

جمیلہ ہاشمی : جی نہیں، میں نے اِن کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا البتہ جن لوگوں نے کلارا ایچ کا ناول پڑھا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ میرا ناول اس سے کہیں بہتر ہے۔ میں نے قرۃ العین طاہرہ کی زندگی کے حالات کا مطالعہ مذہبی کتابوں سے کیا ہے اور اس سلسلے میں، میں نے کسی انگریزی کتاب سے استفادہ نہیں کیا۔

سوال : ایک تاریخی کردار کو آپ تخلیقی کردار کے قالب میں کس طرح ڈھالتی ہیں۔ ؟

جمیلہ ہاشمی : جب ادیب کسی کردار کے ساتھ انصاف کرنا چاہتا ہے تو وہ کردار وہ خود بن جاتا ہے۔ پھر فنکار کا اپنا تو کوئی وجود ہوتا ہی نہیں ہے۔ فنکار ہر شے میں رہتا ہے۔ جب میں نے قرۃ العین طاہرہ پر لکھا تو میں وہ خود تھی۔ اس کے دکھ میرے دکھ اور اس کا سُکھ میرا سُکھ تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں نے اس کے ساتھ انصاف کیا ہے یا نہیں لیکن قرۃ العین طاہرہ بن کر جو کیفیت مجھ پر طاری ہوئی، میں نے اسے لکھ دیا۔ حسین بن منصور حلّاج پر جو کچھ گزری ہے، اُسے میں نے بھی سہا ہے۔ فنکار کا اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا، وہ ہر شے میں رہتا ہے۔

سوال : خدا کی طرح ؟

جمیلہ ہاشمی : فنکار بھی تخلیق کار ہے۔

سوال : کیا خدا اور فنکار میں یہ قدر مشترک ہے ؟ کیا آپ اس طرح سوچتی ہیں ؟

جمیلہ ہاشمی : پتہ نہیں یہ کتنا بڑا دعویٰ ہے لیکن خدا نے یہ بھی تو کہا ہے کہ میں نے ہر شے میں اپنا جلوہ رکھا ہے۔

سوال : ایک خاتون قلمکار کی حیثیت سے آپ کو خواتین کے حقوق کی پامالی کا احساس شدت سے ستاتا ہے..... !

جمیلہ ہاشمی : (بات کاٹ کر) یہ نکتہ آپ نے کہاں سے تلاش کیا ؟

سوال : آپ کے ناول "تلاشِ بہاراں" سے۔

جمیلہ ہاشمی : ہاں ایک زمانہ تھا، سخت رومانوی زمانہ۔ یہ ناول میں نے قلم بَرداشتہ لکھا تھا۔ دوسری نظر ڈالنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ اس میں بہت سی غلطیاں بھی رہ گئی ہیں۔ پبلشر صاحب کے پاس پانچ سال تک اس کا مسوّدہ پڑا رہا اور جب "آتشِ رفتہ" چھَپ گئی۔ تب انھوں نے اِسے چھاپا۔

سوال : "تلاشِ بہاراں" اس اعتبار سے قابلِ ذکر ناول ہے کہ اسے اُس وقت آدمجی ایوارڈ ملا۔ جب اس ایوارڈ کا اعتبار قائم تھا اور ممتاز مفتی کا ناول "علی پور کا ایلی" کو نظر انداز کر کے اس ناول کو ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ حالانکہ آپ کا ناول ہندوستان کے پس منظر میں ہے اور اس کے مرکزی کردار ہندو ہیں اور آپ نے ہندو سماج میں عورتوں پر مظالم کی تصویر کشی کی ہے جبکہ کم و بیش یہی صورتحال مسلم سماج میں بھی تھی۔

جمیلہ ہاشمی : یہ ناول نہ ہندوستانی ہے نہ پاکستانی۔ یہ عورت پر ہونے والے مظالم کی خونچکاں داستاں ہے۔ عورت کے ساتھ

ہمیشہ سے یہی کچھ ہوا ہے، یہی کچھ ہو رہا ہے۔ میرے ایک شناسا جو فوج میں ملازم ہیں، ان کی بیٹی پر سسرال میں بڑے مظالم ہوتے تھے۔ ایک دن تنگ آکر وہ اپنا بچہ اٹھائے باپ کے گھر آگئی۔ باپ نے کہا: "اس گھر میں اب تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔" وہ الٹے قدموں لوٹ گئی اور سسرال پہنچ کر خودکشی کرلی۔ سو عورتوں پر مظالم تو آج بھی ہوتے ہیں۔ "تلاشِ بہاراں" کے کردار آج بھی زندہ ہیں۔ رہا سوال ہندو کرداروں کا تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مجھے ہندو کرداروں کے نام بہت فیسی نیٹ کرتے ہیں۔ میرے افسانوں کا مجموعہ "اپنا اپنا جہنم" کی ایک کہانی "زہر کا رنگ" سو فیصدی سچی ہے، اور اس کے کردار بھی میرے دیکھے بھالے ہوئے ہیں لیکن میں نے کہانی کے ہیرو کا نام گوتم اور ہیروئن کا نام مایا رکھ دیا ہے۔ لوگ اسے پڑھ کر سوچتے ہیں کہ شاید یہ ہندوستان کی کہانی ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہ کہانیاں یہیں کی ہیں۔ اسی معاشرے کی۔ باقی ہندوستان میرا ماضی ہے۔ میں وہیں پلی بڑھی ہوں۔ ان لوگوں کے ساتھ دوستیاں رہی ہیں۔ ہمارا ان کا تعلق کوئی ایک دن کا نہیں تھا اور نہ ہی وہ بھولنے والی شے ہے۔ کوئی اپنے ماضی کو چھوڑ کر کیسے آگے بڑھ سکتا ہے؟

سوال: گویا آپ کا جو تہذیبی ورثہ ہے۔ اس کا ایک سرا ہندوستان اور دوسرا سرا منصور حلاج اور قرۃ العین طاہرہ سے جا کر ملتا ہے۔؟

جمیلہ ہاشمی: جی ھاں!۔

سوال: اچھا، پاکستان میں گزشتہ تیس پینتیس برس کے عرصے میں سیاسی اور تہذیبی سطح پر جو انقلابات رونما ہوئے اور ہم کئی عظیم سانحوں سے گزرے، ہمارے خواب ادھورے رہ گئے اور ہمارے حصے میں صرف حسرتوں کی راکھ آئی۔ تو کیا بحیثیت ایک ناول نگار کے آپ کو یہ واقعات متاثر نہیں کرتے اور آپ کے دل میں کبھی اس موضوع پر ناول لکھنے کا خیال نہیں آیا؟

جمیلہ ہاشمی: مجھے سقوطِ ڈھاکہ سے زیادہ بڑا سانحہ مغلیہ حکومت کا زوال لگتا ہے۔ جس پر آج تک کسی ناول نگار نے ایک لفظ نہیں لکھا۔ میں اس موضوع پر کام کر رہی ہوں کیونکہ میرا خیال ہے کہ ہمیں ابتدا وہاں سے کرنی چاہئیے۔ جب ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کے مرنے کے بعد مغلیہ حکومت روبہ زوال ہوئی۔ مجھے بہادر شاہ ظفر کی شکست بھی کسی عزیز کی موت کی طرح تکلیف دہ محسوس ہوتی ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ کا المیہ اس عظیم المیے کی ایک شاخ ہے۔ مسلمان کب سے ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ رگیدے اور روندے جا رہے ہیں۔ ٹیپو سلطان کا سانحہ، سراج الدولہ کا سانحہ، کیا یہ سانحے اتنے چھوٹے ہیں کہ انھیں بھلا دیا جائے۔ مجھے بتائیے کہ کس ناول نگار نے ان موضوعات کو چھونے کی ہمت کی ہے؟

سوال: کہا جاتا ہے کہ زوالِ روم کو گبن نے عظمت بخشی لیکن مغلیہ عہد کو کوئی گبن نہ مل سکا جو اس کا نوحہ لکھتا، بہرکیف آپ نے اس ناول پر کام کہاں تک مکمل کر لیا ہے؟

جمیلہ ہاشمی: میں فی الحال مغلیہ عہد کی تاریخ پڑھ رہی ہوں۔ مجھے اپنے ماضی کے ساتھ انصاف کرنا ہے۔ اگر میں زندہ رہی

تو اسے ضرور لکھوں گی۔

سوال: "معاصر" میں آپ کے زیرِ تکمیل ناول "جوگ کی رات" کا ایک باب شائع ہوا تھا۔ اب یہ ناول کس مرحلے میں ہے؟

جمیلہ ہاشمی: یہ ناول ابھی زیرِ تکمیل ہے۔ یہ اُن المناک کرداروں کی کہانی ہے جو بے گھر ہو گئے ہیں۔ جن کی شناخت گم ہو چکی ہے اور جن کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہے میں اس ناول کو مکمل کر چکی ہوتی لیکن اس سے پہلے ہی مجھے منصور حلاج نے گرفتار کر لیا۔ ۱۹۷۶ء میں جب میں عمرہ کرنے گئی تھی تو میں نے اپنے قلم کو رسول پاکؐ کے روضہ کی جالی سے چھوایا تھا۔ اس کے بعد مجھ سے "دشتِ سوس" کے سوا کچھ نہیں لکھا گیا۔ یہ ناول تو یوں لگتا تھا جیسے مجھ سے پکڑ کر لکھوایا جا رہا ہو۔ میں نے اسے چھ ماہ کی قلیل مدّت میں مکمل کر لیا تھا۔ میں اسے لکھتی جاتی تھی اور کاتب کو دیتی جاتی تھی اور جیسے ہی میں نے اسے لکھ کر مکمل کیا اس کے آٹھویں دن کتابت بھی ختم ہو گئی۔

سوال: کیا آپ کے لکھنے کا کوئی خاص وقت مقرر ہے؟

جمیلہ ہاشمی: میں رات گیارہ بجے کے بعد لکھتی ہوں۔ جب میری آنکھیں تندرست تھیں تو میں زیادہ دیر تک کام کر لیتی تھی۔ مجھے فارغ بیٹھنا اچھا نہیں لگتا۔

سوال: گھریلو ذمہ داریاں لکھنے کے کام میں آڑے نہیں آتیں۔؟

جمیلہ ہاشمی: گھریلو ذمہ داریاں بھی ہیں لیکن جب کھانا پکانے، کپڑے دھونے اور گھر کی صفائی کرنے کے لئے نوکر چاکر موجود ہوں تو پھر لکھنے پڑھنے کے لئے خاصا وقت نکل آتا ہے۔ میں صرف ان کی نگرانی کرتی ہوں۔

سوال: بعض ادیبوں کے لکھنے کا معاملہ یوں ہوتا ہے جیسے موٹر اسٹارٹ کرنے کا، کہ چابی لگائی اور گاڑی چل پڑی بعض ایسے ہیں جو لکھنے کے موڈ کے پابند ہوتے ہیں۔ آپ اپنا شمار کن میں کرتی ہیں؟

جمیلہ ہاشمی: جب میں "دشتِ سوس" لکھ رہی تھی تو روزانہ دس بارہ صفحے لکھتی تھی۔ اس کے بعد رمضان کا مہینہ آگیا۔ روزے بھی رکھنے تھے، سخت گرمی تھی، اس لئے گاؤں چلی گئی تو لکھنا چھوڑ دیا۔ دو تین مہینے بالکل نہیں لکھا تو میری بیٹی نے کہا۔ "اماں! آپ کیا کرتی ہیں؟ آپ تو اپنے آپ کو دھوکا دیتی ہیں۔ آپ سارا وقت لکھا کریں۔" پھر میں نے لکھنا شروع کیا تو پندرہ دن میں سو صفحے لکھ ڈالے۔ میری زندگی سفر میں گزری ہے۔ میاں کے انتقال کے بعد سے مجھے گاؤں بھی جانا پڑتا ہے۔ بچی کو کالج پہنچانے اور لانے کی بھی ذمہ داری ہے۔ زندگی مسلسل اضطراب میں ہے۔ لیکن مجھے لکھنے کیلئے نہ کسی مخصوص لمحے کی ضرورت ہے نہ مخصوص ماحول کی۔ جب موقعہ ملتا ہے لکھنے بیٹھ جاتی ہوں۔

سوال: کن ادیبوں کو شوق سے پڑھا ہے۔ کس کس نے آپ کی تحریروں کو متاثر کیا ہے؟

جمیلہ ہاشمی: میں روسی ادب سے بے پناہ متاثر ہوں۔ میں نے انھیں پڑھا بھی بہت ہے۔ ٹالسٹائی سے لیکر چیخوف اور شولوخوف تک، ان کے ہاں کائنات کا بڑا خوبصورت تصوّر ہے۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتیں ان کے لئے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ جب میں نے افسانہ لکھنا شروع کیا تھا تو قرۃ العین حیدر سے بے حد متاثر تھی۔ ایک عرصے تک

تو انھیں پڑھ پڑھ کر اُن پر مرتی رہی اور جب قلم سنبھالا تو ایک آدھ افسانہ انہی کے رنگ میں لکھا لیکن پھر آہستہ آہستہ جب دنیا کا مختلف ادب پڑھا۔ خصوصاً انگریزی ادب۔ شیکسپیئر، بائرن، ہارڈی، موپساں۔ تو پھر ہم اپنی جون میں واپس آ گئے۔ قرۃ العین حیدر کے ہاں جو رومانویت ہے' وہ ابھی تک برقرار ہے۔ وہ معاشرے کے دُکھ کو گلیمرائز کر دیتی ہیں۔ ان کے ہاتھ میں جادو کی چھڑی ہے کہ جس چیز کو بھی چھُوتی ہیں' آفاقی سا بنا دیتی ہیں۔

سوال : کچھ اس بارے میں بھی بتائیں کہ افسانہ لکھنے کی طرف کیسے مائل ہوئیں۔ ؟

جمیلہ ہاشمی ، افسانہ صرف وہی لوگ نہیں لکھتے جنھیں افسانوی ماحول ملا ہو۔ سوائے حجاب امتیاز علی کے ایسا افسانوی ماحول کسے ملا ہے جس میں ہرے طوطے، السیشن کتے، سیانی بلیاں اور سادہ دِل کبوتروں کی بہتات ہو۔ افسانہ کیا ہے؟ جو پلکوں میں نہاں ہے چشمِ بینا دیکھ لیتی ہے یا بادلوں سے پرے کیا ہے؟ اپنی ہی کہانی ہے۔ میں نے ایک قطعی غیر افسانوی اور غیر رومانی ماحول میں پرورش پائی۔ جہاں معمولی معمولی غلطیوں پر خوب پٹائی ہوتی تھی۔ لیکن میرے اندر افسانہ موجود تھا جس کی مثال یہ ہے کہ اسکول میں مجھے اگر مضمون لکھنے کیلئے کہا جاتا تو میں اس عنوان پر کہانی لکھ دیا کرتی تھی۔ استانی جی نے کئی بار ڈانٹا کہ گھوڑے پر مضمون لکھنے کو کہا اور ہم نے گھوڑے پر کہانی لکھ ڈالی۔ میں ڈانٹ سنتی گئی اور لکھتی گئی اور وہ جو میرے اندر ایک بیج تھا وہ پھلنے پھولنے سے پیڑ بن گیا۔
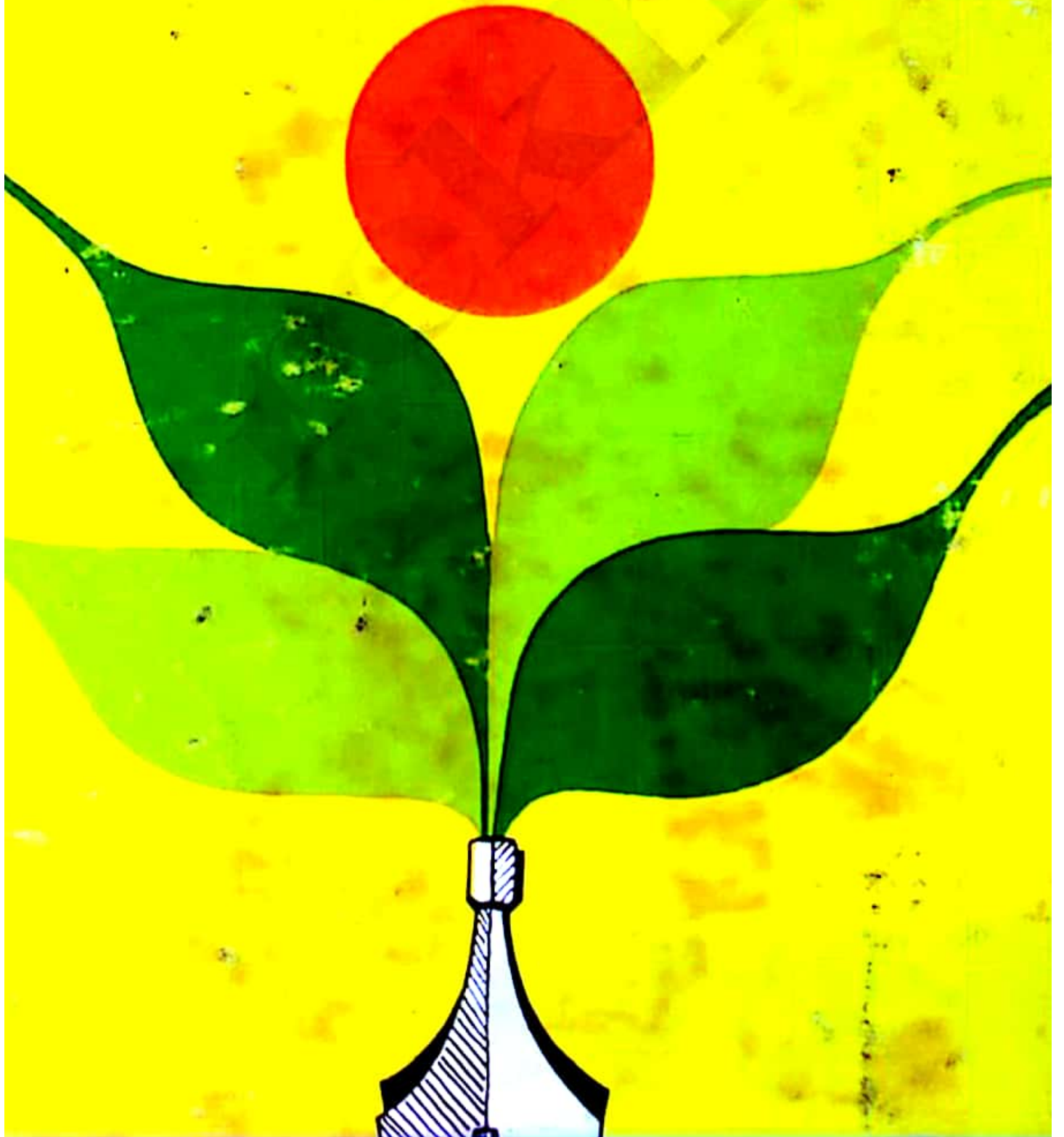
پاکستانی ادب

سرسیدین

پاکستانی ادب

(چار جلدوں میں)

دوسری جلد

ترتیب و انتخاب

رشید امجد

فاروق علی

سرپرستِ سیدین

پاکستانی ادب

مجلسِ ادارت

ملازم حسین ہمدانی
(چیف ایڈیٹر)

رشید امجد
فاروق علی

مجلسِ مشاورت

سید ضمیر جعفری
ڈاکٹر وزیر آغا
فتح محمد ملک
کرنل غلام سرور
ڈاکٹر خالد سعید بٹ
جمیل ملک

فیڈرل گورنمنٹ سر سید کالج راولپنڈی

مجلہ : سرسیدین - پاکستانی ادب
ترتیب و انتخاب : رشید امجد - فاروق علی
ناشر : فیڈرل گورنمنٹ سر سید کالج راولپنڈی
طبع : اوّل، جولائی ۱۹۸۱ء
مطبع : ایس - ٹی - پرنٹرز دریا آباد راولپنڈی
کتابت : اعجاز کھوکھر
تعداد : گیارہ سو
قیمت : پچاسی روپے

اشتراک :
آرمی ایجوکیشن پریس، جی - ایچ - کیو
پوسٹ بکس نمبر ۱۷۹، راولپنڈی

پاکستانی نثری ادب

انتخاب

۱۹۴۷ء ——— ۱۹۸۰ء

ترتیب

(حروفِ تہجی کی ترتیب سے)

سفر نامہ

طنز و مزاح

افسانہ

ا

ب

ج

انشائیہ

خاکے

چراغِ لالہ

جمیلہ ھاشمی

افندی کا خط زمانوں کے بعد آیا تھا وہ امریکہ میں کسی جگہ تھا اور واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

تم اب میری طرف سے ناامید ہو جاؤ کہ میں واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ جب تک میں تمہارے پاس تھا کسی نہ کسی طور پریشان رہتا تھا۔ میری تعلیم ڈگریاں بھلا کس کام کی تھیں، ہمیشہ جونیئر سینئر کا جھگڑا۔ ہندوستانی پاکستانی کا جھگڑا شمالی جنوبی کا کھکیڑا۔ تعلقات اور رسائی کا مقابلہ اور چھپے ہوئے ذرائع کا استعمال کرنے کی اہلیت اور نااہلی۔ آپ باہر کیا کر سکتے ہیں اور اندر کیا کر سکتے ہیں۔ یہ دوہری زندگی بسر کرنے کی ہمت کبھی انسان میں ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی۔ گو رہنے سہنے کے انداز چند برسوں میں بہت بدل گئے ہیں اور مگر ہر کام پر نئے اور پرانے کی ٹکر ہوتی رہتی ہے۔ آدمی کی ساری طاقت اس میں صرف ہو جاتی ہے کہ اپنے حقوق کی حفاظت کس طرح سے کرے اور زندگی کس طرح سے بسر کرے۔ میرا خیال ہے تم بھی میرے اس فیصلے کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھو گے۔ میں یہاں جس ادارے میں کام کرتا ہوں اس نے میری تنخواہ میں تقریباً پچاس فیصد اضافہ کر دیا ہے اور یہ بہت بڑی ترقی ہے۔ تم کو معلوم ہو کہ تم بھی کسی نہ کسی طور ایسے آدمی ہو جس کی ضرورت ہے اور جس کے بنا گزارہ نہیں ہو سکتا تو یہ اہمیت آدمی کے کام کرنے کی صلاحیت کو بے پناہ جلا بخشتی ہے (میں تم کو یہ سب یوں لکھ رہا ہوں گویا تم کوئی غیر ہو اور یہ سب باتیں جانتے نہیں ہو)

مریم کا کیا حال ہے؟

جانے مجھے کیوں اکثر یوں محسوس ہوا ہے کہ مریم میں عجیب و غریب صلاحیتیں ہیں اور وہ تمہارے باقی بچوں سے مختلف ہے، پتہ نہیں میں نے ایسا کیوں سوچا تھا؟ ہو سکتا ہے میرے یہ خیالات اس کے لئے اس لئے ہوں کہ تم بھی اسے سب سے زیادہ چاہتے ہو اور اس پر فخر کرتے ہوئے لگتے ہو سو اولاد میں انسان اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈتا ہے اور خاص طور پر مشرق میں جیسے درخت کی شاخیں ہوں۔ پھول کا پھل بنے اور پھل کی مٹھاس آدمی اپنے اندر اترتی

محسوس کرنا چاہیے۔ اصل میں زندگی کے ساتھ مشرقی وابستگی کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ہوتی ہے؟

تم کہو گے یہ میری غیر جذباتیت ہے میں ابھی تک کنوارا ہوں میں نے ان سارے جذبوں کو محسوس نہیں کیا؛ ٹھیک ہے مگر آخر اس میں رکھا کیا ہے؟ ایک گھر اور اس کے اندر تمہارا انتظار کرتی بیوی جس کی آدھی سے زیادہ زندگی انتظار میں گزر جاتی ہے؛ میں آزادی کا قائل ہوں۔!

تم نے اپنے پچھلے خط میں لکھا میں شاید اب اس آب و ہوا میں رس بس گیا ہوں۔ آپ چاہیں تو یہاں سب کچھ ہے اور چاہیں تو کچھ بھی نہیں۔

بیگم مدحت حسین آج کل یہاں آئی ہوئی ہیں اور ان کی نہایت مہربانی ہے کہ انہوں نے مجھے پہچان لیا کیونکہ تم حیران ہو گے کہ وہ وائٹ ہاؤس کے خاص الخاص مہمانوں میں شمار کی جاتی ہیں اور کسی والیٔ ریاست سے کم ان کی دیکھ بھال نہیں ہوتی۔ نوجوان خواتین کا ایک اچھا خاصا گروہ ان کے ہمراہ ہے۔ میں نے کسی تقریب کی تصویریں اخبار میں دیکھی تھیں اور وہاں سے پتہ معلوم کر کے ان سے ملنے گیا تھا۔ اتفاق کہہ لیجئے یہ بھی، بہت محبت سے ملیں۔ یہاں ان کے طور طریقے اور رنگ ڈھنگ ہیں۔ نہایت ذہین، بہت تیز اور بڑی تیز لڑکیاں ہیں جو یہاں ان کی ساتھی ہیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے پہلی بار لگا کر ہماری خواتین کسی طور بھی امریکی عورتوں سے کم نہیں ہیں۔ نادیہ رحمان کو تو جانتے ہو نا جس نے کلاسیکل ڈانس میں نام پیدا کیا تھا اور جس کے شوہر نے محض اس کے اس شوق سے چڑ کر اسے طلاق دیدی تھی۔ اور عطیہ فنیفی جو فیشن ماڈل تھی پھر کسی نواب کی منکوحہ تھی پھر اس نے کسی بڑے فوجی کو پھانسا تھا۔ تیسری بار کسی آرٹسٹ کی بیوی بنی تھی۔ یار یہ سب باتیں ایک طرف مگر تمہیں یہ ماننا پڑے گا کہ اس میں کوئی کشش ہے سہی بے نام نامعلوم جو عجیب طرح بے چین کرتی ہے اپنے دیس کی بات تو الگ تھی مگر یہاں امریکی مرد اس کے دیوانے لگتے ہیں۔ میں نے بہت دنوں یہ تجزیہ کرنے کی کوشش کی کہ یہ ساری کشش کہاں سے آتی ہے اور آخر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس کا باتیں کرنے کا انداز آدمی کو ہتھیار پھینکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ بڑی بڑی آنکھوں کی بے بسی تم محسوس کر دو تو جی چاہتا ہے اپنے سارے ذرائع لگا کر ان کی بے بسی کو سکھ میں تبدیل کیا جائے۔ اس کمزور اور لاغر سے بازو کو تھام کر اسے تسلی دی جائے۔ (مگر یہ مت سمجھنے لگنا کہ میں اس بازو کو تھام لوں گا۔ اس لئے کہ ملکی اور غیر ملکی سب اس کی ان اداؤں پہ فدا ہیں)

ابھی ابھی بیگم مدحت حسین کے گروہ میں کی ایک فرد ہے دیوانی، جوشیلی، پُرعزم اور اپنے علم سے بخوبی آگاہ۔ تم تو اسے بہت اچھی طرح جانتے ہو! وہ ہر کسی سے اپنا کام نکلوانا خوب جانتی ہے۔ ارے بھئی عاصم والا قصہ اب تو کم از کم تمہیں یاد آ ہی گیا ہو گا۔ محفلوں میں پی کر بڑی بڑی گھمبیر باتیں کرتی ہے۔ اسے اپنے لمبے ریشمی بالوں پہ بہت ناز ہے گھٹنوں

تک پہنچتے بالوں کو ہاتھ سے سہلاتی وہ سب بڑے بڑے لوگوں کا اپنے عشق میں مبتلا ہونے کا اکثر ذکر کرتی ہے سگریٹ پیتی دھوئیں کے چھلے بناتی وہ بڑی بے نیاز ہے اپنے لباس کی طرف سے، بے پرواہ جنس کا ذکر اکثر کرتی ہے میں نے ایک بار کہا تھا: "اگر آپ جنس سے اتنی کراہت محسوس کرتی ہیں تو مت ذکر کیجئے اس کا۔"

"کیا کہا آپ نے وہ جیسے سوتے میں سے اٹھ کر بیٹھ گئی ہو۔ میں جنس کا ذکر کرتی ہوں میں جو مجسم جنس کے خلاف ہوں۔ مرد عورتوں میں کیا ڈھونڈتے ہیں مجھے سمجھ نہیں آتی۔ عورتیں مردوں میں کیا تلاش کرتی ہیں مجھے پتہ نہیں چلتا میں تو زندگی کو کسی اور ہی زاویئے سے دیکھتی ہوں آفندی صاحب" اور مجھے جان چھڑانی مشکل ہو گئی۔

پھر وہ شاعرہ ہے جچی دبی جو مشاعروں میں ایک ادا سے غزل پڑھتی تھی، بہکی ہوئی نگاہیں اور باہوش ادائیں یہاں مردوں کا ایک پورا حرم ہے ان کا سبھی طرح کے لوگ جوان کی شاعری کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور انہیں بھی کچھ ایسے لوگ بھی جو شاعری کو بکواس سمجھتے ہیں مگر انہیں بہر حال کام کی چیز جانتے ہیں قدر کرتے ہیں حاضر رہتے ہیں کبھی آہیں بھرتے ہیں اور خود بھی شاعر بنے پھرتے ہیں۔ ایک دن یہاں کا ایک دوست میرے پاس آیا: مجھے کہیں سے نئے پرانے شاعروں کے شعر چرا کر ایک غزل بنا دو جو نئی بھی لگے، خیالات کے اعتبار سے پرانی روایت میں ہو۔ تاہیں تم جانو یہاں کس کے پاس ہوتی ہیں اور شعر تو مجھے کبھی یاد نہ ہوئے مگر میں نے ایک بڈھے۔ یہاں کے بہت پرانے رہنے والے سے ایک کتاب ڈھونڈھ نکالی۔ اور اچھی خاصی غزل ترتیب دے دی۔ رفتہ رفتہ مجھے اپنی صلاحیتوں پر خود ہی حیرت ہونے لگی ہے۔ میں تو شعر چرا کر خیالات سامنے رکھ کر اگر شعر بنانے لگوں تو سکوں کی طرح میرا خزانہ کبھی خالی نہ ہو وہ صاحب غزل پڑھ کر بہت محظوظ ہوئے ان کا کام بہت بن گیا اور جہاں وہ صاحبہ جاتیں انہیں بھی ساتھ بلا ہوتا دو ایک بار تو اس کام کو کھیل سمجھ کر میں نے کر دیا مگر آخر تا کجے۔ اب وہ دوست خود ہی جوڑ توڑ اور گھڑنے سنوارنے میں لگے رہتے ہیں۔ کیا پتہ کسی دن پورے شاعر ہی بن جائیں۔ کبھی کبھار یوں بھی ہوتا ہے کہ آدمی بس یونہی کھیل سمجھ کر ایک کام شروع کرتا ہے جو اس کا پیشہ ٹھہرتا ہے۔

شاعری جو جزو پیغمبری ہے اس کی بات تو الگ ہے مگر جس شاعری سے نہ کسی کو جگانا مقصود ہو اور نہ سلانا وہ تو میرے خیال میں آسان ہونی چاہیئے۔ اپنے سامنے سب کچھ ہے رنگ اور نور، جلوے خوبصورتیاں سب کچھ۔ مگر اس تصویر کے پیچھے کیا ہے یہ جاننے کا کام جوکھم کا ہے۔ کبھی کبھار میں سوچا کرتا ہوں الاول کے گیتوں میں اتنا سوز کیوں ہوتا ہے اتنی تڑپ جلنے کی ایک کیفیت۔ تب آدمی اندر سے آسودہ حال ہو گا اسے جلنے کی کیا خبر ہو گی۔ مگر شاید میں ذرا پیا تا ہوں میرے سامنے اندر کا مسئلہ بھی ہے۔ دوسرے پڑھنے والے تک اسے پہنچانے سمجھانے کا سوال بھی ہے۔ مگر نئی شاعری نئی

زندگی اس کے تقاضے اتنے محدود ہیں۔ جب شاعرہ غزل پڑھتی ہے۔ سماں جھومنے کا ہوتا ہے۔ فضا پر ایک کیف کی سی حالت ہوتی ہے اور ہر آدمی سوچتا ہے۔ یہ سب کیا تھا مگر یہاں کے ساتھ یہ بات کوئی خاص نہیں۔ اور پھر میں تو بیگم مدحت حسین کا احسان مند ہوں اس فضا میں وہ قوس قزح کے سارے رنگوں کے ساتھ وارد ہوئی ہیں! ابھی ان کا ارادہ یہاں قیام کا ہے۔

کس قدر شاہانہ ٹھاٹھ سے وہ رہتی ہیں۔ یہاں کے سب سے مہنگے علاقے میں ان کا قیام ہے۔ نینی بھی ان کے ساتھ ہے۔

تم شاید اسے نہیں جانتے روشن آنکھیں جو بھوری ہیں اور رنگ گندمی جیسے سنہری فصلوں کا ہوتا ہے ویسی ہی چمک جیسے ہوا کے چلنے پر کھیتوں کے اوپر ڈولتی ہے ہوٹل کی سیڑھیوں پر ایک سے دوسرے کمرے میں لپک جھپک جاتے ہوئے وہ یوں گنگناتی ہے جیسے ہوا اپنے سریلے بے لفظوں کے گیت گاتی ہو۔ ایک عمدہ تراش کا کسی باریک کپڑے کا لبادہ سا پہنے رہتی ہے جس کے پھول اس کے رخساروں کے ہم رنگ ہوتے ہیں۔ بیگم مدحت حسین کہتی ہیں میں نے اسے بیٹی بنایا ہے مگر بیٹیوں بہنوں کے اس جمگھٹے میں وہ خود سب سے زیادہ جوان اور زندہ دل لگتی ہے تمہیں یاد ہوگا آج سے دس پندرہ سال پہلے ایک تصویر بکا کرتی تھی جس میں ایک بجرہ ہوتا تھا جس میں نہایت حسین عورت لیٹی ہوئی۔ اس کے برابر میں قریب قریب نیچے پانی میں تیرتی ہوئی جل پریاں جو کم عمر اور الھڑ لگتی ہیں وہ بھی حسین ہوتی ہیں مگر لیٹی ہوئی پری کا حسن جیسے چودھویں کا چاند ہو مکمل اور گدرایا ہوا۔ جیسے شباب کے آخر میں۔ جیسے سیب پک جائے تو اس پر چمک ہوتی ہے۔ پکار پکار کر اپنے مکمل ہونے کا اعلان کرتی ہوئی۔ بیگم مدحت کو وہ سارے زاویئے آزمانے کے طریقے آتے ہیں۔ جہاں سے کوئی تیر خطا نہیں ہوتا۔ اور شکاری شکار کو زد پر لا کر مارتا ہے۔ پھر وہ کنجوس نہیں ہے بڑی شاہ دلی سے خیرات بانٹتی ہے لینے والے کو تہی دامنی کی شکایت ہو تو ہو۔

اور یہ سارا بہار کا موسم ہم کو اب لئے وہ آج کل یہاں آئی ہیں کہتی ہیں "کلچرل ڈیلی گیشن کے ہمراہ ہوں۔ بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا چاہو تو دھو لو کوئی کام کروانا ہو کسی جگہ بہتر نوکری کی ضرورت ہو غرضیکہ ایسے سارے کام جو رکے ہوئے ہوں تم بلا کھٹکے مجھ سے کہہ سکتے ہو میں تمہاری بہی خواہ ہوں۔" بھلا میں ان سے کیا کہوں مہربانی کا شکریہ۔ بلکہ میں ان کے کام آنا چاہتا ہوں خدمت کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ میں عطیہ فیضی کی آنکھوں کی بے لسبی کم کرنے میں ان کی مدد کر دوں۔

تم سے اور بہت سی باتیں پوچھنے کو جی چاہتا ہے مگر میں یہاں پر ایک بھگتی کیرتن کی جماعت بلا ناغہ دیکھنے جاتا ہوں مشرق اور مغرب کی سب کھڑکیاں کھلی رکھ کر میں اس ہوا کو محسوس کرنا چاہتا ہوں اور ساتھ ہی ان کی اور اپنی طاقت بھی آزمانا

چاہتا ہوں۔

تمہیں معلوم ہے سرکاری مذہب کسی کو وہ آسودگی اور راحت نہیں بخشتا نا! اور پھر یہاں کے اکثر لوگ دہریئے ہیں، ناستک وہ خدا کو مانتے ہی نہیں۔ خدا کو نہ ماننے میں وہ کہتے ہیں ایک راحت ہے۔ بوجھ اتر جاتا ہے جب آدمی یہ سوچے کہ تمہارے ہر قول و فعل کا محاسبہ کیا جائے گا۔ تمہیں جواب دہی کرنا پڑے گی تو وہ سوچتا ہے آخر کیوں؟ وہ اپنے آپ کو آزاد محسوس کرنے کے لئے سب سے پہلے خدا سے باغی ہونا پسند کرتا ہے۔ یہ سارا معاشرہ باغی ہے اور اس سرزمین پر کسے ضرورت ہے کہ اپنی طاقتیں آزمائے اس لئے بھگتی کیرتن سے گلنے ناچنے سے شانتی حاصل کرنے کو لوگ جمع ہوتے ہیں۔

اچھا لگتا ہے لوگ ہاتھ جوڑے آنکھیں بند کئے دُعا مانگ رہے ہیں۔ آپ کے اندر کیا ہے اس سے کسی کو غرض نہیں۔

دعا کرنے کے بعد اگر آپ جیب کترے ہیں تو بھی وہی سکون محسوس کریں گے جو احکام صادر کرنے والا با اثر آدمی۔ اس تن آسانی کے زمانے میں ان کی ساری ضرورتیں اسی قسم کا مذہب پوری کر سکتا ہے۔ ہمارے ہاں کڑی ریاضت ہے مجاہدہ ہے پوری زندگی ایک ایک لمحہ تم اس طرح گزارو کہ تمہیں اس کے سامنے جوابدہ ہونا ہے۔ لوگ اپنے خدا کو الماری میں بند کر کے رکھنا چاہتے ہیں۔ ستاروں پر کمندیں ڈالنے والے جس طرح ہر شے زیرنگیں کرنے کے درپے ہیں اسی طرح انہوں نے خدا اور اس کے ساتھ اپنے تعلق کو نہایت بالکل ذاتی مسئلہ بنایا ہے۔

خدا کے ساتھ آدمی کا تعلق اس کا ذاتی مسئلہ ہے یا نہیں سارے مذہب اس کو حل کرنا چاہتے ہیں کوئی اپنے طور پر کوئی کیرتن کی محفلوں میں شریک ہو کر کوئی فری مین بن کر کوئی دہریہ بن کر۔

آدمی پتہ نہیں کیا تلاش کرتا ہے؟

میں تو تم سے یہی سوال کرنے چل پڑا۔ جیسے جیسے آدمی کا فہم و ادراک منجھتا اور مستقل ہوتا ہے وہ پوچھتا ہے ہر ایک شے کا آسان حل چاہتا ہے اُسے کڑی ریاضت اور محنت کی ایک خاص طرز پسند نہیں آتی جیسے کوئی چیل آسمان کے نیچے اڑتے اڑتے یکایک ساتوں آسمانوں کے کل راز جاننا چاہے یا کوئی پتنگا شمع کی حقیقت سے واقف ہونے کی کوشش کرے۔ اور پھر چیل گھبرا کر آسمان کے ہونے نہ ہونے پر ہی بحث شروع کر دے اور پتنگا شمع سے انکار کر دے۔ یہ سارا معاشرہ یہاں وہاں سستی جنت کی تلاش میں ہے۔ وہ حشیش کھا کر مدہوش ہونا اور بھگتی کیرتن سن کر اپنا آپ بھولنا چاہتے ہیں اور بس میں جو بھگتی کیرتن میں جاتا ہوں پتہ نہیں میری مزاج کی حس کو کیسے تسکین ملتی ہے مگر میں کونسا ایسا مذہبی آدمی ہوں! ہم نے مذہب بیچا ہے جانے کیا کیا کچھ اس نیلام پر چڑھا ہے؟

اور اس کے باوجود انسانیت ہمیشہ مذہب کے نام پر اپنا آپ نچھاور کرتی آئی ہے ابھی۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی ہے میں ذرا سن لوں ۔

کتنی حیران کن بات ہے فون عطیہ فیضی کا ہے اس نے مجھ سے کہا ہے کہ اگر شام فارغ ہوں تو بیگم مدحت حسین کے ساتھ کھانا کھاؤں۔ اس دور افتادہ ملک میں آشنا اپنا پن۔ حالانکہ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ میں وطن واپس نہیں آؤں گا پھر بھی جی چاہتا ہے نا ہماری بھی کوئی پہچان ہو۔ ہم گم نہ ہوں۔ ہماری کوئی عزت ہو ہمیں بھی چاہا جائے۔ ہاں سچ مچ اب جبکہ میں یہ خط ختم کر رہا ہوں۔ جی چاہتا ہے کوئی ہمیں بھی چاہتا کوئی ہمارے لئے پریشان ہوتا۔ اگر خواہش گھوڑے ہوتیں تو!

اچھا خدا حافظ بھائی سے سلام کہنا بچوں کو دعا اور جھاگ اڑاتی لہروں والے سمندر کو ان فضاؤں کو اور ہواؤں کو میرا آداب کہنا ۔

ٹیلیفون نمبر
۵۳۵۲۵

رجسٹرڈ ایل نمبر
۵۳۱۲

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

افسانہ نمبر

۱۱۹
ستمبر ۱۹۷۴ء

مُدیر:
محمد طفیل

اِدارۂ فروغِ اُردو، لاہور

قیمت: ۱۵ روپے

ترتیب

فن اور فنکار

اِنتظاریہ

تبصرے

محمد طفیل پرنٹر و پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغِ اُردو ایبک روڈ لاہور سے شائع کیا۔

آہوئے آوارہ

جمیلہ ہاشمی

اجنبی شہر میں سردی یونہی لکیپا دیتی ہے اور پھر اُس دن تو صبح سے ہی ٹھنڈی ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی ہڈیوں میں گودے تک کو جما دینے والے بادل غول در غول عصابرداروں کی طرح سورج کے آگے پیچھے گھوم رہے تھے پھر دھوؤں کی سی سیاہ گھٹائیں اُمنڈ کر آئیں یورش کرنے کے لئے اکٹھا ہونے کے لئے تیار کھڑی ہوئیں۔ میں یہاں تبدیل ہو کر آیا تھا ایک بالکل نئے محکمے کے سربراہ کی حیثیت سے جس کا اپنا دفتر تک ڈھنگ کا نہ تھا رہائش کا بندوبست ایک ہوٹل میں تھا جہاں سیاحوں کی آمد و رفت رہتی تھی ابھی کام بھی کچھ زیادہ نہیں تھا اور میری شامیں ناواقف ہونے کی وجہ سے تقریباً خالی ہوتیں۔ کبھی کبھار کلب جانے سے اور بھی بوریت ہوتی اس لئے کہ یہاں میرے کوئی دوست نہ تھے میں شراب نہیں پیتا سگریٹ کا شوقین نہیں اور تاش بھی بس واجبی ہی کھیل سکتا ہوں۔

جس شام کا میں ذکر کرنے جا رہا ہوں اس روز میں نے پکچر دیکھی تھی اُس میں بھی خوشی کی کوئی کرن تک نہ تھی عجیب دل کو اداس کرنے والی غم سے بھری کہانی تھی لگتا تھا سارے عناصر اکٹھا ہو کر آدمی کے خلاف لگے ہیں۔ زندگی کے ناپید کنار سمندر میں محبت کے پل کی ایک بوند بھی نہیں ذرا سی خواہش بھی پوری نہیں ہوتی یہ سیاہ المیہ تھا رگوں میں خون کو پانی کرنے والے غم کی داستان۔ جی چاہا انٹرول میں اُٹھ جاؤں پھر سوچا ہو سکتا ہے کرداروں کو تھوڑا سا امن مل سکے کہیں سے ذرا سی کرن ان بادلوں کے گھیرے کو توڑے اُمید اور خلوص سے یہ سیاہی دور ہو۔ مگر وقفے کے بعد بھی وہی افسوس ناک فضا رہی بلکہ ہیروئن کو تو حالات کی خرابی نے ناچ کر روزی روٹی کمانے پر مجبور کر دیا لگا دل میں سے کوئی سارا خون نچوڑ رہا ہے۔ اُسے مسل رہا ہے۔ میں نے اپنے سے عہد کیا آئندہ ایسی فلم نہیں دیکھوں گا۔ بھلا یوں بھی کبھی ہوا ہے خدا کی بنائی اس دنیا میں انسان کے لئے صرف گھٹتے رہنا اور زمانے کی چکی میں پستے رہنا ہی لکھا ہو ایسی کہانیاں دیکھنے کے بعد تو آدمی خدا کی ذات پر بھی شک و شبہ کرنے لگتا ہے اُس کے موجود ہونے پر بھی یقین ڈگمگا جاتا ہے جیسے وہ ہونے پر بھی نہ ہو یا وہ کسی کو بنا کر بھول گیا ہو۔

اوور کوٹ کو لپیٹے جب میں پہنچا ہوں تو گرم موزوں کے باوجود میرے پاؤں سن ہو رہے تھے۔ ہوا کے تھپیڑوں نے مجھے سن کر دیا تھا ناک برف کا ٹکڑا لگتی تھی سائیں سائیں کے شور سے کان بند ہونے لگے تھے۔ پیدل چلنے کے باوجود جسم گرم نہیں ہو سکا تھا۔ ہیٹر ایک دم بڑا جاندار لگا آگ کی سرسراہٹ نیلے شعلے کی لپک اور تال تھی جیسے گیت کی بڑھتی اور بلند ہوتی لے۔ پاؤں گرم کر کے میں قریب ہی مخملیں کرسی میں دھنس گیا باہر ہوا کے شور میں اور زیادتی ہوتی گئی۔ درختوں سے گھرے اس ہوٹل کو معلوم ہوتا تھا نعرے لگاتے ایک جلوس نے گھیرے میں لے رکھا ہو خوشگواری اور باہر کے مقابلے میں اندر کے اپنے پن ذہنی تھکن تنہائی کے احساس سب نے مل کر مجھے تھپکنا شروع کیا پھر نیلے پانیوں کے خواب میں ساری آوازیں ڈوب گئیں مہاساگر کی لہروں نے مجھے جھولا جھلایا۔ پتہ نہیں میں کتنی دیر سویا ہوں گا کہ دروازے پر دستک ہوئی ہاں مجھے یونہی لگا جیسے کسی نے دروازے کو ہولے سے بجایا ہو وقفوں سے پھر ذرا زور سے ٹھوکا دیا ہوگا۔ لگا میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں انجانے کا خوف آدمی کو یوں بھی ہلا دیتا ہے۔ خواب کہیں غائب ہو گئے

دُور کہیں آدھی رات کا گھنٹہ بجا۔ "ذرا دروازہ تو کھولیے۔" لہجہ ہرگز غیر ملکی نہیں تھا۔

دوبارہ ذرا وقفے سے پھر دستک ہوئی۔

"کون ہے۔" میں نے جاگ کر ذرا تیزی سے کہا۔

"میری چابی گم ہو گئی ہے۔" نہ تُرش اور نہ ہی کھردری عورت کی یہ آواز لگتا تھا زبان کی لُکنت اور بدن کی لڑکھڑاہٹ کے درمیان سے کہیں مجسم ہونے کی کوشش ہو۔ اور دروازہ کھولنے کا بھی میرا کوئی ارادہ نہیں تھا کال گرلز کے چکر میں یونہی میں کبھی نہیں پڑا اور پھر آدھی رات پیچھے پڑی ادھ باسی اُترنوں سے دل بہلانے کا شوق مجھے کبھی نہیں رہا کوڑے کے ڈھیروں سے یادوں کی بوری میں گودڑ بھرنے والوں سے مجھے نفرت ہے آدمی تعفن کو لپیٹ نہیں سکتا اُسے اوڑھا نہیں جا سکتا۔ روح کی پیاس کبھی گندے گدلے پانی سے مٹی ہے ٹھنڈے کنوؤں کے میٹھے دھارے سے ہی مجھے شغف رہا ہے پارسائی کا دعوٰی نہیں کر رہا ہوں مگر تیز تیز سانسوں کی گڑبڑ اور پسینے کی بُو سے مجھے اپنے وجود کے آلودہ ہونے کا ڈر لگا رہتا ہے۔ دوست ہنستے ہیں صفائی کی میری اس عادت کو بے جا اسراف سمجھتے ہیں آدمی کبھی مٹھاس سے بھی گندہ ہوتا ہے سو گند سے بھی گھبرایا ہے۔ کہتے ہیں تم تو صدیوں پہلے پیدا ہو گئے ہو۔ جنس کا آتش فشاں جواب پھٹتا ہے اور آگ اُگلتا ہے تو اس لاوے کو ٹھنڈا ہونے کے لئے صدیاں چاہئیں وہ کہتے ہیں میں بزدل ہوں لیکن تجربہ سے ڈرتا ہوں خود پسند ہوں اور ذہین تو قطعاً نہیں مگر چابی کے گم ہونے کا میرے دروازے کے کھلنے سے کیا تعلق ہے۔"

میں صرف یہ چاہتی ہوں آپ RECEPTION کو فون پر کہہ دیں۔

"کونسا نمبر"۔ "تین ہے آپ کے برابر میں کونے والا کمرہ۔

آپریٹر کی سوئی ہوئی آواز آئی۔ "یہ سدا تین نمبر کی چابی گم رہتی ہے۔"

"میں نے کہا کیا جواب دوں۔" بڑبڑاہٹ برابر جاری تھی۔

"انھیں کہئے کم از کم آدھ گھنٹہ تو لگے گا جس بیرے کے پاس چابی ہے۔ وہ کہیں سویا پڑا ہوگا۔" پھر ذرا جاگی ہوئی آواز میں کہا۔ "انھیں کہئے انتظار کریں۔"

"میں نے فون کر دیا ہے چابی آتی ہی ہوگی۔" مگر دروازہ نہیں کھولا۔

اوپر کی بتی بجھا کر میں نے پردہ ہٹا کر باہر جھانکا سیاہ سرد رات بادلوں کے لبادے اوڑھے سڑک کی مدھم روشنیوں کے اوپر سے محوِ پرواز تھی اس کی تیز اُڑان کا ساتھ دیتے ہوئے درخت جھکے جاتے تھے شاخیں پاگلوں کی طرح دوڑ میں حصہ لینے کے لئے ایک دوسرے کو دھکیل رہی تھیں پتے تیز تیز کو دتے پھرتے تھے ننھے خرگوشوں کی طرح اور وہ عورت تنہا کھڑی ہوئی چابی کی راہ دیکھ رہی ہوگی۔۔

ہاں وہ تنہا ہی ہوگی اُسے تنہا ہی ہونا چاہیے اگر کوئی ساتھی ہوتا تو وہ خود دروازہ کھٹ کھٹاتا۔ آواز میں سلیقہ تھا لفظوں کی ادائیگی عمدہ تھی یہ مہذب لب و لہجہ تھا جو کسی غیر ملکی کا تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں نے بے خیالی میں ایک مجسمہ بنانا شروع کیا ذرا بھاری تھوڑی لمبی دوشیزہ نہیں اپنے پہ یقین رکھنے والی عورت ہی ہو سکتی ہے۔ وہ۔ خیر خیر۔ اور ٹھنڈے بستر میں جب مجھے وہ سردی گوارا ہی لگی تھی میں نے اپنے خوابوں کو پھر سے وہیں جوڑا جہاں سے وہ ٹوٹے تھے۔

اگلی صبح میں نے کاؤنٹر پر چابی دی ہے تو خوشبو کا ایک جھونکا میری ناک سے ٹکرایا بے چین کرنے والی یہ باس سینٹ کی نہیں تھی دیسی

عطر کی بھی نہیں سستی اور آوارہ سی جیسے استعمال کرنے والے کا اچھے اور بُرے میں امتیاز کا سلیقہ ہی نہ ہو جیسے بے ترتیب کپڑے پہننے والے کو دیکھ کر طبیعت الجھتی ہے یس یونہی سی کیفیت میری بھی ہوتی ہے۔ آس پاس کوئی نہ تھا پتہ نہیں یہاں سے ابھی ابھی کون گزرا تھا؟ دور پڑے صوفوں پر لوگ بیٹھے تھے سواری ملنے کا اس کے انتظار میں اخبار کو جلد جلد ختم کرنے کے لئے صفحوں کو پلٹ کر صرف سرخیاں دیکھتے ہوئے۔ لمبے بالوں والے خلط ملط لباس پہنے مرد اور عورتوں کے جوڑے جو غیر ملکی ہوتے ہوئے مشرقی لباس میں مضحکہ خیز لگتے تھے اور تیز تیز گفتگو کر رہے تھے۔ بارش صبح سے بنا رُکے پڑ رہی تھی میں نے کاؤنٹر کے اُوپر سے شیشوں کے پرے جھانکا درختوں کی ہریالی دھلی دھلی تھی اور بھیگی شاخیں پانی میں کودتے پھاندتے بچوں کی طرح زور زور سے ہل رہی تھیں ٹرن ٹرن ٹیلیفون کی گھنٹی بجی ۔"جی ابھی ذرا دیر ہوئی باہر چلی گئی ہیں"..... جی کوئی پیغام کسی کے نام چھوڑ کر نہیں گئیں۔ پتہ نہیں کب آئیں عام طور پہ رات گئے لوٹتی ہیں ..... جی اپنا پتہ لکھوا دیجیے۔" پھر اس نے چٹ پہ ایک نام لکھ کر اُسے تین نمبر کے خانہ میں جو ڈاک کے لئے بنا تھا رکھ دیا۔

اُداس بھاری دل ہوئے ہوئے گھسٹتا رہا۔

دفتر سے لوٹ کر میں خط لکھتا رہا کھلے پردوں میں سے سڑک پہ جاتی موٹریں کھلونوں کی طرح چھوٹی اور کمپنیوں پر بھاگتے ریل کے ڈبوں کی طرح چکروں میں گھومتی لگیں ذرا سی بلندی سے ہر شے کتنی مضحکہ خیز اور بے معنی لگنے لگتی ہے۔

"پھر میں تم سے قطعاً محبت نہیں کروں گی اگر تم کل نہیں آئے خدا کی قسم۔"

"میرا انتظار نہ کرنا کام ختم کر کے ہی آؤں گا۔"

یہ مکالمہ عین میرے کمرے کے سامنے کھڑے ہو کر دُہرایا جا رہا تھا۔

"دیکھو میں مار بیٹھوں گی تمہاری یہ جرأت کہ میں کہوں اور تم انکار کرو۔"

انکار کون کر رہا ہے ایڈا مگر کام تو دیکھو بیس تصویریں کل تک کیسے ممکن ہیں۔ اگر ڈرائنگ بھی بناؤں تب بھی اور تم کہتی ہو انہیں رنگوں بھی سبھی نہیں تمارنگ مجھ میں یہ ہمت نہیں۔

اوہ اوہ پلیز جادی میرے لئے یہ بہت ضروری ہے۔ تمہارے لئے گھڑیاں اور پل بھی اہم ہوتے ہیں اور میں تو پوری ایک رات اور آدھے دن کی بات کر رہی ہوں۔

پھر آوازیں روشنی کے نقطوں کی طرح اندھیرے میں ڈوب گئیں میں نے پردے بند کر دیئے۔

فون کی گھنٹی بجی میں ابھی نیم خوابیدہ تھا سردیوں کی سہ پہروں کی غنودگی بڑی دل خوش کُن ہوتی ہے اور پھر جب کوئی کام نہ ہو کہیں جانے کی جلدی نہ ہو تو بستر کی گرمی آدمی کو تھپکتی ہے۔

"میں رات کی جسارت کی معافی چاہتی ہوں۔"

"میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔"

"لگتا ہے میں نے پھر آپ کو سوتے میں سے جگا دیا ہے اور اب دوہری معافی کی طالب ہوں۔"

"یہ تو معمولی بات ہے محترمہ۔"

رات کے وقت سوتے میں سے کسی کو جگانا پسند تو نہیں مگر مجھے لگا تھا آپ سو نہیں رہے تھے۔ ٹیبل لیمپ کی مدھم نہیں اُوپر کی پُوری روشنی دروازے کے نیچے سے دکھائی دیتی تھی اس لئے سوچا آپ کو زحمت دی جا سکتی ہے۔ اصل میں میں چیزیں اِدھر اُدھر رکھ کر بھول جاتی ہوں — حالانکہ بیماری سے پہلے میں ایسی نہ تھی۔

"جی"۔ بھلا میں اور کیا کہتا۔

یقین کیجیے میری چابی واقعی گم ہو چکی تھی اور سوائے آپ کو تکلیف دینے کے اور کوئی راستہ نہ تھا۔ تین منزل اتر کر جانا میرے لئے تقریباً ناممکن تھا۔ میں سارا دن چلتی رہی تھی۔

"چلتی رہی تھیں"۔ میں نے حیرت سے کہا۔

"جی چلتے رہنا کوئی ایسی حیران کُن بات تو نہیں"۔ اُس نے کہا۔

"نہیں"۔ میں نے سوچا خاموش رہوں تب بھی وہ بولتی چلی جائے گی۔

"حیران کُن بات نہیں ہے کمال ہے صاحب یعنی کسی خاتون کا سارا دن چلتے رہنا آپ کو بالکل نارمل لگتا ہے"۔ اس کی آواز غصے سے ذرا تیز ہو گئی تھی۔

جی چاہا فون بند کر دوں مگر پتہ نہیں کیوں میں منتظر رہا۔

"کمال ہے صاحب آپ سردی میں چلتے رہنے کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے۔ چلتے رہنا میری مجبوری ہے۔ سائیٹ کی تلاش میں مارے مارے پھرنا"۔ وہ چپ ہو گئی جیسے کسی سوال کی راہ دیکھ رہی ہو مگر میں نے کچھ نہ پوچھا بھلا میں کسی کی زندگی میں نجی معاملے کی نوعیت بنا جانے بُوجھے کیوں دریافت کروں۔

"اچھا صاحب شکریہ"۔ اور فون بند ہو گیا۔

باہر گھنا گھنی ہوتی نیلاہٹ کی تہہ تک اتر گئی تھی اور یہ تنی ہوئی چادر کبھی دودھیا لگنے لگتی اور کبھی کاجل کا سا سیاہ اندھیرا اچانک ہی اندر گھس آتا پھر ذرا سی سفیدی ہوتی جیسے آنکھ مچولی کھیلی جا رہی ہو۔ میں نے وقت دیکھا چھ بج رہے تھے اگر میں اپنے گھر پہ ہوتا تو دوستوں سے ملنے ملانے چلا جاتا سوچا دو دریا کے ایک رشتہ دار ہیں یہاں اُن کی خیریت دریافت کر دوں پھر میں نے بیرے کو بلا کر چائے کے لئے کہا اور ایک باتصویر رسالہ دیکھنے لگا چاند اور فضا سے زمین کتنی خوبصورت لگتی تھی اپنے سمندروں اور صحراؤں سمیت بستے دریاؤں اور برف سے ڈھکے پہاڑوں والی گہری نیلی جیسے کسی لاڈلے بچے کی قیمتی گیند اور آدمی اپنے کو کتنا اہم جانتا ہے کائنات کا دل۔

فون کی گھنٹی پھر بجی۔ "صاحب کیا آپ میرے ساتھ چائے پینا پسند کریں گے"۔

"میں چائے پی رہا ہوں"۔ میں نے یونہی کہا اس حیرت سے کہ اس عورت نے مجھے تنگ کرنا شروع کر دیا ہے۔

"تو کیا پھر میں آپ کے پاس آجاؤں"۔ یہ سُن کر میں بھلا کیا جواب دیتا شاید سہ پہر اُس نے میرے متعلق غلط اندازہ لگایا تھا اُس نے سوچا ہو گا اور لوگوں کی طرح میں کوئی مہم جُو ہوں اور جانے کیوں ہوٹل میں ٹھہرا ہوں تیز چلتی تصویروں کی ریل سی میرے دماغ میں چلی ہوئے سے بنا کچھ کہے میں نے فون رکھ دیا۔

حیرت سے میں سوچتا رہا اور پھر بڑے زور کی ہنسی آئی دوسرے سرے پر وہ خاتون میرے جواب کا انتظار کر رہی ہو گی۔

دروازہ کسی نے دھکیلا میں عین ہنسی کے درمیان پکڑا گیا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹائے بنا وہ چلی آئی تھی "کیوں جناب آپ یوں خواتین کی بے عزتی

کرتے ہیں ،، وہ دوسری خالی کرسی پر بیٹھ گئی ۔

" مگر خاتون میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا میں تو آپ کو جانتا تک نہیں ۔"

تو اس کے لیے لمبی چوڑی تمہید کی کیا ضرورت ہے میرا نام آیڈا ہے میرا مطلب ہے میرے دوست ملنے والے مجھے اسی نام سے پکارتے ہیں حالانکہ میں عادی ہوں پھر ادھر ادھر دیکھ کر کہنے لگی آپ غالباً سگریٹ نہیں پیتے ۔

مجھے اس کی بو ناگوار لگتی ہے ۔"

" ناگوار لگتی ہے تو پھر آپ کی ہماری دوستی کیسے چلے گی میں تو بہت پیتی ہوں چین سموکر ہوں ۔

مجھے لگا میرا سانس رک جائے گا کبھی آپ لوگ ایسی صورت حال سے دوچار ہوئے ہیں ؟

" آپ بیٹھ کیوں نہیں جاتے ۔ اور یہ آپ کا رنگ کیوں اترا جا رہا ہے کسی اجنبی خاتون سے کبھی بات کرنے کا موقع نہیں ملا "

میں معمول کی طرح بیٹھ گیا اس نے گھنٹی بجا کر خود ہی بیرے کو بلایا ، تازہ چائے کا آرڈر دیا ۔

مجھے لگا بیرہ زیر لب مسکرا رہا تھا " ہاں سنو " اس نے بیرے سے کہا " سگریٹ کا ایک پیکیٹ بھی لیتے آنا ۔"

" سگریٹ نہیں پیتے آپ کمال ہے بھئی کمال ہے ۔ مگر آپ اگر مجھے یہاں برداشت کریں گے تو آپ کو اس کی بو بھی برداشت کرنا ہوگی ۔"

اچھا آپ ابھی بچپنے کی حدوں سے نہیں نکلے باتصویر رسالوں سے دل بہلاتے ہیں ۔ اس نے رسالہ اٹھا لیا زمین کس قدر خوبصورت ہے مگر چاند سے ہی ایسی دکھائی دیتی ہے کیونکہ اتنی دور سے اس کی گندگی اس کی بدصورتی اس کی خرابی اور اس کے اندر جلنے ہوئے دلوں کی بو کوئی شے بھی تو اوپر تک نہیں پہنچتی ۔

" کیوں صاحب ؟ " اس نے میری طرف دیکھا ۔ وحشت سے بھری آنکھیں بکھری بکھری سی عورت معمولی کپڑے پہنے سلیقے سے بال سنوارے اس بے چین کرنے والی خوشبو سے میرا کمرہ بھر گیا ۔

" اصل میں چاہتے تو مجھے آپ کو بلانا چاہیے تھی " وہ اب ذرا سنبھل کر بیٹھ گئی ۔

" کوئی بات نہیں "

شکر ہے آپ بولے تو سہی اس نے اپنے پنج رنگی دوپٹے کو بازو سے گلے میں ڈالا ۔ میں اس کے سامنے اسکول کا بچہ لگ رہا تھا ۔

بھئی آپ اپنا تعارف تو کروائیے نا ۔ میں نے اپنا نام پتہ بتایا ۔ ارے صاحب آپ کے محکمے کو سخت پبلسٹی کی ضرورت ہے ۔ نیا بلکہ بالکل ایک دم نیا محکمہ ہے نا ۔ اگر حکومت چاہتی ہے کہ عوام کو کوئی فائدہ پہنچے تو اسے فوراً پبلسٹی کرنا چاہیئے اور وہ اس کی اہمیت پر تقریر کرتی رہی یہاں تک کہ چائے آگئی ۔ جب وہ کمرے سے نکلی ہے تو دھوئیں کا سفید غبار بھی اس کے پیچھے نکلا میرا دم گھٹ رہا تھا ۔ میں نے پردے کھول کر کھڑکیاں بھی کھول دیں رات بیتابی سے اندر گھس آئی جیسے وہ سیاہ بلی ہو جو بہت دیر سے بارش میں بھیگ رہی تھی ۔

اس بو کی وجہ سے جو چھت کے پاس میرے اردگرد ہر جگہ تھی مجھے نیند ہی نہیں آئی چابی گم ہونے کا ڈرامہ دہرایا گیا مگر چند راتیں بعد ۔

سیڑھیوں پر بہت زور زور سے چڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی ۔

" ایڈا میں تمہارا یہ سارا کباڑ اٹھا کر اب اور آگے نہیں جا سکتا بھئی ۔ یہ سیڑھیوں پر رکھ رہا ہوں "

"تمہاری یہ بحال لڑکھڑاتی ہوئی آواز سنائی دی سارا دن مارے مارے پھرنے کے بعد اب لوٹی ہوں تم ہی لوگوں کے لئے گھومتی ہوں اور تم اسے کباڑ کہتے ہو۔"

"اتنا تو تم سے ہو نہیں سکتا کہ چار گھڑی اپنے کمرے میں بٹھاؤ۔"

تو یہ میرا مقدر تھا کہ میں ایذا کی رات کی آخری گفتگو کا شاہد بنتا رہوں۔ پتہ نہیں پھر کیا ہوا۔ چیزیں جیسے سیڑھیوں سے نیچے گرنا شروع ہوئیں کمروں کے دروازے کھلے اور پھر بند ہوئے۔ خاموشی چھا گئی اور پھر میرا دروازہ بجایا گیا۔

"ذرا چابی کے لئے نیچے فون کر دیجیے گا۔"

میں نے کچھ کہے بنا فون کر دیا۔ اگلے دن چائے پر ملاقات ہوئی نہ اس نے معذرت کی نہ میں نے اس سے یہ توقع لگائی تھی آتے ہی کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔ "چائے پلائیے صاحب۔" میں نے بنا بات کئے چائے بنا دی۔

"میں زندگی سے تھک گئی ہوں عاجز آ گئی ہوں مگر زندہ رہنے کے لئے کچھ نہ کچھ کرتے رہنا پڑتا ہے۔ اگر آپ کو پتہ ہو کہ میں نے کیا کچھ کیا ہے کن چکروں سے نکلی ہوں تو آپ مجھ سے ہمدردی کریں گر بخدا میں تو دُنیا سے یہ آس لگاتے نہیں جی رہی بیکار لوگوں سے یونہی اُمیدیں وابستہ نہیں کئے ہوں۔"

پھر خاموشی کا وقفہ لمبا ہوتا گیا۔ مجھے لگا جیسے اُسے نیند آ گئی ہو۔ ایک دم آنکھیں کھول کر کہنے لگی۔

"اچھا چلو مجھے گولی مارو یہ بتائیں آپ نے اپنے محکمے کی پبلسٹی کے لئے کیا کیا ہے ارے بھائی نوکریاں کہاں ملتی ہیں۔ اتنا عمدہ محکمہ ہے کام نہ دھام ذرا ہاتھ پاؤں ہلاؤ تھوڑا زندگی میں دلچسپی لو یوں کیوں بیٹھے ہو۔ مجھ سے جو ہو سکے گا میں تمہارے لیے کروں گی (ملاحظہ کیا فوراً آپ سے تم پر اُتر آئی) تمہیں پتہ ہے میرے اتنے عمدہ جاننے والے لوگ ہیں اُن سے کہہ کر ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر تمہارے لئے اشتہارات دلوا سکتی ہوں مگر تم منہ سے تو کچھ بولو۔"

میں نے اب بھی یہ نہیں پوچھا کہ وہ کیا کرتی ہے۔ طے یہ پایا کہ جس دن مجھے چھٹی ہو اُس کے ایک جاننے والے کے ہاں چلا جائے۔

عام طور پر اتوار کو جاگ ذرا دیر میں ہوتی ہے۔ اخبار دیر میں آتا ہے چائے دیر میں پی جاتی ہے لوگ شیو نہیں کرتے دھوپ اگر ہو تو اُس میں ستاتے ہیں۔ مگر پروگرام کے مطابق میں ذرا جلد اُٹھا شیو کی کپڑے بدلے اور ذرا سی خوشبو لگائی دس بجے تک اُس کی راہ دیکھی دھوپ بڑی جاں بخش اور کھلی ہوئی تھی میں نے کھڑکی کھول کر گردن نکال کر اِدھر اُدھر جھانکا پہلی طرف ذرا پرے کھڑکی کے نکلے ہوئے حصے پر اپنا چہرہ نکالے وہ خاموش کھڑی تھی کھلے ہوئے بال شانوں سے نیچے لٹکے ہوئے اور اتنی دُوری سے بھی اُن کی سفیدی مجھے جھلکتی دکھائی دے گئی۔ میں ایک ٹک اُسے دیکھتا رہا۔ یہ عورت جو شور اور مصروفیت سے اپنے گرد قلعہ بنائے تھی۔ پتہ نہیں کیوں اُس کا سراپا اتنا اُداس کر گیا۔ اُس نے گردن پھرا کر مجھے دیکھا مگر اُس کی نگاہوں میں کوئی پہچان نہ تھی خفگی کے مارے میرا بُرا حال ہو گیا اور میں لفٹ کا انتظار کئے بنا سیڑھیاں اُتر گیا۔ بس میں سوار ہو کر اُس کے روٹ ختم ہونے کی جگہ تک گیا وہاں کھیت تھے اور سرسوں کی پیلاہٹ دُور تک پھیلے آسمان سے کہیں ملتی تھی میں نے کسانوں سے باتیں کیں ایک کنوئیں کی منڈیر پر گھنٹوں بیٹھا رہا۔ چلتے ہوئے رہٹ میں سے بہتے ٹھنڈے میٹھے چمکیلے پانی کے دھارے کو دیکھتا رہا۔ وہاں سے اپنے دُور کے رشتہ داروں کے ہاں بھی گیا زور زور سے ہنستا رہا ہم مل کر گاتے رہے رشتہ کی بہنوں سے میں نے خوب مذاق کئے آنکھ مچولی کھیلی، آئس کریم کھائی پتہ نہیں میں اندر سے اُداس کیوں تھا۔

"عجیب آدمی ہیں آپ بھی کہاں چلے گئے تھے؟" وہ مجھے لفٹ میں مل گئی۔ میں نے حیرت سے اُس دُبلی سانولی اور بے تحاشا سگریٹ پینے والی عورت کو دیکھا۔

"صبح میں جب تیار ہو کر نکلی ہوں تو آپ کہاں تھے بھئی کہاں تھے تم۔" لفٹ والے نے نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو اُس میں حیرت تھی۔
دس بجے تیار ہو کر جب میں نے جھانکا ہے تو آپ کھڑکی میں کھڑی تھیں اور آپ نے مجھے دیکھا بھی تھا اُس وقت تک تو جانے کے کوئی آثار نہیں تھے۔" میں نے شکایتاً کہا۔

تم کتنے ملتے ہوئے ہو عاصم سے میرے بھائی سے وہ بھی ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جایا کرتا تھا۔ لفٹ رُکی ہم اُترے وہ میرے کمرے کے سامنے رک گئی بہرحال تم نے کتنا اچھا چانس کھو دیا ہے اور اُن کا فون آیا تھا کہ عاصم کو نہیں لائیں۔

"عاصم کون عاصم" میں نے پوچھا۔

"میں نے انھیں کہا ہے کہ تم عاصم ہو اور پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے تم یوں بھی مجھ سے چھوٹے ہو۔" اُس نے میرے کاندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "اور تمھیں بھلا اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے ہو کیوں نہیں سکتا" میں نے ذرا پرے ہٹتے ہوئے کہا۔ "تمھیں پتہ ہے میری نظر کمزور ہے۔"

"دور کی اور بہت قریب کی بھی۔" وہ وہاں میرے کمرے کے سامنے کھڑی تھی جیسے اُس کا وہاں سے ہٹنے کا کوئی ارادہ نہ ہو۔ ساری رات ہم تاش کھیلتے رہے اُس نے مجھے بہت سی کھیلیں سکھائیں دھوکے سے جیتنے کے داؤ، پتے چھپانے کے طریقے وہ ہنستی تو ہنستی ہی چلی جاتی ایش ٹرے میں سگرٹوں کے ٹکڑوں کا ایک چھوٹا سا انبار لگ گیا میرے کمرے میں نیلے دھوئیں کے اوپر ہر شے دُھندلی ہونی چاہیے تھی تاہم حیرت انگیز طور پر چیزیں واضح تھیں ساری چیزیں۔ دل کا آئینہ تک صاف تھا۔

مجھ میں کرید نہیں ہے از خود پتہ چل جائے ٹھیک ہے ورنہ میں لوگوں سے الجھتا نہیں اُن کی زندگی کے کونوں کھدروں میں جھانکنے کی میری عادت نہیں ابتدا اسے میں نے خود کچھ نہیں پوچھا۔

"عاصم کو بھی تاش کی کوئی بازی سوائے رمی کے نہیں آتی وہ بھی تمہاری طرح اناڑی ہے اور اپنے سے بے پرواہ لباس کے معاملے میں تم اُس سے ذرا خوش ذوق ہو۔ وہ یہاں ہوتا تو تم دونوں کی خوب بنتی۔ وہ یادوں کے کارواں کے پیچھے چلنے لگی۔" میں اور وہ خوب جھگڑتے تھے آنا لڑتے تھے ہر وقت ایک دوسرے کو شکست دینے کی فکر میں یہاں تک کہ کھانا کھانے اور پڑھنے لکھنے میں بھی اندر سے ہر وقت مقابلے کی فکر میں لگے رہتے اماں ایک کو اچھا کہیں تو دوسرا روٹھ جاتا۔ ہر شے ہمارے لئے چیلنج تھی۔

"عام طور پر اُوپر تلے کے بہن بھائیوں میں ایسا ہوتا ہی ہے۔" میں نے یونہی کہا۔

ایک دم اُسے غصہ آ گیا "اُوپر تلے کے بہن بھائیوں میں اتنی شدت سے رقابت نہیں ہوتی ہم تو جڑواں بہن بھائیوں کی طرح تھے اُسے بخار آتا تو مجھے بھی خواہش ہوتی کہ بیمار پڑ جاؤں۔ مجھے اُس کے بنا ایک پل قرار نہیں آتا تھا۔ اماں عاجز تھیں کہتیں "میری دعا ہے تمہارے درمیان آگ کا پہاڑ ہو تم لوگ جُدا ہو جاؤ تو میں چین سے ہوں گی۔" اور پھر انھیں بھی چین آ گیا۔" اُس کی آنسوؤں سے خالی آنکھیں بڑی بے نُور گم رہی تھیں۔

جنگ ہوئی ہے تو وہ بھی بھرتی ہو گیا اُن دنوں رنگروٹوں کو تھوڑی تھوڑی ٹریننگ دے کر محاذ پر بھیجا جا رہا تھا۔ انھیں فوراً کمیشن مل جاتا تھا۔

اُسے بھی مل گیا لفٹیننٹ کی وردی اس پر بہت سج رہی تھی مجھے چڑانے کے لیے وہ گھڑی گھڑی میرے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا اور سیلوٹ کرتا۔ "یہ فرق ہوتا ہے لڑکوں اور لڑکیوں میں۔" جی چاہا چیخ چیخ کر روؤں اس لئے نہیں کہ وہ جا رہا تھا اس لئے کہ میں وہاں نہ جا سکتی تھی۔

"عورتیں بھی تو فوج میں جا سکتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"کیا تم چپکے نہیں رہ سکتے۔" اُس نے مجھے ڈانٹ دیا۔ اگر میں جا سکتی تو چلی جاتی مگر ایسا ہو نہ سکا۔ وہ واپس نہیں آیا پتہ نہیں اُسے زمین نگل گئی وہ قید کر لیا گیا یا کیا ہوا۔ ہم لوگ منتظر ہیں اور رہیں گے لمبی فہرستوں میں مرنے والوں میں گم ہونے والوں میں کہیں اس کا نام نہ تھا۔"

بیرے نے آ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ "آپ کے ملنے والے کچھ لوگ آئے ہیں۔"

"ابھی آتی ہوں۔" وہ اپنی سگریٹ کا پیکٹ بھی چھوڑ گئی۔ "جانے کون ہو۔"

رات کے اندھیرے میں لمبے گھنٹے ایک کے بعد ایک بجتے رہے کھانا کھا کر میں لیٹ گیا اور دھوئیں سے بھرے اُس کمرے میں خوب گہری نیند سویا۔

سرکاری مکانوں میں بہت سے جھگڑے ہوتے ہیں باورچی خانے کا مسئلہ اس کو صاف ستھرا رکھنے کا مسئلہ نوکروں سے نمٹنے کا مسئلہ اکیلے آدمی کی جان کو یہ روگ بے وجہ کی مصروفیت بن کر لگتے ہیں اور ان سے بچنے کے لئے میں نے وہیں ہوٹل کے اُس سے ذرا بہتر کمرے میں نقل مکانی کر لی اور اپنے حالوں زندگی رواں ہو گئی۔ کام بھی بڑھ گیا تھا اور پھر میں کچھ لکھنے پڑھنے میں بھی لگا رہتا تھا سردی بڑھی اور دن ذرا ذرا سے ہو گئے صبح ہوتی اور شام کو آ لیتی۔ شامیں میں اکثر کمرے میں گذارتا۔ محکمے کے لوگ اِدھر اُدھر سے چند لکھنے لکھانے والے دوست بن گئے تھے وہ جمع ہو جاتے اور دیوانی بحثیں ہوتیں۔ ہر آدمی کسی نہ کسی کام میں لگا تھا۔ تجربے ہو رہے ہیں۔ سیاست ہے مذہب ہے اپنا دکھ ہے پرایا غم ہے جب جوانی ہوتی ہے تو کتنا جوش ہوتا ہے۔ کبھی کبھار یہ سب چھوڑ کر ہم کسی ہوٹل میں جا بیٹھتے۔

نئے سال کی شب آئی میرا ارادہ تھا کہ گھر جاؤں گا بہن بھائیوں سے ملوں گا مگر دوستوں نے جانے نہیں دیا۔ ہمیشہ تو تم گھر والوں کے ساتھ ہی ہوتے ہو اب کے یہاں رہو ہم تمہیں کسی سے ملوائیں گے نئے سال کا تحفہ سمجھ لینا اُس دعوت کو ان کے ہاں بڑی زبردست شب منائی جاتی ہے۔ کتنے ہی نئے چہرے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ سارا شہر اُلٹ پڑتا ہے۔ تمہاری طبیعت خوش ہو جائے گی۔

یہ ایک گالا نائٹ تھی۔ یوں تو میں نے ناچ رنگ شراب ہنسی سبھی کچھ دیکھا ہے مگر اُس گھر میں ہولی کے رنگوں سے بڑھ کر رنگ تھے عورتوں پر گلال بکھرا ہوا پیچھے فن کار کی لگن سے اُس نے حُسن جمع کیا تھا جانے کہاں سے سینت سینت کر رکھی مورتیوں کو لا سجایا تھا بجتے ہوئے بدن اپنی دلآویزی سے نشہ دلاتے ہوئے خطوط والی عورتیں کنواریاں جو چھپی سی آنکھیں چہرے پر سجائے تھیں۔ بیاہتا سحر کی کشش کے سامنے فرشتے بھی پھسل جائیں۔ بے خبر ہرنیوں کی طرح اپنے آپ سے گھبرائی ہوئی لڑکیاں۔ شکاری نازنینیں۔ بے سُدھ کرنے والی ناگنیں۔ اپنے بھولپن سے جادو جگاتی الھڑ دوشیزائیں۔ بچپن اور جوانی کی حدوں پر کھڑی کنواریاں۔ کھائی کھیلی ترنگ میں آئی عورتیں۔ اپنے آپ کو سنبھال کر چلنے والیاں۔ شرمائی لجائی، کونوں میں چھپتی مدھ ماتی اداؤں والیاں اور ہر پرائے غیر کے بازو میں بازو ڈال کر اپنے آپ پر یقین رکھنے اور کسی سے بھی نہ ڈرنے والی بےاختیار جام پر جام لنڈھانے والیاں۔ سب طرح کا جمگھٹا تھا۔

"اپنے آپ کو اس مجمع میں گم کر دو۔" میرے دوست نے کہا اور پھر مجھے ایک کونے میں کھڑا کر کے وہ کہیں غائب ہو گیا۔

"سیکس کو کیا سمجھتے ہیں صاحب"۔ مردوں کے دائرے میں گھری کسی عورت کی آواز آئی۔ "سب کچھ سب کچھ"۔ اپنے جام ٹکرانے کے بعد انہوں نے کہا۔ چھت میں بتیاں ستاروں کی طرح جڑی تھیں کمرہ دھوئیں سے اندھا اور روشنی کے باوجود عجیب اداس اداس سا تھا۔ کسی نے جام میرے ہاتھ میں تھما دیا پھر اُسے بھر دیا اور میں کونے میں ایک خالی میز پر جا بیٹھا۔ سینٹ۔ سانسوں جسموں کی مختلف مہکیں مل ہوئی تھیں عجیب بوجھل فضا تھی۔ جام چھلک رہے تھے لوگ مسلسل باتیں کر رہے تھے ہنس رہے تھے۔ اگر کوئی دھن بجا رہا تھا جو بیک وقت نئی بھی تھی اور پرانی بھی لہروں کی طرح بہا کر لے جانے والی۔ ناچنے والوں کے جسموں سے یہ دھنیں ٹکرا رہی تھیں۔ روشنیاں مدھم ہوتے ہوتے گم ہوتی لگتی تھیں۔

"تم پی کیوں نہیں رہے"کسی نے میرے قریب آ کر کہا۔ "اکیلے ہو کیا؟ اوہ عاصم تم ہو میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم یہاں ملو گے۔ بیو۔"

"نہیں ایسا میں نہیں پیتا!" میں نے بھرے ہوئے جام کو پرے دھکیل دیا۔

"سنو یہ ہو سکتا ہے یہ شب لوٹ کر نہ آئے۔ کچھ بھی لوٹ کر نہیں آتا زندگی پلوں کے نیچے سے تیزی سے بہنے والے پانی کی طرح ہے اور دیکھو سُرخ شراب میں نرمی اور گھلاوٹ ہوتی ہے"۔ اس نے اپنا جام خالی کر دیا۔

یہ سیال جب رگوں میں اترتا ہے تو لگتا ہے تم قدیم یونانی دیوتاؤں کی شراب پی رہے ہو۔

"میں تمہارے علم کے سامنے ماتھا ٹیکتا ہوں"۔

"نہیں تم صرف میرا مذاق اُڑا رہے ہو سبھی میرا مذاق اُڑاتے ہیں۔ پیٹھ پیچھے مجھ پر ہنستے ہیں اور میں سب کا مذاق اُڑاتی ہوں۔ خدا کا اور انسانوں کا تمہیں میری ہمت کا اندازہ ہے؟"

"میں غلط اندازے لگانے کا ماہر ہوں صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا"۔

"شرابوں کے متعلق میرا علم اتنا مکمل ہے کہ تمہیں حیرت ہوگی۔

"اب مجھے کوئی شے حیران نہیں کر سکتی۔ تمہارے گُم ہو جانے کے بعد سے نہیں"۔

"سر پیچھے ڈال کر وہ ہنستی رہی یوں جیسے کوئی چیزوں کو روکنے کی کوشش میں لگا ہو۔ شاید وہ نشے میں تھی۔

"میں ساری رات پی سکتی ہوں اور نشہ مجھے نہیں ہو سکتا میں نشے کو ہو جاتی ہوں"۔

"ایسا ہونا ممکن ہے"میں نے سر جھکا کر کہا۔

"تمہاری باتیں بہت کھوکھلی ہیں جیسے اندر گرہیں ہی گرہیں ہوں گھٹن ہی گھٹن ہو"۔

میں کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ پورا چاند بالکل اکیلا اپنے زرد ہالے میں سے نیچے زمین کی طرف جھانک رہا تھا ہوا میں باس تھی پھولوں کی رات کی رانی کی بوندی کلائیوں کی۔

صاحبِ خانہ کے ساتھ وہ پھر میری طرف آئی۔

میں نے مڑ کر اُن کی طرف دیکھے بنا کہا"باغ بہت خوبصورت ہے"۔

"ایسا ہمیشہ خوبصورت لوگوں کو اپنا دوست بناتی ہے جو اچھی چیزوں کی تعریف کر سکیں اُسے سمجھنے کا سلیقہ اور ذوق رکھتے ہوں مگر مجھے افسوس ہے آپ پیتے نہیں ہیں۔ پتہ نہیں کیوں اگر بُرا نہ مانیں تو ذرا سی چکھ لیں۔ آج جاتے سال کی آخری رات ہے۔

"اسے اس کے حال پر چھوڑ دو میں اسے سنبھال لوں گی۔" ایڈا میرے برابر کھڑی ہو گئی۔ میزبان نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور رخصت چاہی۔

"تم بولتے نہیں ہو کیا خفا ہو۔" اُس نے خاموشی کو توڑنے کے لئے یونہی بات کرنے کے لئے کہا۔

"نہیں میں تو تمہیں جانتا تک نہیں خفا ہونے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔" میں سوچ رہا تھا کہ چلو اچھا ہوا اس اجنبی رات میں اجنبی جگہ میں وہ مجھے مل تو گئی۔

"تمہاری خاموشی اور ایسی باتیں میرے اندر ہلچل سی مچا دیتی ہیں۔ سوال کرنا تو جیسے تم جانتے ہی نہیں ہو اور تمہاری یہی ادا مجھے دیوانہ بنا گئی ہے۔" وہ میری طرف جھکی ہے تو مجھے واقعی دیوانی لگی۔

"پی لو ذرا سی ہی سہی میری خاطر۔" اُس نے ہاتھ میں پکڑا جام میری طرف بڑھایا۔

میری طبیعت اتنی بوجھل ہو گئی تھی ایک دم کہ میں اُس کا ہاتھ پرے بھی نہیں ہٹا سکا جیسے کسی نے مجھ پر جادو کر دیا ہو۔

"لے لو پی لو نا ایک گھونٹ ہی سہی۔" وہ اور جھکی۔

"شٹ اپ۔" میں نے زور سے تقریباً چیخ کر کہا۔

ہاتھ ہٹا کر وہ بہت سنجیدگی سے میری طرف دیکھنے لگی "اچھا تو تم بول بھی سکتے ہو مجھ اجھے اپنی بے عزتی گوارا ہے۔ مگر تمہارا یہ گونگا بہرا پن تو دُور ہوا۔

"ایڈا تم ایسی کیوں ہو۔" میں بدستور کھڑکی میں سے باہر دیکھ رہا تھا جہاں صدیوں پرانا چاند جانے کب کے بنے آسمان پر سے کیڑوں کی طرح کلبلاتے اور اپنے کو خوش کرنے کی مضحکہ خیز کوششیں کرتے ہوئے انسانوں کو نہایت بے نیازی سے دیکھ رہا تھا۔

"آؤ کہیں بیٹھ جائیں پھر میں تمہیں بتاؤں گی کہ میں ایسی کیوں ہوں مجھے ایسا ہی ہونا چاہیئے بھلا میں کوئی دوسروں سے الگ ہوں تم میرے معمولی لباس کی وجہ سے جس کی مجھے پرواہ نہیں ہے سمجھتے ہو کہ میں ضرورت سے زیادہ بہکتی ہوں نہایت بیباک ہوں جس طرح جی چاہے گفتگو کرتی ہوں اور مجھے آئندہ کا خیال نہیں۔ میں کسی سے ڈرتی نہیں۔ یہی باتیں ہیں نا؟"

"میں اتنے بہت سے سوال نہیں پوچھنا چاہتا میں تو صرف یہ جاننا چاہوں گا کہ تم نے مجھے اپنے مزاح کا نشانہ کیوں بنا رکھا ہے۔

"اوہ بے بی کم آن تم کو پتہ ہے میں تمہیں ماتم کی طرح سمجھتی ہوں۔ آؤ۔" اور وہ میرا ہاتھ پکڑ کر دوسری طرف بیٹھنے کے لئے کسی جگہ کی تلاش میں چلی۔

"میں بھاگ نہیں جاؤں گا، بس میرا ہاتھ چھوڑ دو۔"

"ایڈا۔ ایڈا۔" کئی آوازیں ایک ساتھ آئیں اور پرآؤ ہمارے ساتھ نیا سال مبارک ہو۔ نیا سال تمہارے لئے خوشیاں لائے۔ دُور کہیں شور کے اوپر سے گھنٹیوں کی صدا آئی جام ٹکرائے سنہری سیال سے بھرے ہوئے شیشے اُٹھے صراحیاں لڑھکیں بھلا نیا سال ان کے لئے کیا لانے والا تھا کون بتا سکتا تھا؟

لوگ ایک دوسرے کو گلے لگا رہے تھے اور پرانا سال زخم خوردہ سپاہی کی طرح وقت کے مورچے میں بے ہوش گر گیا تھا۔ ہنستے ہوئے مدہوش آدمی سازندوں کے گھستے پلوؤں کو سنوارنے کی ادھوری کوشش میں عورتیں — اندر بے پناہ گھٹن تھی۔ سٹیج پر لڑکھڑاتی لکنت بھری آواز میں کوئی کچھ کہہ رہا تھا پھر پردہ اُٹھا اور گھنگھروں کی تال پر سنبھلتی سنبھلتی بکھرتے ریتی کشتی کی طرح ایک لڑکی صبح نو کی خوشخبری بنی سامنے آئی۔ میں باہر نکل آیا۔ "تم جا کیوں رہے ہو ٹھہر جاؤ نا۔

میں مصروف ہوں۔ اناؤنسمنٹ کے لئے کسی سے کہہ دوں۔

میں ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ دوست جن کے ساتھ میں آیا تھا اس مجمع میں گم تھے اور سواری کا مسئلہ بہرحال تھا یہ جگہ ہوٹل سے تقریباً پانچ میل تھی۔ سردی کا شباب تھا اور چاندنی کے باوجود سڑک پر بکھرے سایوں سے اکیلا آدمی خوف زدہ ہوتا ہی ہے۔

ہوا میں خنکی اُسے رہ رہ کر کانپتے دیکھ رہی تھی وہ ایک ستون سے ٹیک لگائے کھڑی تھی اور پھڑپھڑاتے پلو کو اپنے گرد لپیٹنے میں لگی تھی۔ اُس کے بازو بہت ہی کمزور تھے جسم کے خطوط دلآویز بھی نہیں تھے اور ادھورے جیسے کھینچنے والے نے انہیں مکمل نہ کیا ہو مصور نے پہلے اُسے ایک اچھوتا خیال سمجھ کر بنانا شروع کیا اور پھر یونہی چھوڑ دیا۔ تنہائی اور رنگوں کے اس پس منظر میں وہ مجھے بہت مبہم لگی۔ مٹتی ہوئی بے رنگ سی۔ پہلے تو تم یہ جاننا چاہو گے کہ میں ہوٹل سے بنا نہیں بتائے کیوں آ گئی تھی۔ مجھے کسی سے کچھ کہنے سننے کا وقت ہی نہیں ملا۔ اماں آئیں اور بس گھیر گھار کر مجھے لے گئیں پھر ہنس کر کہنے لگی ہوٹل کا بل ادا کرنے کا بھی مسئلہ تھا انہوں نے وہ بھی دیا۔ تمہیں معلوم ہے اگر وہ نہ آتیں تو میں تم سے مدد کرنے کو کہتی سولہ سو روپیہ تو کجا میرے پاس تو کبھی سولہ روپے بھی نہیں رہے ہتھیلی میں سوراخ ہے جو آتا ہے خرچ کر دیتی ہوں جو کمائی ہوں اُٹھا دیتی ہوں جو تیرے بازوؤں کی سی فطرت ہے میری۔“ اُس نے سگریٹ پاؤں تلے مسل دیا میں اندر سے کانپ گیا بخدا وہ اگر کہتی تو میں مجبور ہو جاتا۔ اب تک مجھے ایک ذرا سی بات کا بھی پتہ نہیں تھا۔ اور اس کے باوجود میں اُس کا حکم ماننے کے علاوہ اور کیا کر سکتا۔ وہ میرے لئے بنا چہرے کے ایک ہیولے کی طرح تھی۔ جو سایوں سے نکل کر ساری جمی جمائی زندگی میں کھنڈت مچا دے۔

اندر سے کسی نے پکارا۔ ”ایڈا۔ ایڈا ابھی کہاں ہو تم؟“ آواز پھٹی پھٹی اور کمزور سی تھی۔

”یہاں ہوں۔“ اُس نے ستون کے ساتھ لگے لگے جواب دیا۔ پھر میری طرف مڑ کر کہنے لگی ”بے بی لوگ ’تم‘ کو اور مجھے اکٹھے دیکھ نہیں سکتے۔ جانے کیا سوچتے ہیں۔ اچھا سمرلنگ میں چلوں وہ ڈنر کس کے لئے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اور تم تو پیتے بھی نہیں ہو۔“ تھوڑی دور گئی مڑ کر آئی اور کہنے لگی میں کل آؤں گی اور تمہارے ساتھ کھانا کھاؤں گی۔ تمہارے ذلیل ہوٹل میں نہیں کہیں باہر چلیں گے۔ کہیں نیم تاریک خاموش سے ریسٹوران میں تصویروں کی ایک نمائش ہو رہی ہے وہ بھی دکھاؤں گی تمہیں۔ اب مجھے خیال آتا ہے تم اس شہر میں نووارد ہو اور میں نے تمہارے ساتھ نہایت سرد مہری کا سلوک کیا ہے۔“ اور وہ بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی۔ کہیں دور گھڑیال نے تین بجائے میں بڑے کمرے کے ساتھ چھوٹے سے کمرے میں صوفے پر نیم خوابیدہ تھا جب دوستوں نے مجھے ڈھونڈا اور ہم واپس ہوئے۔

تصویروں کی نمائش سردیوں کی نیم گرم سہ پہر میں بہت اچھی لگی۔ وہ مجھے لینے آئی تھی دفتر سے۔ سچ ہوں تو رات کے واقع کو بدخوابی سمجھ کر تقریباً بھول چکا تھا اور پھر اُس کا آنا پتہ نہیں کیوں مجھے ان ملاقاتوں میں لگنے لگا تھا کہ وہ جو کچھ ہے اس کے سوا دکھائی دیتی ہے اُس کی شخصیت میں کوئی رخنہ ہے کہیں کوئی کمی ہے یا پھر زیادتی لوگ اُسے پسند کرتے ہیں اس کے باوجود وہ پُراسرار سی ہے۔ بھٹکے ہوئے گیت کی کوئی دھن سیٹی کی طرح بجاتے ہوئے جب میں کمرے میں گھسا ہوں تو وہ پلنگ پر دراز تھی۔ میں دروازے میں پتھر بن کر کھڑا رہ گیا۔

بے بی اُس نے کمبل سر کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔ ”میں صبح سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں۔ رخشندہ کے ہاں سے میں گھر نہیں گئی تھی یہاں آ گئی۔ کمرہ صاف ہو رہا تھا میں نے اُسے باہر نکال دیا۔ رات کی تھکن کو کہیں تو اُتارنا تھا نا۔“ مزے میں خرخر کرتی بلی کی طرح اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔

جی چاہا دیوار سے سر پھوڑ لوں وہ مجھے کیا سمجھتی ہے۔ گھٹی خوار لوفر پیشہ ور عاشق اُس کی اداؤں پر ریجھ جانے والا اُس پر نہیں اپنے پر غصہ آیا۔

غصے کے مارے مجھ سے ایک لفظ نہیں بولا گیا۔ اُس نے پھر آنکھ کی جھری میں سے مجھے دیکھا۔ بھئی کھڑے کیا کر رہے ہو جلدی سے منہ دھو لو کپڑے اگر بدلو تو ٹھیک ہے ورنہ یہی چلیں گے کوئی بُرے نہیں ہیں اچھے اسمارٹ لگ رہے ہو۔

میں نے غسل خانے کے آئینے میں جا کر اپنی شکل دیکھی کیا میں اتنا بیوقوف لگتا ہوں۔ وہیں تپائی پر بیٹھ کر میں نے بوٹ کھولے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس حرکت کو کیا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس کے متعلق کچھ سوچنا بھی ناممکن تھا۔ بیرہ کیا کہے گا ہوٹل کے باقی لوگ کیا کہیں گے۔

”کیوں بھئی کیا خواب دیکھنے لگے ہو نمائش میں جانے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟“ اُس کی سوئی ہوئی آواز سنائی دی۔ ایک دم جاگ کر جیسے میں نے سوچا اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ فوراً باہر چلا جائے۔ باہر جا کر میں اُسے اس حرکت پر بُرا بھلا کہہ سکتا ہوں۔ اپنی شہرت صدہا اور باتیں ہیں وغیرہ وغیرہ۔

”عجیب لڑکے ہو تمہارے پاس روز نہیں ہے کوئی ڈھنگ کی خوشبو نہیں ہے۔ اب کبھی میرے پاس پیسے ہوتے تو یہ سب چیزیں تمہیں تحفتاً دوں گی مجھے دوستوں کو تحفے دینا بہت اچھا لگتا ہے۔ اور پھر تم۔“

باتیں کرتے کرتے اُس نے میری طرف دیکھا میں نے آنکھیں جھکا لیں۔ پرس ٹھیک کرنے لگا اور اُس نے جلد جلد بالوں میں اُوپر سے کنگھی کر کے پرس پکڑا۔ ”بے بی یہ پرس تو خالی ہے“ اُس نے اُسے دوبارہ میرے پلنگ پر پھینک دیا۔

”خالی ہونے کی کوئی بات نہیں تم اسے لیتی چلو۔“ میں نے پرس اُس کے ہاتھ میں ٹھونس دیا۔

بادلِ نخواستہ اُس نے اُسے پکڑ لیا ہم باہر نکلے۔

ٹیکسی میں بھی میں نے اُس سے کوئی بات نہیں کی اصل میں حیرت کے مارے اور کچھ سوچا ہی نہیں جا سکتا تھا لگتا تھا مجھے سکتہ ہو گیا ہے۔ میں نے یہ اُمید کبھی نہیں کی تھی کہ میری ذرا سی بزدلی اُس کی اتنی جسارت کا سبب بن جائے گی۔ یہ تو پیشہ ور کال گرلز کے طریقے ہوئے بلکہ اُس سے بھی کمتر۔ جیسے وہ جال کو میرے گرد تنگ کھینچ رہی ہو جیسے مجھے پھنسانا چاہتی ہو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا۔ میں کوئی رئیس زادہ نہ تھا۔ تنخواہ لیتا جس کا بیشتر حصہ گھر بھجوا دیتا تھا۔ میری ذمہ داریاں تھیں بہن بھائی تھے اماں تھیں میرے لئے انہوں نے بہت دکھ اُٹھائے تھے اس جگہ پہنچانے میں اُن کا حصہ تھا انہوں نے ہی مجھے وہ بنایا تھا جو میں ہوں۔ رنگوں اور شکلوں کے اس میلے میں پہلی بار مجھے اپنے کم علم ہونے کا احساس ہوا لوگ نہایت سنجیدگی سے برش سے تصویروں کو دھیان سے دیکھ رہے تھے اُن کے مطلب سمجھنے میں لگے تھے۔ تجریدی آرٹ یوں بھی کبھی میرے پلے نہیں پڑا۔ اُس کی باریکیاں میں کہاں جان سکتا ہوں۔ ہیلو۔ ہیلو بہت سی آوازیں ایک ساتھ آئیں تمہیں بھی نمائش دیکھنے کی فرصت مل گئی ہے وہ دوستوں کے نرغے میں تھی جان پہچان والے لوگوں کے درمیان۔ میں الگ سے اُن لمبی گیلریوں اور راہداریوں میں پھرنے لگا۔

بولتی ہوئی تصویروں تمہارے آر پار دیکھتی ہوئی نگاہیں چپ چاپ اور بہت کچھ کہتی آنکھوں کا بازار سجا ہوا تھا۔ عجیب و غریب اور بیحد معمول۔ احتیاط سے استعمال کئے ہوئے اور بہائے ہوئے رنگ اندھیرے کا احساس دلاتی ہوئی روشنیاں اور روشنیوں کا نشان بتاتے ہوئے اندھیرے۔

”ادھر آؤ میں تمہیں ایک تصویر دکھاؤں ایک خاص تصویر جو زمانوں سے اس نمائش میں سجتی ہے اور پھر اتار کر رکھ لی جاتی ہے“ وہ میرے برابر چل رہی تھی۔

”اُس تصویر میں کوئی خاص بات ہے کیا کوئی راز؟“ میں آگے چلنے کی کوشش کر رہا تھا اُس سے علیحدہ ہونے کی۔ پتہ نہیں وہ کب تک اپنے آپ کو

مجھ پر مسلط رکھے۔ میں اُس سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔

"بے بی آخر بھاگ کیوں رہے ہو کیا تمھیں اُس تصویر میں دلچسپی نہیں ہے؟

میں اُس کے برابر چلنے لگا۔ ساری ان کہی باتیں میرے دماغ میں گھومتی رہیں۔

یہ ایک جوان ہوتے لڑکے کی شبیہ تھی مجھے تو اس میں کوئی خاص بات نہیں لگی یا پھر مجھے پتہ ہی نہیں چلا وہ خاموش چپ چاپ عبادت کرنے والوں کی طرح سر جھکائے اُس کے سامنے کھڑی رہی میں اگلی تصویر کی طرف بڑھ گیا۔ دیر تک گیلری میں گھومتا رہا۔ سوچا آنکھ بچا کر نکل جاؤں پھر باہر برآمدے میں رُک گیا میں نے اُس سے کچھ نہیں پوچھا۔ بادل گھرے ہوئے تھے سیاہ دھوئیں کی چادروں کی طرح ایسا اندھیرا پھیلا تھا جو خوشی میں دل کے اندر روشنی کر دے جی چاہتا تھا بھاگ جاؤں اور سردی میں سڑک پر ہوا کے رُخ ہوا کے ساتھ اُڑتے لگوں مگر ہم ٹیکسی میں بیٹھے تھے وہ میرے برابر پچھلی سیٹ پر بالکل خاموش تھی۔

"کہاں جانا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"کہیں بھی۔"

"آخر کہیں تو! ٹیکسی والے سے کیا کہوں۔" مجھے پھر غصہ آنے لگا۔

"کسی ریسٹوران میں جہاں چائے مل سکے کھانا مل سکے اور خاموشی ہو۔ کچھ کھائے ہوئے تقریباً چھتیس گھنٹے ہو گئے ہیں۔" وہ پھر مراقبے میں چلی گئی۔ بنا کچھ کہے جیسے میرے وجود سے بے خبر ہو وہ کھانا کھاتی رہی آہستگی سے یادوں میں کھوئی ہوئی اپنے آپ سے باتیں کرتی ہوئی دنیا کو بھولی ہوئی میں کیا اُس کا محافظ تھا؟

تم چائے تو پی سکتے ہو میں نے اپنے آپ سے کہا آخر اس قدر گھمبیرتا کی کیا ضرورت ہے یہ ایسا سانحہ ہے جس پر بعد میں اور لوگوں کے ساتھ تم ہنسو گے بلکہ اب بھی ہنس سکتے ہو اور میں ہنسنے لگا۔

"بڑی بات بڑوں پر نہیں ہنستے۔" اُس نے آنکھیں اُٹھائے بنا کہا چائے پی لو پھر مجھے گھر پہنچا آنا اور تم اپنے ہوٹل جا سکتے ہو۔

باہر نکلے ہیں تو سیاہ رات نے اور سردی نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ "بے بی مجھے اپنا کوٹ دے دو۔" میں جتنا چڑتا تھا وہ مجھے چڑاتی تھی اس لئے اُس کے بے بی کہنے پر میں نے احتجاج کرنا چھوڑ دیا تھا۔ بہت دیر ہم یونہی سڑکوں پر چلتے رہے کئی سرڑیں ہمارے پاس سے گذر گئیں گلیاں زن سے نکلتی چلی جاتیں میرے دانت بج رہے تھے بغلوں میں ہاتھ دینے میں اپنے کو کوس رہا تھا کس مخمصے میں پڑ گیا تھا میں۔

"اوہ اوہ۔ جوتا کاٹ رہا ہے۔" اُس نے پاؤں کو دبانا شروع کیا عین سڑک کے درمیان بیٹھ گئی۔

خدایا میں نے سوچا اب کیا ہو گا۔ "تم جاؤ بے بی میں اب اور نہیں چل سکتی مجھ سے نہیں چلا جاتا۔" یہ عورت جو کہتی تھی کہ پیدل چلنا اُس کی مجبوری ہے سارا دن سائٹ کی تلاش میں مارے مارے پھرنا۔

ہوٹل اب نزدیک تھا تقریباً ایک فرلانگ پرے وہ سارا بوجھ میرے کندھے پر ڈالے تھی بھکاریوں کی طرح ہم قدم قدم رکتے ہوئے ہوئے فاصلہ طے کر رہے تھے۔

لفٹ میں وہ میرے ساتھ ہی سوار ہو گئی۔ کمرے کے دروازے پر میں نے کہا: "اچھا خدا حافظ۔"

مگر مجھ سے پہلے وہ اندر تھی۔ "ایسی سرد رات تو کوئی کسی کتے کو بھی ایسے نہیں دھتکارتا اور تم مجھے خدا حافظ کہہ رہے ہو۔"

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا لگا آنسو میری آنکھوں میں تیزی سے بھر رہے ہیں۔
غسل خانے سے باہر نکل کر اُس نے کہا تم بیچارے مجھے تم پر ترس آتا ہے مشرقی گھروں کے لڑکے بھی لڑکیوں کی طرح شرمیلے ہوتے ہیں۔"
"زمانوں سے میں نے کسی سے بات نہیں کی مطلب ہے اپنی اور شیر علی کی باتیں تم سُننا پسند نہیں کرو گے کیا؟"
سگریٹ کا لمبا سا کش لے کر وہ صوفے پر گھٹنوں کو سکیڑ کر لیٹ گئی۔ مجھے روشنی کا سیدھا آنکھوں میں پڑنا سخت ناپسند ہے۔
مگر میں نے بتی اسی طرح جلنے دی۔
"ٹھیک ہے یہ تمہارا کمرہ ہے اور تم بتی جلائے رکھنے کا حق رکھتے ہو تمہاری مہمان نوازی کا شکریہ۔"
بہت سی گالیاں منہ ہوئیں اور لاشعور میں بھولی بسری زبان پر آتے آتے رہ گئیں اُس گھڑی مجھے لگا جو لوگ گالی دیتے ہیں اُن کا صبر آزمایا جاتا ہوگا
آخر کب تک۔
کیسا معدہ گھے سر رات گرم کرو کافی کا بھاپ اڑاتا پیالہ خراب آگیں فضا ہو جائے دانت پیستے ہوئے میں نے کافی کا آرڈر دیا مرنے والے کی طرح میں
فیصلہ میں کہا پیرو جو بھی سوچے اُسے سوچنے دیا جائے اب کیا علاج ہو سکتا تھا یہ مصیبت بہر حال تو تھی۔
"ہاں تو شیر علی کی کیا کہانی ہے اصلی یا فرضی" میں کمبل لپیٹ کر دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا رات گزارنے کے لئے اپنی طرف سے تیار ہو کر۔
"تم نے یہ کیوں کہا ہے" وہ لیٹے لیٹے ذرا سی آنکھ کھول کر بولی "جب تمہیں یقین ہی نہیں نہ میری ذات پر اور نہ ہی جو میں کہوں اُس پر تو پھر
کیوں سنتے ہو۔"
"رات گزارنے کے لئے اور کیا کیا جائے آخر" میں چاہتا تھا وہ کسی طرح بے عزتی سمجھ کر وہاں سے جائے۔
"بس شیر علی تھا اور نہیں رہا۔ نہ جانے کہاں چلا گیا زمین اُسے نگل گئی یا آسمان نے اُسے اُٹھا لیا میرا منگیتر تھا وہ" ——— پھر تھوڑی دیر
خاموش رہ کر بولی۔ آج جو تصویر تم نے دیکھی وہ اُسی کی تھی۔
مگر اُس کی پینٹنگ وہاں کیسے لگی ہوئی ہے۔ تمہارے پاس کیوں نہیں منگیتر تو وہ تمہارا تھا۔
"وہ بہت اچھا مصور تھا اور بہت بڑا۔"
"تم ماضی کے صیغے میں کیوں بات کر رہی ہو۔ لوگ اِدھر اُدھر چلے جایا کرتے ہیں اور واپس آجاتے ہیں اپنی بے یقینی سی میں میں نے پوچھا کتنے
عرصے کی بات ہے یہ۔"
"دس سال ہو گئے ہیں۔ دس سال اور کچھ مہینے میں اُس کے جانے کی تاریخ سے ایک ایک ساعت گنتی ہوں۔ اب آئے گا تو .... مگر وہ آئے
گا ہی کیوں کہیں کسی اور ملک میں کسی اور دیس میں کسی اور کے بازوؤں میں ہوگا اور میں یہاں برہن بنی اُس کی یاد میں جی رہی ہوں۔ کبھی کبھا دل چاہتا ہے خودکشی
کروں پھر موہوم سی آس مجھے پیچھے ہٹاتی ہے میرے ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔"
سامنے لیٹی اُس عورت کی صداقت اور استقامت اُس کی بہادری یقیناً قابلِ تعریف تھی۔ میں نے بڑی عقیدت کی نظروں سے اُس کی طرف
دیکھا احترام سے میرا سر جھک گیا۔
"وہ آخر کہاں جا سکتا تھا کہاں چلا گیا تمہیں کچھ تو پتہ ہوگا۔"

ایک دن میں اس کے سٹوڈیو گئی مل کر ہم پرانی کتابوں کی کھوج میں نکلنے والے تھے نوادرات جمع کرنے کا خبط تھا۔ گاؤں میں پتہ چلا تھا کسی شخص کے پاس بزرگوں کا کتب خانہ ہے اور وہ اُسے ضائع کر رہا ہے بھلا پرانی عربی فارسی کی کتابیں نئے زمانے میں کس کام کی ہیں۔ متروک ہوئے علوم کو کون پڑھتا ہے کسی کے پاس اتنا وقت کہاں ہے کہ وہ بیٹھے اور انھیں کھنگالے، حاصل بھی کیا ہوتا ہے۔ میں یہ شوق بیکار سمجھتی تھی مگر کہہ نہ سکتی تھی۔ اُسے اور بھی بہت سے شوق تھے عجیب و غریب لوگوں سے ملنا بڑی پُراسرار زندگی! اسی پُراسراریت نے پہلے پہل مجھے اُس کی طرف کھینچا۔ بے بی میں نے اُس کی پرستش کی تھی ہر لحظہ وہ ایک نیا انسان ہوتا تھا بےچین شعلے کی طرح تابناک اور بے حد خوبصورت۔ تم نے اُس کی آنکھیں دیکھی ہیں ایسی خواب لیتی اور پھر بھی جاگتی ہوئی۔ مجھے کبھی کبھی لگتا جیسے میرے خواب مجسم ہو گئے ہوں۔

بہت دیر وہ چپ رہی سامنے پڑی کافی پر ہولے ہولے جھلی سی آ گئی رات اپنے گھنگروؤں اور سازوں سمیت ناچ کر تھکتی جاتی تھی۔

جب میں گئی ہوں تو وہ نہیں تھا۔ میں بیٹھی رہی اندر آتی دھوپ میں تصویروں کی آنکھیں مجھے اپنی طرف گھورتی لگتی تھیں۔ تھک کر میں نے اپنی پسند کے موسیقی کے ریکارڈ بجانے کے لئے گراموفون کا ڈھکنا سرکایا کھا رکھا تھا۔

"ایڈا میرا انتظار نہ کرنا۔ جانے اب کب ہماری ملاقات ہو اور ہو بھی کہ نہیں۔ میری خواہش ہے۔ تم زندگی کے دل میں رسو بسو اور سکھی رہو۔"

اُس نے آنکھیں بند کر لیں کمبل کو سر پہ کھینچ لیا جیسے دنیا کے دروازے اپنے پر بند کر لئے ہوں۔

میں نے بتی بجھا دی اور بستر پر چلا گیا۔ جاگتا اور سوچتا رہا کہ دل پتہ نہیں کیا شے ہے یہ ٹکڑا خدا نے آدمی کے سینے میں اُسے بے پناہ اذیت دینے کے لئے آخر کیوں لگایا ہے؟

رات کے پچھلے پہر میری آنکھ ایک دم کھل گئی جیسے نیند کی چادر کو کسی نے زبردستی کھینچ لیا ہو وہ میرے پہلو سے لگی تھر تھر کانپ رہی تھی "بے بی مجھے اکیلے سونے کی عادت نہیں اس نے زیر لب کہا ذرا پرے ہٹو تھوڑی سی جگہ دو۔ میں تڑپ کر اُٹھا تو بجلی کی سی تیزی سے اُس نے مجھے گھسیٹ لیا دفتر جانے کے لئے تیار ہُوا ہوں تو ہاتھ کانپ رہے تھے ٹائی کی گرہ ٹھیک نہیں بندھ رہی تھی آئینے میں اپنے آپ کو دیکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ عجیب کیفیت تھی اپنے وجود سے شرم آ رہی تھی برہنگی کا احساس تھا اور رگوں میں خون سن سن کر کے سر کی طرف دوڑتا تھا سوچتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا۔ پکڑا رہے تھے اور ہر لحظہ یہ احساس ہوتا تھا کہ میں گر جاؤں گا وہ بے سُدھ سو رہی تھی میں کمرے سے جلد سے جلد نکل جانا چاہتا تھا بھاگ جانا چاہتا تھا۔

کلرک اور لوگوں کے ساتھ مصروف تھا میں چابی کا گچھا آنکھ بچا کر باہر آ گیا۔ دفتر فون کر کے کہ میں ضروری کام سے جا رہا ہوں اسٹیشن چلا آیا۔ اسٹیشن سے میں نے ہوٹل فون کیا سامان میرے دفتر کے پتے پر بھجوا دیا جائے اور ایسی ضروری ہدایات دیں۔ دن کی روشنی پھیکی اور بے کیف تھی۔ بہن بھائیوں کی محبت شفقت ماں کی دلداری نے مجھے اپنے ضلع کر لے میں مدد دی پندرہ دن کے بعد میں واپس آیا اور مستقل اپنے دفتر کے ایک کمرے میں رہنے لگا۔ زلزلے کے بعد کی حالت کو درست کرنے میں بھی کافی دن لگ گئے۔ میں اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگا تھا سڑکوں پر نکلتے ہوئے گھبراتا تھا مبادا وہ کہیں دکھائی دے جائے۔ مجھے پکڑ لے میرے ساتھ لگ جائے۔ سب سے زیادہ مصیبت تو یہ تھی کہ کسی سے بات کر کے میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا نہیں کر سکا تھا۔ بخار کی طرح یہ خیال مجھے پکڑے رکھتا۔ دوست کہتے نہ کوئی کام کرتے ہو نہ سوچتے ہو شاید ہو گیا ہے تمہیں۔ میں ہنس کر چپ ہو رہتا۔

منیر نے ایک دن مجھے پکڑ لیا۔ "سچ سچ بتاؤ کیا اٹھا ہے گم شدہ ہو گئے ہو زخمی ہو گیا؟ کب سے عشق کر رہے ہو۔ ہمیں بتاؤ نا۔ دوستوں سے

اتنی پردہ داری ٹھیک نہیں آدمی کیسے اکیلے یہ سب برداشت نہیں کر سکتا - بوجھ کو بانٹ اور ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں یقین کرو ہم تمھیں بُرا بھلا نہیں کہیں گے -

میں نے اسے ایڈا کا بتایا رک رک کر ٹھہر ٹھہر کر جیسے گرنے سے بچ رہا ہوں -

وہ سر کپڑ کر وہ بیٹھ گیا " تو تم اُتنے ہی اُس دیوانی عورت کی مٹھی میں آ گئے " اور یہیں تم نے ہمارا تک نہ لگنے دی - اس سارے معاملے تم کو اُس نے پھانس لیا شکل سے تو اتنے بیوقوف نہیں لگتے گر ہو سہی نا تجربہ کار ہو نا - اور تم اندر کیوں گھسے رہتے ہو ساتھ چلا کرو اکیلا پن تو اچھے بھلے سوچنے والے کو دیوانہ بنا دیتا ہے -

ہم ایک نئے ریستوران میں بیٹھے تھے جو اُس ہوٹل کے بیس منٹ میں تھا - صرف کنوارے لوگوں کو اُس میں داخلے کی اجازت تھی - آرکسٹرا بج رہا تھا - لڑکے اور لڑکیاں نیم تاریکی میں قدم سے قدم اور چہرے سے چہرہ ملائے پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ ایک جسم کہاں سے شروع ہوتا ہے اور دوسرا کہاں ختم - پھر کسی نے اشارہ دیا موسیقی کی دھن بدل گئی سازہوئے ہوئے دھیمے سروں میں کوئی نہایت پرانی گت بجانے لگے تیز تھرکتے ہوئے جسموں کے تال دیتے پاؤں بھی ان لہروں پر جیسے بہتے ہوئے ہیں چھوٹا سا ہال ایک آہستہ رَو ندی کی طرح تھا طوفان اور جوش کے بنا -

منیر نے کہا میں بھی ناچنا چاہتا ہوں اور وہ اُٹھ کر چلا گیا کسی ساتھی کی تلاش میں -

ہیلو ہے بی کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ دھرا زمانوں کے بعد دکھائی دیئے ہو کہاں چلے گئے تھے اور میں تمھیں ہر جگہ تلاش کیا - ہر جگہ تمہارے دفتر میں اور یہ تمہاری امانت ہے میں اسے لوٹانا چاہتی تھی -

سفید رسٹ واچ مدھم روشنی میں میز پر پڑی اُس کے اور میرے درمیان گزرے اور آنے والے وقت کا نشان بنی چمکتی رہی -

اتنی بہت سی باتیں تم سے کہنا تھیں مگر تم بولتے ہی نہیں ہو خیر خیر بے بی شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے آدمی تجربات میں سے گذرتا ہی ہے

" شٹ اَپ " - میں نے نہایت آہستگی سے کہا میں تمھیں دیکھنا نہیں چاہتا " چلی جاؤ یہاں سے ایک دم "

" بہت خفا معلوم ہوتے ہو " اور وہ میز پر سر رکھے رونے لگی زور زور سے جیسے اُس کا سب کچھ کہیں لُٹ گیا ہو - میں نے اُس کی بےعزتی کی ہو - اور میں رو بھی نہیں سکتا تھا -

ہاتھ بڑھا کر اُس نے کہا خدا کے لئے ایک لارج جن کا آرڈر دو ورنہ میں یہیں ڈھے جاؤں گی تھکن کے مارے شرم کے مارے "

منیر اُس ہلکورے لیتے گرداب میں جانے کہاں تھا اور میرے لئے نجات کی ساری راہیں بند تھیں -

اپنا گلاس بھرنے کے لئے اُس نے ہاتھ اُٹھایا تو نقاہت کی وجہ سے کانپ رہا تھا - بہت بڑی ایکٹریس ہے یہ خاتون اور میں تو اب مکمل جہنم واصل ہو گیا ہوں " تم اُس رات سے ایک دن بھی زیادہ عمر کے نہیں ہوئے " وہ ذرا ہنسی - اس کے پیسے میں خود ادا کروں گی سُنا تم نے آج کل مجھے ایک بہت عمدہ سا کام مل گیا ہے - اور کام بھی کیا ہے میری ایک بہت سویٹ دوست ہیں اُس کے انکل کو پتہ نہیں کیوں حکومت نے کسی کی مخبری پر جیل میں بند کر رکھا ہے بس اُن سے ملاقات کے لئے ہر ہفتے جاتی ہوں - اتنی دولت کے مالک ہونے پر بھی وہ بے حد سیدھے اور پیارے آدمی ہیں کہتے ہیں جب خدا کو منظور ہو گا انھیں رہا کر دیا جائے گا - اُس کی ذات پر اتنا بے حد یقین ہے انھیں - بیٹے دور دراز ملکوں میں ہیں - بہت پھیلا ہوا کاروبار ہے - فرصت نہیں ہوتی کہ باپ سے مل سکیں - میں جاتی ہوں تو خوش ہو جاتے ہیں - چھوٹی چھوٹی ادھر اُدھر کی باتیں پوچھتے رہتے ہیں - جی چاہتا ہے کوشش کر کے انھیں جیل سے باہر نکال لائے مگر وہ مانتے ہی نہیں کہتے ہیں ابھی وقت نہیں آیا اور اُن کا وہیں رہنا ٹھیک

ہے ۔ ایک بار ملاقات کے مجھے تقریباً پانچ سو روپے ملتے ہیں ۔ سرحد کی جھیل میں ہیں اوہ ۔ اور مجھے ہوائی جہاز سے یہ سفر کرنا پڑتا ہے ۔
ایک کے بعد دوسرا گلاس ختم کر کے اُس نے کہا " بے بی مت سمجھنا میں ہر روز پیتی ہوں بس کبھی کبھار ، اور وہ بھی بہکتی نہیں ہوں سمجھے " جب میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو کہنے لگی ناچو گے ؟ پھر خود ہی کہنے لگی تمہیں ناچنا کہاں آتا ہوگا ۔ آؤ میں تمہیں سکھاؤں " وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگی ۔ میں نے زور سے چھڑایا تو وہ پورے قد سے پیچھے گر گئی ۔

شرمندہ ہو کر میں جلدی سے جھکا کہ اُسے اُٹھاؤں مگر وہ بے ہوش تھی یا پھر مدہوش ۔ بیرے بھاگتے ہوئے آئے ۔ منیر بھی کہیں سے آکر میرے برابر کھڑا ہو گیا ۔

" ایڈا اُٹھو ۔ یہ تم ہمارے دوست کو چک پھیریاں کیوں دے رہی ہو بھائی ۔ اُسے تنابِ آسراحت سمجھو "

" اوہ منیر تم ہو ۔ " وہ کرسی کا سہارا لے کر اُٹھی ۔

" ہاں یہ میں ہی ہوں ۔ زمانے ہو گئے تم سے ملاقات ہی نہیں ہو سکی " منیر نے ہاتھ سینے پر باندھ لئے ۔

" کل رات میں ایک دعوت دے رہی ہوں تمہیں پتہ ہے ۔ " اُس نے بوتل اپنی طرف کر لی ۔

منیر نے کہا " میں اور عاصم کل موجود ہوں گے میرے خیال میں یہ بھی عاصم ہی ہوگا "

ایڈا نے جیسے سُنا ہی نہ ہو اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا ۔

اُس غار کی سیڑھیاں طے کر کے ہم آئے ہیں تو چاند کہیں بادلوں کی اوٹ سے نکلا تھا اور بھیگی ہوئی ہوا میں نمی نہیں خوشگواری تھی زرد کرنوں کے جال میں بندھے ہوا کے جھیپے اُڑے جا رہے تھے ۔

" چوتھی سڑک ہے چوراہے سے سیدھے ہاتھ اور گولڈ ویو گھر کے باہر لکھا ہے " اُس نے چیخ کر ہمارے پیچھے کہا ۔

" تو کیا تم سنجیدگی سے اُس کی دعوت میں جانے کا ارادہ رکھتے ہو واقعی " میں نے حیران ہو کر پوچھا ۔

" ایک اچھی دعوت کو رد کرنا کور ذوقی ہے عاصم " منیر نے میرے کندھے پر ہاتھ دھرا ۔

یہ ایسا گھر تھا جس کا خواب دیکھنا بھی مشکل ہے اپنی رونقوں اور شان و شوکت کی وجہ سے پرانے زمانے کے نوابوں کے محلوں سے کسی طرح کم نہیں باوردی بیرے بے آواز قدموں سے چلتے ہوئے ۔ دبے دبے رنگوں اور عمدہ طور طریقے سے سجائے ہوئے اس محل میں ایڈا کے وجود ہونے کا تو ہم سوچ ہی نہیں سکتے تھے مگر ہمیں جس خاتون نے خوش آمدید کہا وہ سفید بالوں اور عمدہ خد و خال والی بہت ہی مہذب ملکہ کی سی شان والی تھی ۔ " آئیے آئیے آپ ایڈا کے دوست ہیں نا "

بہت لوگ نہیں تھے مگر خاصا اچھا مجمع تھا ۔ ایڈا کا ایک انکل تھا جو بار بار رومال پہ ناک صاف کرتا اور پھر اُسے جیب میں ڈالتا تھا ۔ وہی رومال نکال کر ہاتھوں میں گولا بناتا تھا اور اپنے گلاس پر جھکا ہوا تھا ۔ ایک خاتون تھی جو مسلسل گفتگو کرتی تھی اور چڑیا کی طرح پھدک کر کبھی ایک کے پاس جاتی اور کبھی دوسرے کے پاس لگتا تھا اُسے انگریزی بولنے کا بہت شوق ہے گھڑی گھڑی YOU SEE کہتی ۔ ہاتھ ہلا کر اپنا مطلب سمجھاتی اور جام رکھ کر اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتی تھی ۔ جن میں سیاہی اور سرخی کا لہریا روشنی پڑ کر چمک اُٹھتا تھا ۔ کچھ لمبے بالوں والے ادھیڑ عمر لڑکے تھے سیاہ عینک لگاتے جیسے فلموں کا ہیرو ہو نہایت اسمارٹ ایک شخص تھا جس کے بہت ہی کم ملنے کے باوجود لگتا تھا اگر وہ ملا تو بھینس کی طرح

کرسی کو توڑ دے گا اور یہ شیشہ و جام ہاتھ مار کر بکھیر دے گا۔

ایڈا نے نہایت ڈھیلی چولی پہنی تھی جس کا گلا بہت نیچا تھا کر سے کھلے حصے پر پوڈر کی تہ صاف نظر آ رہی تھی وہ بہت مضطرب تھی اور اُس کی ساڑھی کا پلو گھڑی گھڑی گر رہا تھا۔ میک اَپ کی وجہ سے کم عمر نظر آتی تھی اور بالوں کے رنگ میں سیاہی نے اُس کو دس سال پیچھے کر دیا تھا۔ وہ انکل کے ارد گرد منڈلاتی پھرتی تھی مسکراہٹ سے اُسے رجھاتی ہوئی جیسے بس اُسے دیکھ کر ہنسنے کے علاوہ کوئی کام نہ ہو۔

مَیں اور منیر شام سے ایک کونے میں بیٹھے تھے ہمارے ساتھ بیٹھی خاتون کے ترشے بالوں میں مصنوعی لہریئے تھے جو بھیگتی رات کے ساتھ ساتھ اور دلفریب لگنے لگے تھے۔ اُس کا دہانہ چھوٹا اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ وہ اپنے دنیا کے سفر کا قصہ سنائے چلی جا رہی تھی جب میں پیرس میں تھی جب میں ہانگ کانگ میں تھی۔ منیر مفت کی شراب کو بڑی بے دردی سے لنڈھا رہا تھا اور مجھے ایڈا کی نقل میں بے بی کہہ رہا تھا وہ تو کب سے بہک رہا تھا اور ہم سے دور اُدھر ایک جوڑے میں بہت دلچسپی لینے لگا تھا۔ ابھی تک سب لوگ ذرا لئے دیئے تھے۔ اپنے کو سنبھالے ہوئے۔ انکل نے ایڈا سے کہا "میوزک کا بندوبست کیوں نہیں ہے"۔ اُس کی آواز میں جھگڑا کرنے والے کی سی تلخی تھی ایک نہایت بیہودہ قسم کا گانے والا بلایا۔ اس کا ساز درست نہیں تھا جیسے آؤٹ آف ٹیون ہو طبلہ نواز بیمار تھا اور کھانس رہا تھا۔ طے یہ ہوا کہ محفل میں ہر کوئی گائے۔ جس کو گانا آتا ہی نہ ہو وہ بھی کوشش کرے۔ انکل نے سب سے پہلے اپنے آپ کو پیش کیا۔ وہ بے ہنگم پھٹی ہوئی آواز میں گانے لگا تو چپ ہی نہیں ہوتا تھا۔ منیر اب اپنے قصے سنانے لگا تھا اور گانا سُن نہیں رہا تھا۔ "اگر تم سُننا نہیں چاہتے ہو تو نکل جاؤ۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا اور آدمی کو کالر سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں جھگڑا زیادہ نہ بڑھ جائے۔ ایڈا کبھی ایک کے آگے ہاتھ جوڑتی کبھی دوسرے سے کہتی "میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں منیر ساری فضا خراب نہ کرو۔

میں نے بہت مشکل سے منیر کو چپ کر دیا پھر وہ اُس مرد سے اُلجھ پڑا "آؤ ہو نی آخر ہم سے بھی بات ہو سکتی ہے"۔ اس نے بہت خوب صورت بالوں اور میکسی پہنے خاتون سے کہا "آپ کو شاید محفل کے آداب نہیں آتے"۔ اُس کے ساتھی نے منیر سے کہا۔

"آداب کس چڑیا کا نام ہے؟" اُس نے خالص غنڈوں والے انداز میں جواب دیا اور اُس عورت کو بازو سے پکڑ لیا۔

"بے بی تم منیر کو سنبھال نہیں سکتے"۔ ایڈا نے منت کی۔

"تم اب میرے دوست کو مزید اپنے مطلب کے لئے نہیں برتو گی"۔ منیر جلدی سے میری طرف آیا "یہ تم اس کے کان میں کیوں بات کہہ رہی ہو"۔ میزبان کی حمایت میں آدمی منیر کو ڈانٹنے لگے بات بڑھ گئی۔

ایڈا نے کہا "منیر تم کیا کرنا چاہتے ہو سنبھلو ہوش میں آؤ مجھے شبنم کے یہاں ہونے کا بالکل پتہ نہیں تھا"۔

میں نے کہا "یہ تم اتنے جھگڑالو کیوں بنے ہوئے ہو"۔

"میں اس کی بے عزتی کرنا چاہتا ہوں۔ میں اُس کی محفل درہم برہم کرنا چاہتا ہوں"۔

"یہ تو تم ویسے بھی کر سکتے تھے۔ مگر تمہاری ایپی ڈگنٹی۔ اُس کا عورت ہونا۔ گھر والے میزبان۔ انکل میری بات کاٹ کر اُس نے کہا تم اس

حرافہ کو عورت کہتے ہو۔ یہ کون سی شریف گھردار عورت ہے اور یہ انکل وغیرہ بھی فراڈ ہی ہوں گے۔ تم زیادہ تلخ کیوں ہوتے ہو؟"

ایڈا نے کہا۔ "میزبانوں کا کچھ خیال کرو۔ جس بڈھے آدمی کو تم نے کالر سے پکڑا تھا وہ گھر کے مالک کا خاص الخاص مہمان ہے تم پہلے تو کبھی یوں نہیں بہکے نہایت تمیز دار مشہور رہو۔"

تیمینا اور اس کا ساتھی کہیں غائب ہو گئے تھے۔ کھانے پر بھی بہت کم لوگ نظر آئے۔ کچھ صوفوں پر نیم خوابیدہ تھے صرف ایڈا لوگوں کا خدا حافظ کرتی پھر رہی تھی۔ کمروں کی لمبی قطار اندھیری تھی اور راہداری میں کوئی روشنی نہ تھی۔ ہم باہر نکلے ہیں تو چاند کا ایک کونہ ریت میں دبے سکے کی طرح آسماں کے کونے پر چمک رہا تھا۔

"خوب ڈنگا کیا۔ زیادہ ہی پی گئے تھے تم" میں نے سیدھی سڑک پر آ کر کہا۔

"کون پیئے ہوئے تھا؟ میں تو سارے جام پاس پڑے گلدان میں گراتا گیا۔" منیر کی ہنسی میں شرابیوں والی ٹھک نہ تھی۔

"کیوں آخر کیوں؟ اور پھر دعوت میں جانے کا کیا فائدہ ہوا یہ ساری شام بلکہ رات برباد گئی۔" پچھلے پہر کا چاند بھی ڈوبنے والا تھا۔ تاروں کی ضیا پھیکی پھیکی تھی سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔

"کسی کیوں کا بھی جواب نہیں دیا جا سکتا یونہی کبھی کبھار آدمی کو ماضی بہت پریشان کر دیتا ہے اور اپنے اندر کی بے چینی اسے نہایت مضحکہ خیز حرکتیں کرنے پر مجبور کرتی ہے۔"

منیر آیا۔ "چلتے ہو ذرا ایک جگہ جانا ہے اس دن کی طرح تمہاری شام غارت نہیں جائے گی۔"

"وہ کئی دنوں کے بعد ملا تھا میں نے اس کی غیر حاضری میں خوب لمبی نظمیں لکھی تھیں اور خوش تھا اپنے سے مطمئن آدمی تو جہنم میں جانے سے بھی ڈرتا نہیں۔"

"جوتے ذرا چلنے والے پہننا گلیوں میں سے ہو کر گذرنا پڑے گا۔"

"آج کی مہم کو کیا نام دیا جا سکتا ہے" میں نے تسمے باندھتے ہوئے پوچھا۔

"ذرا نوادرات دکھلانے لے جا رہا ہوں تمہیں اندرونِ شہر کی زیارت کرنا چاہو گے کیا؟" منیر سیٹی بجاتا ہوا آگے آگے چلا۔

تنگ گھیرن گنجان بازاروں اونچی اور تاریک عمارتوں پیچ در پیچ راستوں سے ہوتے ہوئے ہم بہت دیر میں پہنچے۔ گھر کا دروازہ پرانا تھا اور ڈیوڑھی میں کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا گھنٹی بجا کر خاموش کھڑے رہے پھر گھنٹی بجائی منیر نے باہر نکل کر گلی میں جھانکا آس پاس کے مکانوں میں کئی سر دکھائی دیتے۔ اندھیرے میں بتی جلی جو بیمار دکھائی دیتی تھی "بیٹھے منیر تم ہو اندر آ جاؤ۔"

پھر میں اور منیر ایک اور ڈیوڑھی میں سے گزر کر صحن میں گئے۔ ایک دم کشادگی کا احساس ہوا۔ گملوں میں رنگ برنگ پھول تھے سلیقے سے کیاریوں میں موتیا اور بیلا کی ترشی ہوئی جھاڑیاں کھڑی تھیں ایک انار کا درخت تھا جس میں کلیاں آئی ہوئی تھیں اور پھر قطار اندر قطار نا کہ اور آڑو کے پیڑ تھے۔ طوطا اور مینا اپنے پنجروں میں بہت بیتاب ہو کر ایک دم بولنے لگے۔ "کون ہے کون ہے۔"

کسی دالان میں کتا بھونکا۔

"کنگ پیڑ ابھی تک کسی کو نہیں پہچانتا اماں" سامنے کھڑی خاتون کی طرف بڑھتے ہوئے منیر نے کہا۔

یں وایں آنگن میں کھڑا تھا۔

"آؤ بیٹے تم بھی آؤ"۔ اماں بولیں" جیسے منیر ویسے تم"۔

جس کمرے میں ہم بٹھائے گئے اس کی کھڑکیاں اونچی اور بڑی بڑی تھیں گلی میں سے ہوا مسلسل آ رہی تھی دیوان قاعدے سے بچھائے ہوئے اور ستھرے تھے اور گاؤتکیوں پر غلاف خوب کسے ہوئے تھے اس روشن کمرے میں بیٹھے ہوئے نیم تاریک ڈیوڑھی اور بیمار روشنی کسی اور گھر کی بات لگتی تھی۔

"چائے پیو گے یا پان کھاؤ گے"۔ انہوں نے تخت پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اگر ممکن ہو تو دونوں"۔ منیر نے ادھر اُدھر دیکھا غور اور تجسس سے۔

"جمال کی تصویر دیکھ رہے ہو گے۔ مجھ سے ٹوٹ گئی۔ فریم ایک دم شیشے سمیت کرچیں ہی ہو گیا۔ ایسا تو میرے پاس کوئی نہیں نا جو بنوا کر لا دے۔ جگہ خالی بُری لگتی ہے خود مجھے بھی اور دن ہوتے تو وہم سے میرا جی ہول جاتا مگر اب تو میں وہموں میں نہیں پڑتی۔ اُن سے کیا ہوتا ہے اُلٹا کرچیں تکلیف دیتی ہیں۔ یہاں اتنا سُونا ہو گیا ہے۔" پتہ نہیں اُن کا اشارہ کس طرف تھا؟

میں دھوپ کو دیواروں سے اُترتے اور نیچے صحن میں آتے دیکھتا رہا روشنی کا دھارا جو آبشار کی طرح اونچی چھتوں کے درمیان بہہ رہا تھا۔

"پان نہیں کھاتے بیٹے تم"۔ اماں اب میری طرف مخاطب تھیں" لے لو نا پسند کرو گے"۔

"ہاں بھئی اماں کے ہاتھ کا پان تم واقعی پسند کرو گے"۔ منیر نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ چائے پی کر بھی ہم بیٹھے رہے میں حیران تھا کہ منیر تو مجھے نوادرات دکھانے لایا تھا۔

"اماں یہ میرے نہایت عزیز دوست ہیں"۔ اُس نے انھیں بہت دیر خاموش پا کر کہا۔ انہوں نے سر اوپر اُٹھایا۔

"بیٹا تم اپنی سعادت مندی کی وجہ سے شاید میری مصیبت کو سمجھ سکو۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے تمہیں بُلایا ہے تم میری مدد نہیں کرو گے تو کوئی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا"۔ جانے وہ کس کی بات کر رہی تھیں؟

"اماں اُسے سمجھانا اب تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ فاصلے بہت ہو گئے ہیں"۔ منیر نے جواب دیا۔

"میرے لیے تم ایک کوشش اور کر دیکھو وہ اپنا سامان لے گئی ہے اور کہیں مشرقِ وسطیٰ میں یا جانے کہاں جانے والی ہے"۔

"یہ کب کی بات ہے؟" منیر فکر مند ہو گیا۔

"ایک ہفتہ پہلے یہی دن تھا دوپہر کو آئی اور اپنا سارا سامان کتابیں، تصویریں پُرانے جوتے تک سب کچھ سمیٹ کر چلی گئی۔ ڈیوڑھی میں جاتے ہوئے کہنے لگی" اچھا اماں اب حشر میں ملاقات ہو گی یا نہ بھی ہو تو آپ کو کیا غم"۔ دروازہ دھڑ سے بند کیا اور بس۔ اتنا بڑا اُجاڑ گھر تھیں تو تھے میں نے سب بچوں کو اس آفت ماری کی وجہ سے الگ کر دیا ہے۔ کوئی آتا نہیں جاتا نہیں گھر میں اکیلی پڑی ہوں۔ اگر ممکن ہو تو اُسے روکو۔ تم سے کچھ دبتی ہے وہ"۔

"اماں میں آپ سے کیسے کہوں وہ پہلی سی بات نہیں بلکہ کوئی بات ہی نہیں میرا اُس پر کوئی دباؤ نہیں اُسے تو ملے ہوئے بھی زمانے ہو گئے ہیں۔ تھوڑے دن ہوئے۔ وہ ایک دعوت میں ملاقات ہوئی تھی"۔ پتہ نہیں وہ کس خاتون کی بات کر رہا تھا، میکسی پہنے اور ڈھیروں میک اپ کئے اُس لڑکی کی جس کا اُس نے ہاتھ پکڑا تھا یا پھر کسی اور کی۔ میرا دماغ اُس رات کی دعوت اور اُس کی بدمزگی کی طرف گیا۔ سب عورتیں لڑکیاں لگتی ہیں آجکل تو کسی کی عمر کا

پتہ نہیں پیتا مصنوعی پلکیں لگائے۔ مصنوعی جوڑوں کے طومار باندھے ہر خاتون COSEMETIC کی کسی کمپنی کا اشتہار لگتی ہے۔ میزبان خاتون منیر تو اس کو پہلے نہیں جانتا تھا ناممکن۔ چڑیا کی طرح پھدکنے اور انگریزی بولنے والی کوئی سوال ہی نہیں۔ اپنے سفر کے قصے سنانے والی ہرگز نہیں اور ایڈا ایڈا تو بالکل ہی نہیں۔ اس ماحول سے نکل کر بھی تھوڑا سا رشتہ تو آخر محسوس ہونا ناکچھ مناسبت۔ کوئی تعلق۔ ایڈا تو مجھے بے جڑ کی پانی میں زندہ رہنے والی بیل لگتی جیسے کسی سے نسبت ہی نہیں ہو سکتی۔

پچھلے سال مجھ سے ذرا سی بات پہ اختلاف ہوا بس گم ہو گئی دونوں رشتے کے ایک بھتیجے کو ادھر اُدھر دوڑایا پتہ چلا ہوٹل میں رہ رہی ہے۔ ملنے گئی تو دھتکار دیا جانے کون کون لوگ جمع تھے میں نے کہا گھر چلو تو دھمکایا اگر پھر یہاں آئیں تو دھکے دلواؤں گی بیروں سے۔" ایسی بے عزتی پر بھی نہ میرے آنسو نکلے اور نہ ہی میں نے دل بُرا کیا پھر خدا نے میری مدد کی اُس کے پاس پیسے ختم ہو گئے تھے سولہ سو روپے کا بل تھا وہ میں نے چکایا اور اُسے گھر لائی۔ تم ہی بتاؤ یہ گھر کیا بُرا ہے میں آنے جانے پہ کوئی پابندی اُس کے نہیں رکھتی۔ گھر نہ آئے راتوں غائب رہے تب بھی کچھ نہیں کہتی۔ ہر طرح کا آرام مہیا کرنے میں لگی رہتی ہوں مگر اُسے تو جیسے اس گھر سے چڑ ہو گئی ہے۔

وہ ذرا کی ذرا رکیں۔ میں نے سوچا تعجب ہے اس پُر سکون آرام دہ ماحول سے وہ اس قدر مختلف ہے یہ گھر تو خاصا خوب صورت تھا پُر شکوہ سا مغلوں کے دور کی یادگار حویلی۔

اماں جن لوگوں کے ساتھ اب اُس کی دوستی ہے اور جہاں ہر کوئی اس کا انکل اور ہر عورت اُس کی دوست ہے پتہ نہیں وہ کیسے ہیں۔ میرا خیال ہے انہی کے ساتھ جا رہی ہو گی۔ منیر نے کہنے کو کہا۔

"بیٹے لوگ کسی پہ یونہی بے فائدہ جان نہیں لگاتے کوئی ایک پائی بھی فالتو خرچ نہیں کرتا۔ میں کہتی ہوں کسی مصیبت میں نہ پھنس جائے۔"

ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھیں۔

"جب پہلے پہل اس کی حالت خراب ہوئی ہے اور یہ ہسپتال گئی ہے تو میں نے صدقے دیئے خیراتیں کیں۔ آدھی آدھی رات کو دعائیں کیں خدا سے گڑگڑا کر رو رو کر اپنی خطاؤں کی معافی مانگی۔ پتہ نہیں میرے کن کرموں کا پھل ملا ہے کہ یہ خراب سے خراب حالت میں ہوتی چلی جاتی ہے۔"

"دیوانی بھی نہیں اور پھر بھی دیوانی ہے کیا کروں بیٹے۔" وہ رونے لگیں ـــ آنسو اتنے گدلے لگ رہے تھے اتنے میلے جیسے دل پہ غبار کا ڈھیر ہو۔

"روئیں نہیں اماں میں اپنی سی کوشش کروں گا۔ ظاہری ٹیپ ٹاپ شان و شوکت موٹریں، کوٹھیاں آج کل کی گریٹ زندگی کی تو وہ سدا سے شیدائی رہی ہے اور اُس کی تلاش میں بھی ہے۔ اب ایسے لوگ اُسے ملے ہیں جن کے نوابی ٹھاٹھ اور بے حد رکھ رکھاؤ ہے وہ سمجھ تو نہیں سکتی۔ میرے خیال میں ابھی تو نہیں۔ کچھ ہو ٹھوکر لگے دھتکاری جائے تب اُسے ہوش آ سکتا ہے۔ مگر اپنی جگہ ہر طرح نکال لینے میں اُس کا جواب نہیں۔" منیر نے نہایت بے چینی سے پہلو بدلا۔

پان کی گلوری بنا کر دیتے ہوئے کہنے لگیں۔

"مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے اس پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ اتنی فرمانبردار اتنی نرم مزاج تھی بچپن میں۔ عاطف اور زاہدہ کو بھی گئے ہوئے زمانے ہو گئے ہیں وہ لوگ وہیں جم گئے ہیں واپس آنے کا ارادہ نہیں رکھتے جلال نے امریکہ میں شادی کر لی ہے رشتہ داروں کی باتوں سے عاجز

آگرمیں نے انہیں منا چھوڑ دیا ہے۔ تنہا پڑی رہتی ہوں اور اب تو یہ عالم ہو گیا ہے کہ کوئی آتا ہے تو لوگ کھڑکیوں سے جھانکتے ہیں اور اس گھر کی شان کے سامنے بڑے بڑے دم نہیں مار سکتے تھے۔ اپنے سامنے ہی زندگی کا قصر ڈھے رہا ہے اور میں کچھ کر نہیں سکتی کسی سے فریاد نہیں کسی سے مدد کی اُمید نہیں۔

واپس آتے ہوئے منیر نے کہا "ایک بات کا تو میں بھی اعتراف کرتا ہوں ایڈا میں بے پناہ طاقت ہے لوگوں کو گھیرنے اُن کے دل میں گھسنے کی ایک عجیب قوت ہے اس کے اندر جس کو جی چاہے پھانس لیتی ہے جس کا ساتھ جی چاہے چھوڑ دیتی ہے۔ لگتا ہے اُس کے اندر پھٹتے پھوٹ رہے ہیں کسی پُراسرار قوت کے اب مجھے ہی دیکھو شینا سے ملایا اور پھر جب ہماری محبت اُس کے سامنے پروان چڑھی تو اُس نے ہمیں جدا کر دیا۔ دیکھا تھا تم نے اس دن شینا یوں تھی جیسے اُس کا میرا کبھی ساتھ ہی نہ رہا ہو مجھے پہچان ہی نہیں رہی تھی۔

خاموشی سے ہم گلیاں اور سڑکیں طے کرتے ہوئے باہر آ گئے۔

"ہو سکتا ہے وہ دو دلوں کو محبت کرتے دیکھ ہی نہ سکتی ہو۔ کبھی کبھار یوں بھی ہوتا ہے" بہت دیر بعد میں نے کہا۔

"نہیں" منیر بولا "جب میں اور شینا ملتے تھے تو وہی ہمارے لئے مواقع فراہم کرتی تھی اصل میں یہ پودا اس کا لگایا ہوا تھا پہلے پہل جب میں ایڈا سے ملا ہوں تو بہت متاثر ہوا تھا۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں جیسے خواب لیتی جھیلیں ہوں بہت شفاف تھیں۔ باتیں کرنے کا ایک مخصوص انداز اور سر ہلا کر چپ ہو جانے کی ادا میں اس پہ فدا ہو گیا تھا" وہ پھر ماضی کی یادوں میں کھو گیا۔

شینا نے اُن دنوں یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ اُس جلال اور شکوہ سے بہت مرعوب تھی۔ سنی ہوئی داستانوں اور آزادی کی فضا میں جیسے پھول چاندنی لگنے سے کھلے وہ بھی روز بروز زیادہ حسین اور شوخ ہوتی گئی میرا وہاں آخری سال تھا جلسے جلوسوں کی فضا تھی دھواں دھواں سی۔ ہم لوگوں کو پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے جو بات کہتا اُسی کی بات جی کو لگنے لگتی دھڑے بندیاں سیاست قوت کا نیا احساس اپنے کچھ ہونے کا اپنے وجود کا میں بھی سٹوڈنٹ لیڈر تھا اور ایڈا بھی شینا اور مجھے بچہ سمجھ کر اپنی حفاظت میں لے لیا اس نے۔

کہنے لگی "منیر تمہارے لیے شینا ٹھیک رہے گی اچھی مہذب لڑکی ہے ٹھہراؤ ہے طبیعت میں۔ میں تمہارے کسی کام نہیں آ سکتی تمہیں بہر حال زندگی کے لئے ایک ساتھی کی ضرورت ہو گی اور مجھے اس لڑکی سے بہتر کوئی نہیں لگتا" ہم ملتے رہتے ہمیں قریب آنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملا۔ پھر ایک شینا میں مَیں نے ایک تبدیلی محسوس کی جب ہم تینوں موجود ہوتے تو عجیب گھٹن ہوتی۔ ایڈا ادھر اُدھر نہ جاتی۔ میں یونیورسٹی سے فارغ ہو کر ایک فرم میں ملازم ہو گیا تھا اور مقابلے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا بس شینا اور میں اور وہ بنا ایک دوسرے سے زیادہ باتیں کئے بیٹھے رہتے۔ ایڈا نے دوبارہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا پھر شینا کوئی بہانہ بنا کر چلی جاتی یا اُسے کوئی بلانے آ جاتا میں اور ایڈا بیٹھے رہتے میں اُٹھتا اور خدا حافظ کہتا تو وہ اسی طرح سے بیٹھی رہتی۔ چھ ماہ میں ساری کایا پلٹ گئی۔ میرے خواب میری زندگی کچھ بھی تو پہلے جیسا نہ رہا۔

شینا سے دو ایک بار اس کے گھر جا کر ملا بھی تو وہ بہت رُکی رُکی سی تھی میں محبت کی کرچوں پر چلتا دور نکل آیا ایڈا نے شینا کی شادی کا سن کر مجھ سے رسمی افسوس بھی نہ کیا۔ جس لڑکے سے اُس کی شادی ہوئی ہے وہ بھی ایڈا کا لے پالک تھا اس کا ایک پرانا چاہنے والا۔

"ہو سکتا ہے تم جو الزام اُس کے سر دے رہے ہو اس میں اُس کا ذرا سا قصور بھی نہ ہو" میں نے کہا۔

"نہیں میں اتنا جذباتی اب نہیں رہا ٹھنڈے دل سے غور کر کے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ کسی نہ کسی احساس میں شدت سے مبتلا ہے اور شینا کو مجھ سے بدظن اُسی نے کیا ہو گا۔"

"اگر شیتا کو تم سے کوئی لگاؤ ہوتا تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"تم سمجھتے ہو میں محبت میں اور لگاؤ میں کوئی فرق نہیں کر سکتا ۔ آدمی میں بہت سنجیدہ ہوں۔"

"تم شیتا پر الزام نہیں دھرتے اور ایڈا کو سارا قصوروار ٹھہراتے ہو۔"

"جو لوکا تم نے شیتا کے ساتھ دیکھا وہ اُس کا تیسرا یا چوتھا شوہر ہے۔" منیر نے تلخی سے کہا۔

"تو اس سے کیا ہوتا ہے؟" میں نے جواب دیا۔

"ہوتا کیوں نہیں کچھ اگر وہ میرے ساتھ ہوتی تو یہ سانحہ نہ ہوتا ہم دونوں خوش رہتے۔"

"تو پھر اُس کا نصیب ، تم اتنے تلخ کیوں ہو یہ کیوں نہیں سوچتے جو لڑکی ایک کے ساتھ وفا نہیں کر سکتی کسی کے ساتھ بھی وفا نہ کرتی ۔ تم میں کیا خصوصیت تھی کیا محبت کی شادیاں ناکام نہیں ہوتیں ۔ شیتا میں یوں بھی وفا کا فقدان ہوگا۔"

وہ چپ ہو گیا شاید میری بات کا کوئی جواز ڈھونڈ رہا ہو۔

سڑک کے چوراہے پر ہم پھر کسی وقت ملنے کے لئے جدا ہو گئے زندگی کتنی عجیب ہے نہ سمجھ میں آنے والی پہیلیوں سے عبارت ——— اس عرصے میں دو ایک بار منیر سے ملنا بھی ہوا مگر یہاں وہاں کسی سرکاری دفتر میں کہیں کلب میں ذرا ذرا سی دیر کے لیئے ۔ میں پوچھنا چاہتا تھا کہ اُس نے کیا کیا تھا ۔ یہ موضوع اس نے خود نہیں چھیڑا ۔ لگتا تھا کام کی مصروفیت میں وہ بھول ہی گیا ہے بھلا بوڑھی عورتوں کے لئے کون پریشان ہوتا ہے؟ پھر نئی نسل کے اپنے مسائل ہیں اپنے حل ———

اُس رات بارش تیز تھی اور آسمان زمین والوں پر نہایت خفگی سے برس رہا تھا ۔ روشنی بھی ڈرتی کانپتی لگتی تھی ۔ ٹیبل لیمپ ہوا کے زور سے ہل رہا تھا ۔ شیشے میں لگی جھالر کپکپاتی تھی گرج کی آواز آسمانوں پر رقص کرتی ہوئی ایک کونے سے دوسرے کونے تک جاتی ۔ کہیں بجلی گرتی تو کڑک دل کو ہلا دیتی ۔ میں پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا ، بیٹھا تھا مگر لفظ ہٹتے تھے اور کان باہر کی آوازوں پر لگے تھے ۔ برآمدے کے ستون کے ساتھ اپنے آپ کو لپیٹے نیلے پھولوں والی بیل سو نہیں سکی ہوگی ۔ لان میں آکر دھوپ میں لوٹ لگانے والی بلی کا روز ٹھکانے کی تلاش میں اِس کا گھومنا ، دبے پاؤں میرے دروازے پر آکر پنجے مارنا اور پھر واپس جانا ۔ درختوں کی ٹہنیاں ٹوٹ کر گر رہی تھیں پرنالوں سے پانی بڑے زور سے گر رہا تھا بہتے ہوئے دھارے کی صدا جیسے میں ندی سے گھرا ہوں ۔ کھڑکی کے پٹ کھٹکے کے ڈھیلے ہونے کی وجہ سے آگے پیچھے ہوتے ہوتے اور ایسی آواز آتی تھی جیسے کوئی کھٹکھٹا رہا ہو ۔ میں پریشان ہو رہا تھا ۔ اُٹھ کر میں نے چاہا کہ کتابوں کا ایک ڈھیر اس کے آگے لگا دوں تاکہ ان بے چین روحوں کی آمد و رفت کا یہ منظر توڑ سکے ۔ پتلے پردے کے پیچھے سے مجھے ایک چہرہ دکھائی دیا کتابیں میرے ہاتھ سے چھوٹ گئیں ایسے وقت کون ہو سکتا ہے ۔ پسینے کے قطرے میرے ماتھے پر آگئے اور ڈر کی وجہ سے دل کانپتا لگا ۔ یہ کیفیت ایک دو منٹ رہی ۔ پھر سوچا ہو سکتا ہے چوکیدار ہو اور بارش سے ڈر کر اپنی کوٹھڑی کی بجائے برآمدے میں آگیا ہو ۔ میں نے اُسے پکارا ۔ مگر کوئی جواب نہ آیا ۔ میں نے پھر زور سے پکارا چلّا چلّا اتنے زور سے تاکہ میں خود میں بھی تو کوئی ہمت پیدا کر سکوں ۔ کبھی کبھار اپنی آواز کا اثر بہت ہوتا ہے ۔

"چیخ کیوں رہے ہو ۔ میں ہوں ایڈا دروازہ کھولو۔"

اگر کوئی کہتا کہ ساری پرانی روحیں جاگ کر میرے کمرے کے باہر جمع ہیں تو مجھے اتنی حیرت نہ ہوتی جتنی اُس نام کے سننے سے ہوئی ۔ جانے کب تک میں حیران کھڑا رہا ۔

"کیا اب مجھے ساری رات باہر کھڑا رکھنے کا ارادہ تھا تہارا۔" لپٹے ہوئے ایک بڑے بنڈل سمیت۔" اُوہ خدا کی قسم نہایت عجیب صورتِ حال ہے۔" کہہ کر وہ کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔

"عالم بتے بی کچھ خیال نہ کرنا تم اس کرسی کو پھر سے ٹھیک کروا سکتے ہو مگر میں بہت بھیگی ہوئی ہوں کھال کے اندر تک پانی ہی پانی ہے۔" خاموشی سے الماری کھول کر میں نے اُسے ایک پاجامہ اور قمیض پکڑا دی۔ لمبے کمر تک پہنچتے بالوں کو تولیہ سے خشک کرتی ہیٹر کے سامنے نیچی تپائی پر ٹکی ہوئی وہ مجھے بڑی بے آسرا لگی۔" اگر چائے مل سکتی تو . . . . مگر تمھیں کیونکر تکلیف دوں؟"

ایسے ہی وہ مجھے جو حکم بھی دیتی مانتا۔

چائے پیتے ہوئے لگتا تھا وہ خوابوں میں کھو گئی ہے۔ چپ چاپ پتہ نہیں کن ویرانوں میں بھٹکتی ہوئی اکیلی بے ٹھکانہ۔

بے بی بہت بڑے خطرے میں ڈال رہی ہوں تمھیں! پتہ ہے میرے پیچھے پولیس لگی ہے اور اس بنڈل میں وہ سارے کاغذات ہیں جن کی انھیں تلاش ہے۔ جب ہم لوگ بھاگے ہیں تو ناز آپا اور میں ایک ہی موٹر میں تھیں۔ تمہارا ٹھکانا قریب آیا تو جیسے الہام ہوتا ہے میں نے سوچا یہاں رک جاؤں بارش میں نشان مٹ جاتے ہیں کھوج نہیں نکالا جا سکتا۔ پتہ نہیں کس نے نہایت تفصیل سے ہمارے متعلق ایک ایک بات بتا دی ہے۔"

"تم ناز آپا کو نہیں جانتے؟ بھئی وہی جو دعوت والی رات سب لوگوں کو خوش آمدید کہہ رہی تھیں؟"

میں پاس کی کرسی پر خاموش بیٹھا تھا اور لگتا تھا میرے ارد گرد آسمان گر رہا ہے۔

" مگر تم یہ مت سمجھ لینا کہ اس سارے ریکٹ کا مجھے معلوم تھا ان لوگوں نے مجھے کہا تھا کہ جیل میں صرف انکل سے ملاقات کرنا ہو گی یہ بات تو اتنی بے ضرر تھی بظاہر ناز آپا کہتی تھیں کہ کسی وجہ سے وہ ایسے انکل کے ساتھ اپنا تعلق لوگوں پر ظاہر کرنا نہیں چاہتیں جو جیل میں ہو۔ میں نے سوچا میرا کیا جاتا ہے! روز روز ملنے پھرنے سے ایک دن ہفتے میں جا کر مل آنے سے کون جانے انکل کی کچھ لگتی بھی ہوں کہ نہیں اور پھر ناز آپا اس پیار سے مجھے رکھتی تھیں سوچو تو سہی میں جو نہ جانے کب سے بھٹکتی تھی جس کا اپنا اس بھری پُری دُنیا میں کوئی نہیں ہے یوں چاہی جاؤں، ایک گھر کا تصور جس میں اپنا پن ہو کتنا مکمل عیش تھا۔"

"مگر تمہاری اماں تھیں اور سولہ سو روپے کا بل چکا کر وہ تمھیں واپس گھر لے گئیں تھیں ہوٹل سے مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" میں نے بہت قطعیت سے بات کی۔

وہ چپ ہو گئی پھر جیسے لفظوں کے لیے اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مار رہی ہو ٹھیک ٹھیک نشانے پر تیر مارنا چاہتی ہو۔

"اماں کتنا اچھا میٹھا نام ہے۔" بہت دیر بعد اُس نے کہا۔" وہ میری اماں کہاں ہیں انہوں نے مجھے میری ماں کے مرنے کے بعد پالا تھا۔ بابا کی کچھ ہوتی تھیں یا یونہی انھیں ترس آ گیا تھا مجھے نہیں معلوم مگر بڑے ہونے پر میری بہنیں مجھے اتنی شدید نفرت اور حقارت کا سلوک کرتی تھیں۔ صرف انہی اماں کا وجود ہی مجھ پر محبت نچھاور کرتا۔ بابا نے دوسری شادی کر لی تھی وہ کہیں دور رہتے تھے افریقہ یا مشرقِ وسطیٰ میں کہیں انہوں نے پلٹ کر خبر نہیں لی بس نا ہے خرچ بھجواتے رہے تھے۔ اُس بڑی حویلی کے دالانوں میں محبت اور نفرت کے شدید جذبوں کے درمیان میں بڑھی۔ پتہ نہیں اماں جتنی شدت سے مجھے چاہتی تھیں اتنی ہی شدت سے وہ لوگ مجھے دھتکارتے کیوں تھے۔ میں سمجھتی ہوں یہ اماں کا قصور ہے مجھے اُن لوگوں سے بچانے کے لئے اپنے پر مجھ پر پھیلائے رکھتیں کوئی میلی آنکھ سے میری طرف دیکھتا تو اُس پر برس پڑتیں۔ کبھی عاقلہ یا زاہدہ میں سے کوئی اُن کے ساتھ سونا چاہتا تو ڈانٹ دیتیں اُن کی محبت پر اُن کا حق تھا مگر میں نے غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ انہوں نے مجھ سے دوستی نہیں کی وہ میری نہیں ہو سکتی تھیں مگر دشمن ہو گئیں۔ عاقلہ تو تقریباً میری ہم عمر تھی۔ جب تک میں اسکول میں رہتی خوش رہتی مگر گھر آنے کے نام سے ہی مجھ بخار سا چڑھ آتا۔ نہایت تھکے قدموں سے اکیلی دالانوں اور کمروں میں پھرتی۔ دیکھا تم

نے شروع ہی سے میرے خلاف اتنا بڑا محاذ تھا میں اور اماں ایک طرف باقی گھر ایک طرف۔ اماں کہیں جاتیں تو مجھے بھی ساتھ لے جاتیں اگر کبھی غلطی سے وہ مجھے چھوڑ جاتیں تو وہ لوگ طعنوں سے میرا ناک میں دم کر دیتے اتنا رُلاتے اتنا رُلاتے کہ مجھے ہوش نہ رہتی۔ جوں جوں بڑے ہوتے گھر سے مجھے نفرت ہو گئی۔ میں باوا کو یاد کرتی ان کی شکل کا تصور باندھتی جی چاہتا تھا اڑ کر اُن کے پاس چلی جاؤں مگر میرے تو پَر کٹے ہوئے تھے کبھی کبھار سینے میں اتنی گھٹن ہوتی تنی گھٹن کہ چیخیں مار کر رونے لگتی بہنیں کہتیں۔ یونہی ہسٹریا ہو گیا ہے۔ اماں تو پہلے ہی تمہاری ہیں انہیں پریشان کرنے زیادہ محبت حاصل کرنے کا یہ طریقہ اب اس کے ہاتھ آگیا ہے۔"

پھر وہ سب مل کر ہنسنے لگے۔ جلال اور جمال اور عاقلہ اور زاہدہ۔

اُن کی ہنسی نے مجھے اتنا خوفزدہ کر دیا کہ آنسوؤں کو میں نے اپنے اندر ہی خشک کر دیا ہے۔ سہارے کے لیے میں نے ہر راہگیر کا دامن پکڑا ہے اپنے آپ سے بچنے کے لئے میں نے قہقہوں اور ہنسی میں پناہ چاہی ہے مگر بے بی میں پھر بھی اکیلی رہی۔ خیر علی یہاں رہتا تو شاید حالات کچھ اور ہوتے پتہ نہیں وہ کیوں چلا گیا۔ میرے اندر کے خلا کا اُسے احساس ہو گیا جس خلا کو محبت کے سمندر بھی نہیں بھر سکتے۔" بہت دیر چپ رہنے کے بعد اُس نے پھر کہا تھا "پتہ نہیں کیسے بچا مک لیا میرے اندر میں پتہ نہیں۔" اُس نے اپنے بالوں کو انگلیوں سے سلجھایا۔ کہا کرتا تھا "قوس قزح کے رنگوں سے بنی تمہاری تصویر اصلی نہیں لگتی۔" اور میں ہنس کر یہ بھی اُس کی محبت سمجھتی تھی بات کہنے کا ایک انداز۔

زمانے نے مجھے بہت ٹھوکریں ماری ہیں یونیورسٹی کے بعد جہاں کہیں میں نے قدم جمانے کی کوشش کی ہے مجھے اکھاڑ دیا گیا ہے۔ امربیل کی طرح لوگوں نے مجھے ہر ہر درخت سے زبردستی جدا کیا ہے۔ جہاں بھی میں لپٹی ہوں۔

رات طوفان میں اُڑی جا رہی تھی۔

میں نے آتشدان میں آگ جلائی اور بنڈل کو کھول کر کاغذ جلاتا گیا۔

نازآپا نے تو کہا تھا انھیں سنبھال کر رکھنا اب میں کیا جواب دوں گی۔ کچھ بولے بنا میں نے آگ میں انھیں جھونک دیا۔ تپش سے ایڈا کی زردی میں سرخی جھلکنے لگی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

جب میں اُسے لینے گیا ہوں تو وقت تنگ تھا اور میری رشتہ کی بہنیں اس کے گلے سے لگ کر رو رہی تھیں ہوائی جہاز تیار کھڑا تھا اور برقعے میں الجھتی پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے اُس نے کہا "بے بی میں تمہارا شکریہ ادا نہیں کر سکتی۔ تم مجھے ہمیشہ یاد رہو گے۔"

تمہیں معلوم ہے مُنیر نے ایک دن کہا "جن لوگوں کے ہاں ہم اس دن دعوت میں گئے تھے وہ بین الاقوامی سمگلنگ کرنے والا گروہ تھا اور انہیں کے ساتھ اُن کے ذریعے ہی تو ایڈا مشرقِ وسطیٰ جانے والی تھی۔ وہ سب لوگ تو یہاں وہاں سے پکڑے گئے ہیں۔ صرف ایڈا کا پتہ نہیں چلا اور ساتھ ہی ایک کاغذ تک نہیں ملا۔ اُن کے خلاف ذرا سا ثبوت نہیں۔

"تم نے مجھے اتنے دنوں بتایا ہی نہیں۔" میں نے شکایت کی۔

میں اپنے طور پر ایڈا کی کھوج میں تھا مگر اُسے تو جیسے آسمان نگل گیا ہے زمین نے کھا لیا ہے اب میں اماں کو کیا جواب دوں گا۔ میں نے بڑی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا ———

جب آسمان پر چاند نہیں ہوتا اُن راتوں میں تارے ٹوٹتے ہیں تو روشن چمکدار لکیر سی کھنچ جاتی ہے اندھیرے کے پس منظر میں وہ زیادہ تابناک لگتی ہے۔ اور پھر فضا کو یاد ہی نہیں خلا کو احساس ہی نہیں ہوتا اُن تاروں کا کوئی سراغ ہی نہیں ملتا۔ پتہ نہیں تارے ٹوٹتے کیوں ہیں؟

نگارِ وطن

جمیلہ ہاشمی

"زمین سے محبت نہ بھی کرو تو بھی زمین تم سے محبت کرتی ہے۔" گل شیر نے اپنی زخمی ٹانگ کو ہلانے کی کوشش کی۔

نرس نے بستر ٹھیک کرتے میں سیدھے ہو کر اُس کی طرف دیکھا۔ "کیا کہہ رہے ہو گل شیر؟ کتنی عجیب باتیں کرتے ہو زمین کس طرح تم سے محبت کرتی ہے بے جان نِرے مٹی بھلا وہ تم سے کیسے محبت کر سکتی ہے؟"

ہنس کر گل شیر نے ماتھے سے پسینہ صاف کیا۔ "یہی تو تم کو پتہ نہیں چل سکتا مِس یہ باتیں تم کیا جانو۔ زمین کی بھی پکار ہوتی ہے وہ ہر لحظہ تمہیں اپنی طرف بلاتی ہے۔"

اور پھر تھوڑی دیر ٹھہر کر اُس نے کہا۔ "اسی لئے میں چاہتا ہوں جلد سے جلد ٹھیک ہو جاؤں اپنے وطن کے لئے میری جان بے تاب ہے وہ پکار مجھے سنائی دیتی ہے۔"

کیتھرین مارڈے نے جب اُس کی طرف دیکھا تو وہ ہنس بھی نہ سکی۔ گل شیر کے میلے چیکٹ بالوں میں کنگھی کرنے کے لئے وہ پھر جھکی تو اُس نے بہت لجاجت سے کہا۔ "مجھے بتاؤ میں کب تک ٹھیک ہو جاؤں گا کب واپس جا سکوں گا؟"

"تم واپس جانے کے لئے اتنے پریشان ہو تو ٹھیک ہونے کی کوشش کرونا۔ نرسیں کہتی ہیں تم انھیں ستاتے ہو دوا نہیں پیتے کچھ پوچھا جائے تو جواب نہیں دیتے۔ یہ ٹھیک ہونے کا طریقہ تو نہیں نا؟"

"وہ میری بات نہیں سمجھتیں تو میں اُن کی بات کیسے سمجھ سکتا ہوں۔ اس پرائے دیس میں صرف تم ہی تو ہو جو میرے وطن کی بولی بول سکتی ہو۔ اُن کے ہاتھ سے دوا بھی مجھے اچھی نہیں لگتی تم مجھے زہر بھی دو تو میں خوشی سے پی لوں گا۔" گل شیر طمانیت سے ہنسا کیتھرین کا ہاتھ جانے کیوں لرز گیا اس نے دھیرے سے اپنی اُس جیب کو چھوا جس میں گولی تھی۔

گیلے تولیے سے مُنہ صاف کرتے ہوئے اُس نے کہا۔ "میں تمہارے لئے ایک گولی لائی ہوں یہ تمہارے سارے درد دور کر دے گی۔"

"چلو اچھا ہوا تم اتنی مہربان تو ہوئیں لاؤ گولی مجھے دو۔" اُس نے ہاتھ بڑھایا۔

"نہیں گل شیر یہ گولی میں تمہیں اپنے ہاتھ سے کھلاؤں گی اور پھر آج تم جتنی باتیں جی چاہے مجھ سے کرو مجھے ذرا دیر کو فرصت ملی ہے۔"

"اچھا عجیب بات ہے۔ مہینوں کے بعد آج تمہیں فرصت ملی ہے باتیں کرنے اور بیٹھنے کی۔" ایک لمحے کے بعد پھر بولا۔ "میری عادت بہت خراب ہے جب کبھی مجھے ذرا سا بخار آیا ہے ماں ساری ساری رات میرے پاس بیٹھی رہی ہے جانتے یہ درد رہ رہ کر اُٹھتا ہے۔ لاؤ گولی دو۔" اُس نے میلے کمبل کے تکیے پر اپنے بھاری سر کو زور زور سے اِدھر اُدھر مارا۔

"سنو مجھے اپنے گھر کی باتیں بتاؤ اپنے گاؤں کی اپنی بیوی کی۔" نرس نے تکیہ برابر کیا

"درد چین لینے نہیں دیتا گولی دے دو نا پھر میں تم سے باتیں کروں گا۔"

پانی کا گلاس پکڑانے میں نرس کا ہاتھ کانپا اور پانی چھلک کر کمبل پر گر گیا۔

"تمہاری طرح میری ماں بھی ذرا ذرا سی باتوں پر گھبرا جایا کرتی ہے۔ بابا کی طبیعت میں البتہ ٹھہراؤ ہے وہ دلگیر ہو تو بھی اپنے آپ کو سنبھالے رہتا ہے۔ حیرت ہے تم اس پرائے دیس میں ماں کی طرح کیسے ہو؟ یہاں کتنی سخت سردی ہے اور ہم وطن سے اتنی دور ہیں اور پھر جبری بھرتی کر کے یہاں لائے گئے ہیں۔"

"جبری بھرتی، مگر جبری بھرتی کیوں؟ تم لوگ تو اپنی مرضی سے اپنے حاکموں کو خوش کرنے کی خاطر لڑتے ہو۔" کیتھرین اب اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی۔

گل بشیر ہنسا تو اس کے ننھے ننھے صاف ہوئے دانتوں کی چمک ان بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کے مقابلے میں بڑی دلآویز تھی وہ اس اپنے پن سے بہت مطمئن تھا۔

"تمھیں کیا پتہ جبری بھرتی کیا ہوتی ہے؟ مگر خیر تم جان کر بھی کیا لو گی۔ میں اپنی ماں کا ایک ہی بیٹا ہوں ہمارا پہاڑی علاقہ کھیتی باڑی میں بہت محنت مانگتا ہے اس دن جب تحصیلدار کے کارندے مجھے پکڑ کر لے گئے اور میرا نام فوج میں لکھوایا تو میں اپنے کھیتوں کے کنارے گھوم رہا تھا اور بہت خوش تھا ہماری مکی اس بار خوب ہو رہی تھی اور میں اس پگڈنڈی کی طرف گھڑی گھڑی جھانکتا تھا جہاں سے نور آنے والی تھی۔ نور پہاڑ کے دوسری طرف کے گاؤں کی بہت خوب صورت مٹیار ہے اس کی شربتی آنکھوں پر آدمی اپنا آپ وار سکتا ہے جب وہ گھنی پلکوں کی اوٹ سے دیکھتی ہے تو شرم کی لالی اس کے گالوں پر بہت بھلی لگتی ہے۔ جب میں ان کے ساتھ جا رہا تھا تو وہ تیز تیز قدم رکھتی اس پگڈنڈی سے مجھے دکھائی دی پہلے میں نے چاہا کہ اس سے بات کروں پھر دوسرے لوگوں کے خیال سے میں نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں وہ کتنی حیران ہوتی ہوئی مگر حیران ہونا بھی تو آخر آدمی کے لئے بنا ہے۔ اس شام جب میں واپس آیا تو گھر رشتہ داروں اور پڑوسیوں سے بھرا تھا۔ سب لوگ بہت اداس تھے ماں روتے روتے بیہوش ہوئی جاتی تھی مگر کوئی اسے تسلی بھی تو نہیں دیتا تھا۔ نور گھونگھٹ منہ پر کھینچے ایک طرف بیٹھی تھی اور پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کرید رہی تھی اس کی ماں نے میری بلائیں لیں۔ نور میں بیاہ کے دو سال بعد تک بھی بیباکی نہیں آئی تھی پھر رات آگئی۔ آسمان سیاہ لگ رہا تھا اور ستارے نگینوں کی طرح جڑے ہوئے بہت سجتے تھے۔ مہمانوں کے ساتھ میں چوپال میں سو رہا۔ مگر اس رات مجھے نیند کہاں آ رہی تھی۔ سردی بڑی بھلی تھی اور میرا دل یوں اتھل پتھل ہو رہا تھا چاروں طرف ہم سے اونچے ہم سے نیچے دور دور پہاڑ کی چوٹی تک دیئے ذرا دیر کے لئے ٹمٹماتے اور بادل کی اوٹ میں ہو جاتے پھر بجھ جاتے۔ جھرنے کا شور بہت زور سے پتھروں سے ٹکراتا دھارا کہیں کہیں کوئی بکری سوتے میں سے جاگ کر ممیاتی تو اس کی گھٹی گھٹی آواز بند کوٹھے میں یوں گونجتی جیسے وہ موت کو دیکھ کر ڈر رہی ہو۔ بادام کے پودے مزے میں جھومتے تھے اور پانی پر سے ہو کر آتی ہوا ان کی ٹہنیوں میں جھول جھول جاتی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا میں نور سے بات کروں مگر ایسا کرنا بھی تو ممکن نہ تھا۔"

"تم اسے بلا لیتے بلا سکتے تھے وہ تمہاری اپنی بیوی تھی۔" کیتھرین نے کہانی سننے والے کی طرح ہنکارہ بھرنے کی خاطر کہا۔

"بلا لیتا۔" گل شیر طنزیہ ہنسا۔ "مس ہمارے گھروں میں یہ ممکن نہیں ہوتا۔ جب بڑوں اور رشتہ داروں سے گھر بھرا ہو تو کوئی جوان

اپنی بیوی کو نہیں پکار سکتا - یہ ہمارے ہاں کے دستور میں مگر تم انہیں سمجھ نہیں سکتیں ۔"

" شاید یہ ایسی بات ہے جو میری سمجھ میں نہیں آ سکتی ۔" کیتھرین نے کہا ۔

" تم بیوی سے ملے بنا تو نہیں آئے نا؟"

" یونہی بچھڑا ہیں نور سے مل نہیں سکا۔ مجھے اور گاؤں کے دوسرے جوانوں کو وداع کرنے کے لئے تھوڑی دور تک عورتیں آئیں مگر اُس بھیڑ میں نور کی صورت میں کس طرح دیکھ سکتا تھا۔ لاری کے آنے تک ہمارے باپ اور بھائی کھڑے رہے پھر وہ بھی ہاتھ ہلا کر اور ہمیں چھوڑ کر چلے گئے بھاری قدموں سے بوجھل دلوں کے ساتھ چپ چاپ لاری میں نامعلوم منزلوں کی طرف نامعلوم وقت کے لئے لے کر چل پڑی۔ راستے کے وہ سب موڑ وہ سارے کنج میری یاد میں اکثر ابھرتے ہیں۔ وہ سامنے بن میں ہم کھیل کود کر بڑے ہوئے وہ جھرنے جن کے ٹھنڈے میٹھے پانی کی پیاس مجھے اپنی روح میں محسوس ہوتی ہے۔ تمہیں نہیں پتہ دھوپ کتنی تیز اور گہری اور دن کتنے چمکیلے ہوتے ہیں سردی اتنی مزیدار ہوتی ہے اور کھیتوں کے کنارے کے درختوں پر چڑیوں کے جھنڈیوں فراٹے بھرتے ایک سے دوسرے درخت پر جا بیٹھتے ہیں جیسے مٹھی بھر دانے یہاں وہاں کوئی کھینچ کر مارے ہوا سو طرح کی خوشبوؤں سے بھری رہتی ہے اور مست ہو کر کوئلیں یہاں وہاں اندھیرے کنجوں میں بولتی ہیں عجیب عجیب رنگوں والے پرندے ست رنگے پھولوں کی طرح کہیں کہیں نظر آتے ہیں ۔

" ست رنگے پھول تم تو خوابوں کی باتیں کہتے ہو گل شیر ۔" کیتھرین نے اس کا بازو اٹھا کر نبض دیکھنے کے لئے اپنی انگلیاں اس پر رکھیں۔

" مجھے یہ خواب ہر شے سے زیادہ پیارے ہیں۔ مجھے ان کی باتیں کر لینے دو نا۔ اُس زمین کی باتیں جو مجھے پکارتی ہے گل شیر کی آواز بوجھل ہوتی جاتی تھی۔ چھ مہینوں کے بعد اب اس گھڑی جب مجھے درد محسوس نہیں ہو رہا اور تم ذرا فرصت سے میرے پاس بیٹھی ہو مجھے خواب کی باتیں کہنے دو نا۔" گل شیر ضدی بچے کی طرح اپنی بات منوانا چاہتا تھا۔

" میں سن رہی ہوں گل شیر یہ باتیں مگر تعجب ہے تمہارے باغوں میں ست رنگا پھول ہوتا ہے۔" کیتھرین یوں بیٹھی تھی جیسے اُسے کوئی کام ہی نہ ہو۔

دور کہیں سے توپوں کی گھن گرج سنائی دی۔

"ہمارے جھرنوں کا پانی اتنا صاف ہوتا ہے اور اتنا نیلا کہ تم اُس کے آرپار گہری جھیل کے آخر تک دیکھ سکتی ہو۔ میرا وطن دنیا میں سب سے پیارا ہے۔ یہ جب میں اچھا ہو جاؤں گا اور واپس چلا جاؤں گا تو تم ہمارے ہاں آنا۔ تمہیں نور پسند آئے گی ان دو سالوں میں اُس کا رنگ اور بھی نکھر گیا ہوگا۔ تم نے گندم کے کھیت دیکھے ہیں مگر تم نے کہاں دیکھے ہوں گے۔ اس کا رنگ سنہرا ہے مگر ذرا سا زرد جیسے چنبیلی ہو مگر نہیں چنبیلی کی زردی میں وہ چمک نہیں ہوتی جو اُس کے رنگ میں ہے خیر جب تم دیکھو گی تو تمہیں اُس کے رنگ کی آپ سے آپ ہی سمجھ آ جائے گی اور پھر وہ باتیں بہت اچھی کرتی ہے دھیرج سے بات کرنے والی اور بھاگوان۔ تمہیں پتہ ہے بھاگوان کون ہوتا ہے؟ مگر نہیں تمہیں کیسے معلوم ہوگا۔ نور کے آنے سے ہماری گایوں اور بھینسوں نے زیادہ دودھ دینا شروع کر دیا ہے جب سے وہ آئی ہے ہمارے

کھیتوں میں اناج بہت ہونے لگا ہے ہر شے دھل گئی ہے جیسے بارش کے بعد درختوں پر نکھار آجاتا ہے ، میری ماں اُسے بہت پیار کرتی ہے جب اُس کے لمبے سیاہ بالوں میں تیل ڈالتی ہے تو کہتی ہے میری بہو کو کسی کی نظر نہ لگ جائے اور اس کے کان کے پیچھے سیاہی کا ٹیکا لگا دیتی ہے۔ نور مجھ سے کہتی ہے " پتہ نہیں ماں کو میں کیوں ساری دنیا سے زیادہ خوبصورت لگتی ہوں" میں اُسے ستانے کے لئے کہتا ہوں " ہاں پتہ نہیں کیوں ہر ماں کو اپنی بہو دنیا کی ساری کنواریوں سے زیادہ حسین کیوں لگتی ہے" وہ چپ سی ہو جاتی ہے پھر اُٹھ کر اِدھر اُدھر چلی جاتی ہے اور پھر کہتی ہے " اچھا ماں کو ہی لگتی ہوں نا تمہیں تو نہیں لگتی نا پھر اپنی گہری نیلی چادر کو بہت اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ کر کہتی ہے " گاؤں کی مٹیاروں میں سے تمہیں کون لگتی ہے ابھی ذرا بتاؤ تو سہی "

" میں سر ہلا دیتا ہوں ہم دونوں ہنسنے لگتے ہیں اُسے پتہ ہے اس کا نیلی چادر میں یوں چمکتا چہرہ مجھے آسمان پر پورے چاند کی طرح دکھائی دیتا ہے اس کی ہنسی میں بڑی موہنی ہے - جب وہ ہنسے تو تم اسے پسند کئے بنا رہ ہی نہیں سکتیں - تمہیں نہیں معلوم جب سے وہ آئی ہے لگتا ہے ہمارے گھر کا آنگن سکھ کا سانس لے رہا ہے گھر بدل گیا ہے گھر کے ساتھ زمین بھی بدل گئی ہے مجھے اُس زمین سے محبت ہے مس -

" اپنے وطن سے سب کو محبت ہوتی ہے " کیتھرین اس کی نبض کے بوجھل پن کو محسوس کر کے مطمئن تھی گولی کا اثر وقت کے ساتھ ساتھ ہو رہا تھا وہ اب کرسی پر آگے کی طرف جھکی بیٹھی اُس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی -

" نہیں ہماری زمین میں ایک جادو ہے جو اپنی طرف بلاتا ہے اُس زمین کی چاہت کی چھاپ بہت گہری ہے پکے رنگ کی طرح وہ تمہاری روح میں اُتر جاتی ہے تمہیں اپنی طرف بلاتی ہے اور اس لئے دیس سے دُور ہونے پر بھی آدمی اُس کے سپنے دیکھتا ہے - اُن صبحوں اور شاموں میں کچھ ہے جو آواز دیتا ہے وہ آوازیں جو نہ بولنے پر بھی بولتی ہیں تارے جو نیلاہٹ میں آنکھیں جھپکاتے ہیں راہ دکھلانے والے جو ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک سفر کر چکیں تو رات ختم ہونے کے قریب ہوتی ہے نیلے پربتوں پر نیلے دھوئیں کا جادو اور شاموں کا سناٹا پھر ایسی صدائیں جن کا کوئی نام نہیں پھل اور درختوں کی خوشبو اور پانی کی ٹھنڈک وہ جگہیں جہاں میٹھے پانی کے ذرا ذرا سے سوتے رستے ہیں وہ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں جو آنکھ مچولی کھیلتے میں شیطان کی طرح تیز اور دوڑنے میں بکریوں سے بھی زیادہ چالاک ہیں وہ جگہیں جو بدل بھی جائیں تو یاد رہتی ہیں - تم محسوس نہیں کرتی ہو کہ اپنے لاتعداد بازو پھیلائے زمین محبت کی جھولی میں بلاتی ہے اور آدمی اگر اس پیار کو محسوس نہ کرے تو اُس کے لئے جان قربان کیوں کرے یہ محبت یک طرفہ نہیں ہوتی "

" گل شیر اب تم سو جاؤ بہت باتیں کر چکے ہو " کیتھرین نے افسوس سے سر ہلایا -

" تم نے خود ہی تو کہا تھا آج تمہیں فرصت ہے " شیر دل نے جس ہاتھ سے اسکا ہاتھ پکڑا ہے وہ بے جان سا ہو رہا ہے بوجھل سویا ہوا جیسے اُس میں سے روح نکل جا رہی ہو -

" میری بات سنو مجھے تو زمین بھی دلہن کی طرح لگتی ہے - آدمی اُس کے لئے جان دے سکتا ہے اُس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے آدمی ساری عمر سفر کر سکتا ہے - وہ زمین جس کے لئے وہ زندہ ہے وہ سر کے بل چل کر اُس تک جانے کے لئے ایک عمر نہیں دس عمریں بھی گنوا سکتا ہے "

" کاش تم اپنی ایک عمر اور یہ چھوٹی سی زندگی اُس کے لئے دے سکتے - تم نے اپنی جان ایک ایسے محبوب کے لئے دی ہے

جس میں تمھیں یقین تک نہیں ہے اور کبھی نہیں تھا۔" کیتھرین اُس کے کان کے پاس جھکی کہہ رہی ہے۔

"کیا کہہ رہی ہو؟" اُس نے ایک دم بوجھل پلکیں اُٹھائیں اور اپنی اُونچی پیشانی پر سے پسینے کے قطرے پونچھنے کے لئے ہاتھ اٹھانا چاہا جو اٹھ نہ سکا جیسے دیئے کی لو ایک دم زور سے بھڑکے اور پھر دھیمے دم ہو کر کمبل کے تکیے پر گر پڑا۔

"گل شیر دھیرج سے کام لو میں تمہارے لئے دعا کروں تم اب خاموش لیٹے رہو۔"

"میرے لئے تم دعا کرو گی، تم میرے لئے دُعا کرو گی۔ نہیں میرے ساتھ میری ماں کی دعائیں ہیں میری نورہ کی دعائیں ہیں۔ میرے گاؤں کے راستے منتظر ہیں اور دعا کرتے ہیں میری زمین منتظر ہے پکارتی ہے اور دعا کرتی ہے۔" وہ چپ ہو گیا۔

تمہاری زمین میں کوئی اور زمین تمہیں پکارتی ہو گی تمہاری زمین نے اپنی بولی بدل دی ہے۔ کیتھرین آنکھیں بند کر کے دعا کرنے لگی اُس نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔

"تم مجھ سے بات کرو یوں چپ نہ بیٹھو مجھے وحشت ہوتی ہے آنکھیں بند نہ کرو۔ تمہاری آواز میرے کانوں میں میٹھے گیت کی طرح آتی ہے۔" گل شیر لگتا تھا پوری ہوش میں ہے۔

"اچھا جو تم چاہو۔" کیتھرین نے خیمے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ "کاش یہ وقت اتنا لمبا نہ کھنچے۔"

"کیا کہہ رہی ہو میرا سر بھاری ہو رہا ہے۔" گل شیر کی آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔

"میٹھا گیت، میری آواز تمھیں میٹھے گیت کی طرح لگتی ہے موت کا راگ اندوہناک اندھیرا اور سمجھ میں آنے والا نہیں ہوتا۔"

تب خیمے کے دروازے سے جھانک کر ڈاکٹر نے کہا "نرس خالی بستر کے انتظار میں وہ زخمی کرنل کو لئے باہر کھڑے ہیں۔ پھر اس کو ذرا متذبذب دیکھ کر وہ اندر آ گیا کیوں تم نے اُسے گولی وقت پر نہیں دی تھی؟"

"دی تو تھی مگر پتہ نہیں کیوں لگتا ہے وہ مسلسل ہوش میں ہے باتیں کئے جاتا ہے۔" اُس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "بے ہوش بھی تو نہیں ہوتا۔"

"مگر باہر ناقابلِ برداشت ٹھنڈ ہے اور وہ زیادہ دیر کھڑے نہیں رہ سکتے۔ تم نے اُسے باتیں کرنے سے روکا نہیں۔"

"روکا تھا ڈاکٹر مگر اُسے اپنا وطن یاد آ رہا تھا وہ کہتا تھا اُسے اپنی زمین کی پکار سنائی دیتی ہے۔"

"جذباتی یہ لوگ بہت بیوقوف ہوتے ہیں اور بہت ہی جذباتی اگر اسے اپنی زمین کی پکار سنائی دیتی تھی تو اس نے غلط سنا ہو گا۔" ڈاکٹر نے اشارہ کیا۔

"شاید کبھی کبھار آدمی موت کے سفر تک غلط سوچوں کا غلط آوازوں کے جادو کا اور غلط پکاروں کا جواب دینے کا شکار ہوتا ہے۔" کیتھرین نے جھک کر گل شیر کی ناک کے آگے اپنا ہاتھ رکھا پھر ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر سر ہلا دیا۔ وہ آنسو چھپانے کے لئے اپنی آنکھیں جھکائے ہوئے تھی

یہ کہانی میں نے ایک اخبار کے سنڈے ایڈیشن میں زمانوں پہلے پڑھی تھی تب سے اب تک کتنا پانی پلوں کے نیچے بہہ چکا ہے۔ وقت نے سات رنگ بدلے ہیں۔ وطن اور وطن کے معنی بدلے ہیں، ہم نے اپنے سبق سیکھے ہیں قربانیاں دی ہیں اور قربان ہونا

سیکھ رہے ہیں کتنی جنگیں لڑی ہیں مگر جانے کیوں مجھے ہر سپاہی کی کہانی گل شیر کی کہانی لگتی ہے گولی سے لائی موت عزت کی موت اور زمین کا بلاوا لگتی ہے پتہ نہیں کون نگارِ وطن ہے جس کی ایک جھلک دیکھنے اور گھونگھٹ کے پرے جس کے گالوں کی لالی پر شربتی آنکھوں پر جان وار دینے کی آس لئے وہ پیچھے مڑ مڑ اندھیرے اور اندوہناک راگ سنتے ہیں؟ وہ کون ہے جس کی چاہت میں وہ سب اپنی جان سے گزر جاتے ہیں پتہ نہیں اس چاہت کا جادو کیا ہے اور کون سی زمین کس کو کب پکارتی ہے؟ ڈاکٹر کے لفظوں میں یہ جذباتی لوگ جانے کیا ٹھیک سنتے ہیں اور کیا غلط؟

اردو ادب
کی
اہم خواتین ناول نگار
نیلم فرزانہ
EBH

اردو ادب کی

اہم خواتین ناول نگار

نیلم فرزانہ

ایجوکیشنل بک ہاؤس ○ علی گڑھ

© نیلم فرزانہ

اڈیشن ________ ۱۹۹۲ء

قیمت ________ ۱۰۰ روپے

مطبع ____ ایم۔اے افسیٹ پرنٹرس دہلی

Urdu Adab Ki Aham Khatoon
Novel Nigar

By Nilam Farzana

Published by
Educational Book House
M.U. Market, Aligarh-202002.

Edition 1992 - Price Rs.100/-.

ایجوکیشنل بک ہاؤس

مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔۲۰۲۰۰۲

مندرجات :

جمیلہ ہاشمی

جمیلہ ہاشمی نے افسانوں کے علاوہ متعدد ناول اور ناولٹ لکھے ہیں۔ ان کے پہلے ناول "تلاشِ بہاراں" (۱۹۶۱ء) کو خاصی شہرت ملی۔ اس شہرت کی بنیادی وجہ شاید یہ رہی ہے کہ اسے "آدم جی" ادبی انعام ملا تھا۔ لیکن فنی اعتبار سے یہ ناول کمزور سمجھا گیا اور اسے ادبی حلقوں میں زیادہ پذیرائی حاصل نہ ہوسکی۔ اس پر مختلف قسم کے اعتراضات سامنے آئے۔ پروفیسر وحید اختر لکھتے ہیں:

"تلاش بہاراں کی ناکامی اس بات کا ثبوت ہے کہ ہر اچھا افسانہ نگار اچھا ناول نگار نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح جیسے ہر غزل گو اچھی یا طویل نظم لکھنے پر قادر نہیں ہوتا۔ ناول کے لئے زندگی کا گہرا اور وسیع مشاہدہ کرداروں اور پلاٹ کی پیچیدگیوں کو دیر تک اور دور تک سنبھالے رہنے کی صلاحیت اور دیرپا تخلیقی جذبہ چاہیئے۔" ؎۱

ایک تبصرہ نگار اقبال مسعود لکھتے ہیں:

"تلاش بہاراں میں جس عنصر کی شدید کمی ہے وہ ہے نفس وحدت۔ ایک اچھے ناول میں سارے اجزائے ترکیبی کچھ اس طرح مربوط ہو جاتے ہیں کہ فنی طور پر ایک مکمل اکائی کی حیثیت اختیار کرلیتا ہے۔ "تلاش بہاراں" میں اچھے کردار، واقعات کی فنی اور منطقی پیش کش، خاص طور پر انسانیت کا درد

اور انسان کے آفاقی مسائل اور وہ سب کچھ جو ایک عظیم تخلیق کے اجزائے اعظم ہیں مل جاتے ہیں لیکن فنی وحدت کے فقدان کے باعث یہ ناول قاری کے ذہن پر ایک عظیم تخلیق کا تاثر قائم نہیں کر پاتا۔" ؎۲

یہ صحیح ہے کہ جستہ جستہ "تلاش بہاراں" میں وہ سارے عناصر موجود ہیں جو اسے کامیاب اور یادگار ناول بنا دیتے لیکن بنیادی خرابی مرکزی کردار کی پیش کش میں ہے۔ اس کے علاوہ رومانوی انداز بیان کی گہری دھند نے اس ناول کو نقصان پہنچایا ہے۔ سب کچھ فضا میں تحلیل ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے صرف شعریت باقی رہ جاتی ہے اور شعریت بجائے خود ناول کی خوبی نہیں ہے۔

ناول کی کہانی اس دور میں لکھے جانے والے بیشتر ناولوں کی طرح آزادی اور اس سے کچھ قبل کے زمانے کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کا نقطۂ عروج ۴۷ء کا فساد ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اس دور کے دوسرے ناولوں کی طرح اس ناول کا موضوع بھی جنگ آزادی اور تقسیم ہند سمجھا گیا۔ پروفیسر عبدالسلام لکھتے ہیں:

"اس کتاب کا نام بہت موزوں ہے۔ آزادی کے متوالوں نے اپنے تن من دھن کی بازی لگا کر آزادی کے جو خواب دیکھے تھے اس کی تعبیر وہ فرقہ وارانہ فسادات تھے جو اعلان آزادی کے ساتھ ساتھ سارے ملک میں پھیل گئے۔ کیا اتنی قربانیوں کا ماحصل یہی بہاراں تھی جس کی تلاش میں پوری ایک صدی صرف ہوگئی۔" ؎۳

گرچہ اس ناول میں آزادی سے قبل کے اس دور کو گرفت میں لینے کی کوشش کی گئی ہے جب پورے ہندوستان میں بیداری کی لہر چل پڑی تھی اور ملک کی آزادی کے لئے بڑے پیمانے پر جدوجہد جاری تھی۔ لیکن اس دور کو پس منظر بناتے ہوئے جس امر پر زیادہ توجہ صرف کی گئی ہے وہ ہندوستانی سماج میں عورت کا استحصال اور اس کی مظلومیت ہے۔ اس طرح ناول کا موضوع آزادی کی جدوجہد نہیں کہ ناول کا کوئی کردار اس جدوجہد میں حصہ لیتا نظر نہیں آتا۔ "تلاشِ بہاراں" کا اسم درصل

ناول کے ایک کردار کنول کماری ٹھاکر کی کوششوں اور جد و جہد کا استعارہ ہے۔ جو اس نے عورتوں کی بھلائی ان کے حقوق کی حفاظت اور عورتوں کی عام ذہنی صورت حال کو بدلنے کے لئے کی۔ اس ناول میں جتنے بھی اہم کردار پیش کئے گئے ہیں ان سب کی کہانی ہندوستانی عورت کی زندگی کے المناک پہلو کو پیش کرتی ہے۔ ان کرداروں کے حوالے سے ناول کا موضوع ہندوستانی عورت کا مقدر قرار پاتا ہے۔ پیش کش کے اعتبار سے یہ ناول بنیادی طور پر ایک کردار کا ناول ہے۔ وہ کردار ہے کنول کماری۔ اس کے علاوہ بینا، شوبھا، رادھے کرشن اور کرشنا سب کی کہانی جزوی حیثیت رکھتی ہے۔ کنول ٹھاکر ہی وہ مرکز و محور ہے جس کے گرد ناول گھومتا ہے۔ وہ اس پورے استحصالی نظام کو بدلنے کا خواب دیکھتی ہے جس میں عورت کی حیثیت مجبور محض ہے۔ وہ کہتی ہے :

"زندگی کی بنیادیں بدلنے کی ضرورت ہے۔ کام اور کوشش کی ضرورت ہے۔
عام ذہنی سطح کو بدلنے کی ضرورت ہے اور میں یہ کام کروں گی"۔ [۱۲]

کنول ٹھاکر ایک کالج قائم کرتی ہے اور نئی نسل کی تربیت کا انتظام کرتی ہے۔ اس کالج کی طالبات کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ کنول ٹھاکر کے خوابوں کا ایک دھورا خاکہ ہے۔ گرچہ کنول ٹھاکر ان سماجی عوامل سے جو اس کی راہ میں حائل تھے نبرد آزما ہوتی ہے، کچھ کامیابی بھی حاصل کرتی ہے لیکن تاریخ یا وقت پر اس کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ اور تاریخ کے ایک حادثے کے نتیجے میں اس کے خواب مسمار ہو جاتے ہیں۔ یہی "شکست خواب کا المیہ" دراصل اس ناول کا موضوع ہے۔

کنول ٹھاکر ناول کا مرکزی کردار ہے، جس پر ناول نگار نے اپنی پوری توجہ صرف کی ہے لیکن تمام تر کوششوں کے باوجود مصنفہ اسے ایک زندہ کردار بنانے میں ناکام رہی ہیں۔ کنول ٹھاکر ایک زندہ عورت نہیں بلکہ ایک بے جان تصویر یا آئیڈیا کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ جمیلہ ہاشمی اس کردار کی رگوں میں خون کی وہ جولانی نہ بھر سکیں جو اسے ایک ناقابل فراموش کردار بنا سکتا۔ کنول ٹھاکر میں زندگی کا احساس نہیں ملتا۔ وہ انسانی فطرت کی نہ صرف کمزوریوں بلکہ اس کے صحت مند تقاضوں

سے بھی ماورا نظر آتی ہے۔ وہ اپنی بعض نقل و حرکت سے اس دھرتی سے پرے کسی دور دیس کی مافوق الفطرت ہستی لگتی ہے۔ کنول ٹھاکر کے بارے میں راوی کہتا ہے:

"برستی بارش اور اندھیری رات کنول تو دیوی ہے جس کے پاس سے ڈر اور مصیبت کے لفظ چیختی ہواؤں کے خالی طوفانوں کی طرح نکل جاتے ہیں"۔ [۵۴]

ان تمام صلاحیتوں کے باوجود کنول ٹھاکر نے زندگی کے چمن میں کانٹوں سے الجھنے کی ہمت نہیں کی بلکہ پھولوں سے بھی اپنا دامن بچایا ہے صرف اس خوف سے کہ پھول چننے کی کوشش میں کہیں اس کے ہاتھ لہولہان نہ ہو جائیں۔ کنول ٹھاکر کے اس طرز زندگی کے لئے مصنفہ نے جو جواز تلاش کیا ہے اس میں اتنی جان نہیں کہ وہ کنول ٹھاکر کے رویہ کو فطری اور منطقی بنا سکے۔ اس کا ماضی جس میں اس کی شخصیت کی تعمیر ہوئی ہے اس کے اندر ایک باغیانہ ذہن ضرور پیدا کرتا ہے لیکن وہ فولاد بن کر سماج سے ٹکر نہیں لیتی بلکہ آبگینہ بن کر اونچی سطح پر سج جاتی ہے تاکہ وہ ہر ایک کی دسترس سے دور ہو۔ کنول تنہا ہے اس سے ملنے اور اس کو جاننے والے بہت سے لوگ ہیں لیکن وہ اپنے خوابوں کا راز دار کسی کو نہیں بناتی۔ کنول کی شخصیت کا اعجاز یہ ہے کہ وہ ہر ایک کو اپنا پجاری بنا لیتی ہے وہ سب کے لئے ایک آدرش بن جاتی ہے چاہے وہ ناول کا راوی ہو یا رادھے کرشنن، راجندر ہو یا ڈون وارٹن۔ راوی کنول کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

"جب بھی میں گھبرا گیا ہوں۔ دشمنوں کی مخالفت سے تنگ آ کر میں نے اپنے کام کی مقبولیت پر غور کیا ہے ہمیشہ کنول کی صورت نے اس کی ہمت نے مجھے تسلی دی ہے۔ انجانے ہی اس کا سایہ اندھیروں میں میرا رہنما رہا ہے"۔ [۵۵]

رادھے کرشنن کہتا ہے:

"میں اس کی عزت کرتا ہوں دنیا میں وہ اکیلی عورت ہے جس کو میں

پاروتی کے سمان اونچا سمجھتا ہوں۔ میں نے کبھی اپنی آنکھیں اٹھاکر اس کی طرف دیکھنے کی جرأت محسوس نہیں کی ہیں جو عورت کو آنکھوں میں نگل جاتا ہوں۔ ؎ یہ کنول ٹھاکر کی طلسماتی شخصیت کا معجزہ ہے۔ اس عقیدت کا کوئی منطقی سبب سامنے نہیں آتا۔

کنول ٹھاکر کے مقابلے پر شوبھا کا کردار ہے۔ گاؤں کی بھولی بھالی لڑکی شادی کی پہلی رات بیوہ ہوجاتی ہے پھر ہندوستانی سماج میں بیوہ کو جن دشوار گزار مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے اس نے ان سب کا مقابلہ کیا۔ اس نے بھگوان کے قدموں میں پناہ ڈھونڈی لیکن مندر کا پجاری یہ آسرا بھی چھین لیتا ہے۔ شوبھا کے اندر ایک آگ سی بھڑکتی ہے اور ردعمل کے طور پر وہ تمام تحفظات کو ٹھکرا کر اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کے لئے نکل پڑتی ہے۔ اس تلاش میں اس نے قطرہ قطرہ زندگی کا زہر پیا۔ کانٹوں سے اس کا دامن تار تار ہوا۔ اس نے پھولوں کی تلاش میں کانٹوں سے خوف نہیں کھایا یہ اور بات ہے کہ پھولوں سے اس کا دامن نہ بھر سکا۔ وہ اپنے تجربے پر شرمندہ نہیں ہوتی۔ راوی کو ایک خط میں لکھتی ہے:

"کنول سے کہنا تم بھی دھرتی ہو اور وہ بھی کیا ہوا جو تم ماتھے پر چڑھانے کے لئے ہو میں پاؤں کی دھول بن کر مندر میں جا سکتی ہوں" ؎

شوبھا کا کردار جدید ہندوستان کی ان تعلیم یافتہ عورتوں کی نمائندگی کرتا ہے جنھوں نے سکون کی تلاش میں اپنی زندگی کے فیصلے اپنی مرضی سے کئے۔ لیکن شوبھا کی شخصیت کا یہ امتیاز ہے کہ اس نے زندگی کی اس ڈگر کو ردعمل کے طور پر اختیار کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس طرح ایک پرسکون اور کامیاب زندگی گزارے گی لیکن اسے اپنی تلاش میں کامیابی نہ ملی اور بالآخر تنہائی اس کا مقدر بنی۔ شوبھا کا کردار ناول کا سب سے جاندار کردار ہے۔

شوبھا کے علاوہ کرشنا کا کردار بھی اہم ہے۔ کرشنا ایک عام جذباتی عورت ہے لیکن اس کے بھی کچھ امتیازات ہیں۔ شوبھا کی طرح کرشنا نے بھی زندگی کی تلخیوں کا زہر پیا ہے۔ وہ محبت کرتی ہے اور سماج کی روایات کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے۔

اس لئے کہ وہ ایک دلیش خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا محبوب برہمن زادہ ہے لہذا ان کی شادی سماج کی نظروں میں جائز نہیں ہے۔ اور جب وہ اس سے شادی کرلیتی ہے برہمن سماج اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ زندگی کے اس موڑ پر اسے سماج کی پہلی ٹھوکر لگتی ہے لیکن وہ ہراساں ہونے کے بجائے ہمت سے کام لیتی ہے۔ سماج سے اپنا حق طلب کرتی ہے۔ وہ عارضی طور پر کامیاب بھی ہوتی ہے لیکن جب دوبارہ اس پر زندگی کی راہیں مسدود کر دی جاتی ہیں تو وہ انتقاماً اپنے شوہر کو قتل کر ڈالتی ہے اور زندگی کے چودہ سال جیل میں گزار کر واپس آتی ہے۔ وہ زندگی سے مایوس نہیں ہوتی اور ماں کی فطری بے چینی سے اپنے بیٹے کا انتظار کرتی ہے۔ اسے زندگی نے جو تجربے دئے ہیں ان کے زیر اثر حقیقتیں اس کی نگاہوں میں روشن ہیں۔ وہ خیال کے بجائے عمل کی پجارن ہے۔ اس کے کردار میں ابتدا سے حرکت ہے۔ وہ کنول کے تصوراتی صنم خانوں سے نالاں ہے اور اسے بار بار زندگی اور وقت کی بے وفائی کا احساس دلاتی ہے۔

”میں تم سے کہتی ہوں مس جوزف نے جو پریشان خواب دیکھا ہے تم بھی اس کی لپیٹ میں نہ آجاؤ ...... تم بھی ایسی ہی لایعنی باتیں سوچا کرو گی جب تمھاری دلچسپی تمھارے کام میں ختم ہو جائے گی ...... اور یہی اکیلاپن تمھاری زندگی پر چھا جائے گا تو لمبی سہ پہروں کو بیٹھی خیالوں کے تانے بانے میں مشرق و مغرب کو پرو دیا کرو گی“ ۵۹

رادھے کرشن کی کہانی ناول میں ایک الگ اہمیت رکھتی ہے۔ وہ سماج کے ان عناصر کی نمائندگی کرتا ہے جو دوہری زندگی جیتے ہیں۔ رادھے کرشن سماج کا بدنام ترین انسان ہے لیکن پھر بھی لوگ اس سے ملتے ہیں، اس کی عزت کرتے ہیں۔ وہ جلسوں کی صدارت کرتا ہے اس لئے کہ اس کے پاس دولت ہے، نام ہے۔ عیاشی اس کی فطرت ہے۔ وہ عورت کو ایک کھلونا سمجھتا ہے اور پجاری کی بیٹی سندری کو فریب دیتا ہے۔ لیکن جب اس کی اپنی بیٹی ایک طبلہ بجانے والے سے عشق کرتی ہے تو اسے برداشت نہیں کر پاتا اور اپنی بیٹی کو قتل کر ڈالتا ہے۔ اس قتل کے بعد سندری جسے وہ مردہ سمجھ چکا تھا اس

سے ملتی ہے اور — بتاتی ہے کہ وہ لڑکا اس کا بیٹا ہے اور اس کی بیٹی کی گورنس وہی سندری تھی۔ اس واقعے کے بعد رادھے کرشن اپنے گناہوں کی آگ میں خود جلتا ہے۔

رادھے کرشن کی کہانی کو مصنفہ نے ایک عبرت ناک ڈرامہ بنانے کی کوشش کی ہے جس میں وہ جزوی طور پر کامیاب بھی ہوئی ہیں۔ خاص طور سے وہ سین جس میں رادھے کرشن اپنی اکلوتی بیٹی کو قتل کرنے کے لئے اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔ گرچہ اس سین میں ایک اثر انگیز ڈرامہ بننے کی پوری صلاحیت موجود تھی لیکن وہاں صرف بیٹی کے احساسات ابھر کر سامنے آسکے۔ جو فطری اور متاثر کن ہیں لیکن قتل کرتے وقت باپ کے احساسات کی بہتر تصویر کشی نہ ہوسکی۔ اس کے عمل میں ایسی میکانکیت ہے جو صورت حال کے شدید تاثر کو مجروح کرتی ہے۔

اس ناول میں مصنفہ نے سماج کی چند اہم اور تلخ حقیقتوں پر قلم اٹھایا ہے لیکن کردار نگاری اور انداز بیان کی خامی نے ناول کو کمزور کر دیا ہے۔ کنول ٹھاکر کی کردار سازی پر اتنا زور صرف کیا گیا ہے کہ موضوع کی معنویت دھندلی ہوتی نظر آتی ہے۔ دوسرے یہ کہ کنول ٹھاکر کی خصوصیات اور دوسری حقیقتوں کے بیان میں بھی تکرار ملتی ہے۔ ایک ہی خصوصیت یا کیفیت کا بار بار بیان اکتاہٹ پیدا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کئی جگہوں پر بے جا منظر نگاری اور تقریری قسم کی عبارت بھی ملتی ہے جو ناول کے مجموعی تاثر کو مجروح کرتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ ناول ضرورت سے زیادہ ضخیم ہوگیا ہے۔

بعض کرداروں کی تخلیق کا بھی کوئی منطقی سبب سامنے نہیں آتا مثلاً بائی جی، ڈون وارٹن۔ یہ اپنی ایک الگ شخصیت تو رکھتے ہیں لیکن موضوع کو ابھارنے، پلاٹ کے ارتقا یا مرکزی کردار کی خصوصیات کو اجاگر کرنے میں ان کا کوئی رول نظر نہیں آتا۔ بائی جی بھی کنول ٹھاکر کی طرح ایک آئیڈیل کردار ہے۔ ناول میں ایک ہی خصوصیات رکھنے والے ایک سے زیادہ کرداروں کی موجودگی سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صورتحال کی شدت کو واضح کرنے کے لئے ناول میں یہ التزام رکھا گیا ہے۔

جہاں تک ناول کی پیش کش کا سوال ہے "تلاش بہاراں" کو یادداشتوں کے

سہارے پیش کیا گیا ہے اور خطوط کی تکنیک بھی استعمال کی گئی ہے۔ رادھے کرشن اپنی کہانی کا بڑا حصہ اپنی زبانی سناتا ہے۔ شوبھا کا کردار اس کے خطوط کے ذریعے سامنے آتا ہے جو وہ راوی کے نام لکھتی ہے۔ راوی کا کردار ایک میڈیم کی حیثیت رکھتا ہے جس کے ذریعے ہم کنول ٹھاکر، شوبھا اور دوسرے تمام کرداروں سے واقف ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ناول کے آخر میں راوی کے اس کردار میں حرکت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ گرچہ ناول کی ابتدا میں ایسا لگتا ہے کہ راوی ناول کا ایک اہم کردار ہو گا اور جس انداز سے وہ کنول ٹھاکر کو یاد کر رہا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس کی شخصیت کے تمام نہاں خانوں کا راز دار ہوگا لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ بھی سب کی طرح ساحل کا تماشائی ہے اس کی جو بھی معلومات ہیں وہ اس نے براہ راست کنول ٹھاکر سے نہیں حاصل کی ہیں بلکہ اس نے میرا سے حاصل کی ہیں۔ لہٰذا فاصلے کی اس دھند نے کنول ٹھاکر کے کردار کو ہیولا بنا دیا ہے۔

ناول کی ابتدا میں جب راوی اپنے بچپن کو یاد کرتا ہے اس وقت کا بیان دلچسپ اور اثر انگیز ہے۔ اس میں گاؤں کی سادہ زندگی کی حقیقی اور گھریلو تصویریں سامنے آتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے رسم و رواج اور اعتقادات کا سچا اور پرکشش بیان ہے لیکن یہ چیز اس ضخیم ناول کا ایک بہت مختصر سا حصہ ہے۔ مجموعی طور پر "تلاش بہاراں" ایک کمزور ناول ہے۔

"روہی":

ساٹھ صفحات پر مشتمل جمیلہ ہاشمی کا ناولٹ "روہی" ایک عشقیہ کہانی ہے۔ جو صوبہ سرحد کے پٹھانوں کے ایک گاؤں کے فطری پس منظر میں بیان کی گئی ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار مریم ہے۔ وہ اس گاؤں کے سردار نور خاں کی بیٹی ہے۔ مریم گاؤں کی دوسری لڑکیوں سے منفرد اپنا ایک مخصوص مزاج رکھتی ہے۔ اس کی شخصیت میں معصومیت کے ساتھ ایک انوکھا بانکپن ہے جو اس کے کردار کو منفرد، خوبصورت اور

پرکشش بناتا ہے۔

یہ ناولٹ بھی "تلاش بہاراں" کی طرح صیغۂ واحد متکلم میں بیان کیا گیا ہے۔ راوی خود ایک اہم کردار ہے بلکہ اسے کہانی کا ہیرو کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ یہ شہر کا رہنے والا ہے اور راجاؤں اور زمینداروں کے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے باپ کی خواہش ہے کہ اس کے بیٹے اپنی صلاحیتیں آزمانے باہر جائیں اور اپنی شخصیت کا اثبات کریں۔ لہذا اس نے اپنی مرضی سے ایک سپاہی کی زندگی منتخب کی اور اپنی ڈیوٹی کے لئے اس گاؤں میں پہنچا جہاں مریم رہتی تھی۔ اتفاق سے اسے گاؤں کے سردار نور خاں کے گھر کا ایک حصہ قیام کے لئے ملتا ہے۔ جس رات وہ اس بستی میں پہنچتا ہے اور سردار کے گھر قیام کرتا ہے اسی رات اس کی ملاقات گاری خاں سے ہوتی ہے۔

گاری خاں کا کردار ناول میں دلچسپ حیثیت رکھتا ہے۔ وہ گاؤں میں دیوانہ مشہور ہے لیکن یہ دیوانہ بڑی فرزانگی کی باتیں کرتا ہے اور اکثر و بیشتر گاؤں کے لوگوں کی نقل و حرکت، ان کے مزاج، ان کے عادات و اطوار پر معنی خیز تبصرہ کرتا ہے۔ پہلی رات ہی گاری خاں راوی کو اطلاع دیتا ہے کہ:

> "مریم لڑکی نہیں ایک قوت ہے۔ تم شیر سے لڑ سکتے ہو مگر مریم کسی بھی آدمی کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ تم مریم کو نہ خرید سکتے ہو اور نہ ہی ہار دے سکتے ہو۔" [۱۱]

مریم کی شادی گاؤں کے ایک پٹھان بلند خاں کے بیٹے عیسیٰ خاں سے ہونے والی ہے۔ مریم بظاہر اسے بھی کوئی اہمیت نہیں دیتی۔ راوی مریم کے حسن اور اس کے مخصوص مزاج سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ لیکن مریم شہر سے آنے والے اس امیرزادے کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتی ہے۔

ایک رات گاؤں میں جشن منایا جا رہا تھا۔ جشن میں مریم بھی شریک تھی۔ وہ بہت خوش تھی اور ناچ رہی تھی۔ راوی کو اس دلکش منظر سے لطف اندوز ہوتے دیکھ کر کہتی ہے:

"سائیں میں آپ کے لحاظ کے مارے ناچ رہی ہوں اور نہ پوسٹ سے
آئے ہوئے بڑے آدمی کے لئے ، میرا تو بس ناچنے کو جی چاہتا ہے "[۱۱]

مریم کی یہی خصوصیت اسے خود دار اور خود سر بناتی ہے ۔ اس کا یہ انداز راوی کے لئے ایک چیلنج بن جاتا ہے اور وہ اسے کسی بھی قیمت پر حاصل کر لینا چاہتا ہے کہ مریم نے اس کی انا کو ٹھیس پہنچائی تھی ۔ وہ بار بار مریم کے دل میں جھانکنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اس کے دل کا راز جان سکے لیکن اسے سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔مریم کی آنکھوں میں ، اس کے چہرے پر ، اس کی باتوں میں ایک شانِ بے نیازی کی جھلک ہوتی ہے ۔

"اس نگاہ میں احسان مندی نہ تھی ، وہ نگاہ تیکھی نہ تھی ، میٹھی نہ تھی ، اس
میں روشنی نہ تھی اور نہ تیزی ، بلند خاں کے بیٹے کی طرح شاید وہ مجھے
بھی کچھ نہ سمجھتی تھی "[۱۲]

اس کے باوجود ایک رات جب کہ گاؤں میں میلا لگا ہوا تھا اور جشن ہو رہا تھا ، راوی نور خاں سے مریم کے ساتھ شادی کی درخواست کرتا ہے ۔ چونکہ عیسیٰ خاں سرحد پر ہونے والی ایک جھڑپ میں اپنی ایک ٹانگ پر چوٹ کھا کر بیمار پڑا تھا اور موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھا ، نور خاں اس کی بات نہیں ٹال پاتا اور اس کی درخواست منظور کر لیتا ہے ۔ بالآخر مریم کی شادی کا دن آپہنچتا ہے ۔ راوی اپنی فتح پر نازاں اور خوشی میں سرشار ہوتا ہے کہ اسی دن عیسیٰ خاں کی موت ہو جاتی ہے ۔ اس خبر کو سن کر مریم جو ہمیشہ سمندر کی طرح خاموش رہا کرتی تھی اور جس کی اندرونی کیفیات کا اندازہ نہیں ہوتا تھا ابل پڑتی ہے اور اپنے سر پر خاک ڈال کر عیسیٰ خاں کے لئے ماتم کرتی ہے ۔ راوی اس حقیقت کو برداشت نہیں کر پاتا کہ مریم اب تک اس کی نہیں بن سکی تھی ۔ لہذا وہ وہاں سے ہمیشہ کے لئے چلا جاتا ہے ۔

راوی کا کردار ایک مخصوص نفسیات کی نشاندہی کرتا ہے کہ مریم اس کے لئے بذات خود کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی بلکہ اس کا حصول اس انا کی تسکین کا ذریعہ تھا ۔

عشق کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ اس کا انتظار کرتا جب تک کہ مریم کا غم ہلکا ہو جائے یا وہ اسے اپنے غم کا حصہ دار بنا لے۔ لیکن مریم کے اس غیر متوقع رویے سے اسے اپنی شکست کا احساس ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے اس سے دور ہو جاتا ہے۔ اسے مریم کو کھو دینے کا کوئی غم نہ تھا۔ اگر غم تھا تو اپنی ذات، اپنی انا کی شکستگی کا۔ وہ دراصل اپنی ذات کا عاشق تھا۔ ایک عمر گزرنے پر بھی وہ سوچتا ہے:

"مجھے کسی شے کا غم نہیں تھا۔ مگر میرے دل کے آسن پر ایک مورتی کی جگہ خالی ہو گئی تھی اور وہ مورتی میری اپنی تھی۔ آج تک میں نے اپنے آپ کو چاہا تھا۔ اپنے آپ کو عظیم جانا تھا۔ دل کے مندر میں مورتی بھی آپ ہی تھا اور پجاری بھی آپ ہی۔ صرف مریم کی آنکھوں نے میرے دل کے اندر جھانکا تھا اور اسے معلوم تھا کہ وہاں اس کی کوئی جگہ نہ تھی۔"[۱۳]

راوی تقدیر یا وقت یا اپنی انا سے شکست کھایا ہوا انسان ہے جس نے اپنی ہستی کے اثبات کی خاطر دنیا میں تگ و دو کی اور ایک کٹھن زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ اس راہ میں اسے مریم ملی جس کا حصول ہی اس کا مقصد بن گیا لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا اور زندگی بھر اپنی شکست کا بوجھ اپنے کاندھے پر اٹھائے ناکام پھرا کہ اپنی ذات سے جو اس کا عشق تھا وہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا۔ وہ اپنے آپ کو دنیا پر ثابت کرنے چلا تھا۔ شکست اور کھو دینے کا احساس اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ آخر میں یہ احساس شدید تر ہو گیا اب اسے ہر طرف ایک صدائے بازگشت گونجتی سنائی دیتی ہے کہ:

"وقت بیت گیا اور تم کچھ بھی ثابت نہ کر سکے۔ وقت بیت گیا.... اور وقت بیت گیا.... تم نے رینگنے والے ایک کیڑے کی طرح جی لیا۔"[۱۴]

اس طرح اس ناولٹ کا انجام بھی المیہ ہے:

"ردہی" میں ماحول کی پیش کش خوبصورت ہے۔ مصنف نے جس ماحول کو پیش کیا ہے وہ کردار نگاری اور مختلف مناظر کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کے ذریعے ابھر کر سامنے آ گیا ہے۔ پہاڑوں کے دامن میں بسے ہوئے گاؤں کی پوری تصویر وہاں بسنے

والے پٹھانوں کے مخصوص مزاج اور ان کے کردار کی خصوصیات کا ٹھوس اور اچھوتا بیان ملتا ہے۔ ان کے احساسات و جذبات ان کے رسم ورواج، طرزِ رہائش غرض کہ ان کی پوری تہذیبی زندگی چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔

ناولٹ میں دو طرح کی زبان استعمال کی گئی ہے۔ جہاں مناظر اور صورت حال کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ زبان سادہ ہے اور بیانیہ انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف — جہاں احساسات و جذبات کی عکاسی کی گئی ہے ، جمیلہ ہاشمی نے اپنے مخصوص شاعرانہ اسلوب کا سہارا لیا ہے۔ لیکن یہاں "تلاش بہاراں" کا سا مصنوعی انداز بیان نہیں ہے بلکہ فطری انداز پایا جاتا ہے۔ تشبیہات بھی ماحول کی مناسبت سے خوبصورت استعمال کی گئی ہیں۔ چند مثالیں دیکھئے:

"ان کالی آنکھوں میں گہرے توے کی سی ٹھنڈک اور تاریکی تھی۔"

"میں نے اپنا چہرہ مریم کی آنکھوں کی سی کالی رات میں اوپر اٹھا دیا۔"

"بوندیں محبت بھرے بوسوں کی طرح میری آنکھوں کے پپوٹوں پر، ہونٹوں کے کناروں پر، رخساروں اور ریت سے اٹے بالوں پر پڑنے لگیں۔"

"نیچے وادیوں میں چراغ ٹمٹماتے ہیں جیسے آسمان ہمارے قدموں میں بچھا ہو۔"

"دوج کا چاند ہولے سے دھند کے اوپر ریت میں دبے ہوئے سکے کے کنارے کی طرح چمکا ہے۔"

چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو

"چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو" جمیلہ ہاشمی کا اہم ناولٹ ہے۔ اس میں مصنفہ نے ایران میں شاہ قاچار کے زمانے میں پیدا ہونے والے ایک مذہبی فرقے کی سرگرمیوں کے توسط سے ایک مذہبی اور تاریخی کردار قرۃ العین طاہرہ کی زندگی کو

موضوع بنایا ہے۔ پس منظر کے طور پر بابی فرقے کی فکری اور جذباتی صورت حال سامنے آتی ہے۔ شیعہ مذہب کی رو سے قائم آل محمد کا ظہور ایک حقیقت ہے لہذا جب جب دنیا فسق و فجور سے بھر گئی ہے مہدی موعود کی آمد کا شدید بے چینی سے انتظار کیا گیا ہے اور وقتاً فوقتاً لوگوں نے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا ہے جس سے مختلف فرقے ظہور میں آتے رہے ہیں اور بہت سے معصوم لوگ ان کا شکار ہوتے رہے ہیں۔ "چہرہ بہ چہرہ روبرو" ایران میں پیدا ہونے والے ایک ایسے ہی بابی فرقے کی داستان سناتا ہے۔

ام سلمیٰ قزوین میں رہنے والے مجتہد خاندان کی بہو اور بیٹی ہے۔ وہ عام لڑکیوں سے منفرد ہے اس نے عام روایت کے برخلاف اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے اس کی شاعری کا ایک عالم میں چرچا ہے ساتھ ہی وہ حسن و ذہانت کا مجسمہ ہے اور موجودہ نظام حیات سے غیر مطمئن ہے۔ وہ بڑی شدت سے ظہور آل محمد کی منتظر ہے۔ وہ مسلسل ایک ہی خواب دیکھتی ہے جس میں ایک نقاب پوش دکھائی دیتا ہے اور وہ اس نقاب پوش کا روئے زیبا دیکھنے کی آرزو مند۔ اس کی شاعری کا مرکز و محور بھی وہی نا دیدہ اور پردہ پوش محبوب ہے۔ وہ اس کی تلاش اور زندگی کا حاصل ہے۔ لہٰذا اس کا ذہن مختلف قسم کے فلسفیانہ خیالات کی آماجگاہ ہے وہ اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات کا حل چاہتی ہے اس مقصد کے لئے وہ نجف اشرف میں رہنے والے عالم بزرگ سید کاظم رشتی کو خط لکھتی ہے۔ سید کاظم رشتی اس لڑکی کی فہم و فراست اس کی عبادت و ریاضت سے متاثر ہو کر اسے قرۃ العین پکارتے ہیں اور اسے اپنے درس میں شریک ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔

ام سلمیٰ جو ایک منفرد اور غیر معمولی ذہن و مزاج کی مالک تھی، اسے اپنی گھریلو زندگی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کے بچے اور شوہر جو اس کا عمزاد بھی تھا اس کے خوابوں اور خیالوں کا بدل نہ بن سکے۔ وہ سارے رشتے ناطوں کو بالائے طاق رکھ کر سید کاظم رشتی سے ملنے نجف اشرف چلی جاتی ہے لیکن اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی کاظم رشتی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اب کاظم رشتی کے مریدوں کو ایک رہبر کی

تلاش تھی جو ان کے سوالوں کا جواب دے سکے۔ اس رہنما کی تلاش میں ملا حسین بشروئی جو سید کاظم رشتی اور شیخ احمد احسائی کے فلسفوں کا شیدائی تھا شیراز جاتا ہے۔ شیراز میں اس کی ملاقات محمد علی سے ہوتی ہے۔ محمد علی "باب" ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ ملا حسین بشروئی نے باب کی تجلیاں دیکھیں اور اس پر ایمان لے آیا اور "باب الباب" کا خطاب پایا۔ نجف اشرف واپس آکر اس نے باب کے یہاں جو دیکھا تھا اسے بیان کیا اور اچانک قرۃ العین طاہرہ پر یہ انکشاف ہوا کہ یہی ہے وہ جس کی اسے تلاش تھی۔

"ہاں وہ خوبرد جو خوابوں میں کبھی دکھائی نہیں دیا، جو ہمیشہ اوٹ میں رہا، جو سرا پردہ اسرار میں پوشیدہ تھا وہ ظاہر ہو گیا....
اے لوگو اٹھو اور دیکھو اے لوگو جاگو اور حیران ہو وہ جس کا تجسس صدیوں سے تھا آن پہنچا وہ دنیا کو غم سے نجات دے گا۔" [۵]

اس طرح اس فرقے کے چار اہم ستون بن جاتے ہیں۔ محمد علی "باب" ملا حسین بشروئی "باب الباب"، محمد علی بار فروش جوان کے گروہ کا نوجوان عالم و فلسفی تھا۔ وہ "جناب قدوس" تھا اور قرۃ العین طاہرہ باب کی "حرف حئی" تھی۔ دن بہ دن اس گروہ کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ نئے مذہب کے دیوانے جن کا خدا ہی "باب" تھا اس پر اپنی جان نثار کرنا عین سعادت سمجھتے تھے۔ حکومتِ وقت کو اس بڑھتے ہوئے فتنے کا اندازہ ہوا جس کی تہ میں سیاسی عزائم اور حکومت کے خواب تھے۔ عبادت و ریاضت کے پردے میں خدائی کے دعوے تھے۔ باب قید کر لیا گیا۔ قرۃ العین طاہرہ کی اپنے محبوب کو ایک جھلک دیکھنے کی آرزو پوری نہ ہو سکی۔ وہ اس کے دیدار کے لئے جب جب سفر کرتی اسے کہیں اور بھیجا جا چکا ہوتا۔

اس درمیان قرۃ العین طاہرہ زبردستی اپنے وطن لائی جاتی ہے اس کے ساتھ اس کے تمام جاں نثار بھی ہوتے ہیں۔ ملا تقی جو ام سلمیٰ کا چچا تھا ان بابیوں کے ہاتھوں قتل کر دیا جاتا ہے اور وہ اپنے ساتھ قرۃ العین طاہرہ کو واپس لے جاتے ہیں۔ اس کے بعد باب الباب بھی قید کر لیا جاتا ہے اور ملا محمد جس کا قرۃ العین طاہرہ سے برائے نام رشتہ تھا

وہ بھی اس رشتے کو ختم کر دیتا ہے۔

قرۃ العین طاہرہ جہاں عظیم عبادتوں اور ریاضتوں کی شائق تھی وہیں اسے اپنے بے پناہ حسن کا بھی احساس تھا جس نے اس کے اندر کی عورت کو زندہ رکھا محمد علی بارفروش جو جناب قدوس تھا وہ اس فرقے میں تمام تر شمولیت کے باوجود اس فرقہ کی اصل حقیقت پر زیرلب مسکراتا تھا۔ وہ قرۃ العین طاہرہ کو عزیز رکھتا تھا اس کی ذہانت اور عبادت کے سبب نہیں بلکہ اس کے حسن کی وجہ سے۔ اس کی نظروں میں قرۃ العین طاہرہ کے لئے ایک پیغام تھا اور وہ اس پیغام کی کیفیت سے بے خبر نہ تھی۔ جب بارفروش نے اسے "زریں تاج" کہہ کر پکارا تو قرۃ العین طاہرہ کے اندر سوئی ہوئی عورت جسے ملا محمد ایک عمر میں نہ پا سکا تھا جاگ اٹھی:

"نہیں اس نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا دیا کیونکہ دائیں بائیں سے کوئی اسے پکار رہا تھا ام العالم نہیں، زریں تاج کہہ کر۔ زریں تاج۔ وہ اٹھ کر تیزی سے گھومی۔ مگر یہ پکار کہیں پرے سے آرہی تھی درد سے بے چین کرتی ہوئی ایسی سرگوشی کہ جس کو صرف وہی سن سکتی تھی وہ کھڑی ہو گئی اور اپنے سارے وجود کی قوت کے ساتھ سنتی رہی ..... کن نہاں خانوں کے اندر سے کوئی کشاں کشاں اپنی طرف کھینچتا تھا۔" [۱۱۶]

لیکن اس فسوں خیز رات کے تجربے کے بعد قرۃ العین طاہرہ کو "زریں تاج" کا وجود کہیں ڈوبتا نظر آیا اس کے ذہن میں اپنے اس عمل سے متعلق سوالات اٹھ اٹھ کر بے چین کرتے رہے:

"اس تماشے کی حقیقت کیا تھی۔ اس کے قوس زندگی میں یہ صعود تھا یا تنزل؟ یہ گناہ تھا یا ثواب؟ پھر گناہ و ثواب کیا ہے اگر حرف حیٔ منزّہ ہیں اور معصوم ہیں۔ اگر وہ معصوم ہیں تو یہ بے قراری کیوں ہے؟" [۱۱۷]

لیکن پھر قرۃ العین طاہرہ جو ایک عام عورت کی طرح پریشان تھی اس کی قوتِ ارادی واپس لوٹ آتی ہے وہ بے حجاب بارفروش کے خیمے میں جاتی ہے اور کہتی ہے۔

"خدا کے لئے تم چلو۔ مومنین کیا کہیں گے۔ یہ ساری عمارت جس کی بنیا دوں
میں معصوم لوگوں کا خون ہے تم نے گرادی ہے" [۵]

اس کے بعد قدوس اور قرۃ العین طاہرہ کی یکجائی کو ایک جشن کی طرح منایا جاتا ہے۔ جب وہاں سے یہ قافلہ کوچ کرتا ہے شاہ قاچار کی فوج اسے چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے قرۃ العین طاہرہ قیدی بنا کر شاہ کے دربار میں حاضر کی جاتی ہے۔ اسے عرصہ تک ایک گھر میں قید رکھا جاتا ہے۔ —— شاہ اسے معافی نامے کی اجازت دیتا ہے کہ اگر وہ معافی مانگ لے تو اسے اپنے حرم میں شامل کرے گا۔ شاہ نے کافی دنوں تک انتظار کیا لیکن قرۃ العین طاہرہ نے یہ دعوت قبول نہیں کی۔ بالآخر اسے گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا۔

اس طرح جمیلہ ہاشمی نے ایک تاریخی شخصیت کو اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے۔ گرچہ یہ ایک کردار کا ناول ہے لیکن قرۃ العین طاہرہ کے کردار کو مصنفہ بھرپور طریقے سے پیش کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ وہ ایک سپاٹ کردار کی حیثیت سے سامنے آتی ہیں۔ اس کی پوری زندگی میں سوائے چند ہلکے سے جھٹکوں کے کہیں بھی کسی کشمکش یا تصادم کا احساس نہیں ملتا۔ اس کا تصادم نہ تو سماج سے ہوتا ہے اور نہ اپنی اندرونی ذات سے جب وہ اپنا گھر، شوہر اور بچے چھوڑ کر کاظم رشتی کے درس میں شریک ہونے چلی جاتی ہے۔ وہاں جا کر وہ ان سب کو سرے سے فراموش کر دیتی ہے۔ جب ملا محمد اسے طلاق دیتا ہے تو بھی اس کے ذہن و جذبے میں کسی تصادم یا کشمکش کی کیفیت نہیں ملتی۔ صرف اس وقت جب اس کی بیٹی اس کے سامنے آتی ہے تو اس کے اندر ایک احساس ابھرتا ہے:

"ملا محمد کی بیٹی اس راستے پر کھڑی تھی جیسے روشنی اور اندھیرے کے امتزاج سے ابھرتی ہوئی کوئی خیالی تصویر ہو۔ " مادر" کسی نے پکارا۔ اس نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا، بے محابا اٹھ کر بازو پھیلائے اس کی طرف بڑھی اور دوسرے لمحے اسی تیزی سے واپس ہوئی۔ اور سجدے میں گر گئی۔

کانوں کو انگلیوں سے بند کئے ہوئے تیزی سے مناجاتیں پڑھتی ہوئی نہیں نہیں۔ میں اس پکار کا جواب دینے کے لئے نہیں ہوں۔ میں بہت آگے نکل آئی ہوں مختلف راہوں پر..... طاہرہ نے اپنا سر زمین کے ساتھ پیوست کر دیا۔ وہ اس پکار کو قطعاً نہیں سنے گی کبھی نہیں"[۲۹]

اس طرح یہ ناول اس ذہنی اور جذباتی کش مکش کو پیش کرنے سے قطع نظر قرۃ العین طاہرہ کی زندگی کا سا بیان بن کر رہ گیا ہے۔

اکثر جگہوں پر مصنفہ خود اس کردار کی ذہنی رو یا خیال کو پیش کرتے ہوئے اچانک راوی کی حیثیت سے اپنے تاثرات بیان کرنے لگتی ہیں۔ ایسے موقع پر قرۃ العین طاہرہ کی شخصیت اور اس کے احساسات ابھرتے ابھرتے دب جاتے ہیں۔

دوسری چیز یہ کہ اس ناول کا اختتام جسے ہم کلائمکس بھی کہہ سکتے ہیں، قرۃ العین طاہرہ کی سزائے موت کا واقعہ ہے۔ لیکن اس واقعہ کی پر اثر تصویر سامنے نہ آسکی۔ بالخصوص قرۃ العین طاہرہ کے ذہن و جذبے کی عکاسی اس موقع پر نہیں ہو سکی صرف اتنا کہنے پر کہ " وہ سفید لباس میں لپٹی مستعد، خوش اور منتظر تھی" اکتفا کیا گیا ہے جس سے کلائمکس کا تاثر واضح نہیں ہو سکا۔

دشت سوس

"دشت سوس" (۱۹۸۳ء) "چہرہ بہ چہرہ روبہ رو" کے سلسلے کا ہی ایک ضخیم ناول ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار حسین ابن منصور حلاج ہے۔ ابن منصور حلاج کا ذہنی رویہ اور اس کا انجام بھی قرۃ العین طاہرہ سے مختلف نہیں ہے۔ وہ بھی مسلمانوں کی مذہبی تاریخ کی ایک اہم شخصیت ہے۔ غالباً اسی لئے انور سدید نے "دشت سوس" کو تاریخی ناول قرار دیا ہے۔ وہ ایک تبصرے میں لکھتے ہیں:

"آرنلڈ بینٹ نے لکھا ہے کہ تاریخی ناول میں تخلیق کار تخیلی طور پر اس عہد کو تخلیق کرتا ہے جس میں اس نے زندگی نہیں گزاری۔ جمیلہ ہاشمی نے بھی منصور حلاج کے عہد کو اپنے تخیل کی معاونت سے حیاتِ نو عطا کی ہے"[۳۰]

اس بات کی تائید جمیلہ ہاشمی کے خیال سے بھی ہوتی ہے۔ وہ ایک انٹرویو میں تفصیل کے ساتھ بتلاتی ہیں کہ:

"بات یہ ہے کہ تاریخ نے مجھے ہمیشہ مسحور کیا ہے اور میں نے تاریخ کا مطالعہ عہدِ حاضر کی تاریخ کے تناظر میں کیا ہے۔ کیا آپ کے خیال میں قرۃ العین طاہرہ جیسی عورتیں آج پیدا نہیں ہوتیں؟ یہ جو آزادیٔ نسواں کی تحریکیں یا اپنے ماحول سے نبرد آزما ہونے کی کوششیں ہیں۔ قرۃ العین طاہرہ اس کی پیش رو ہے۔ اسی طرح وہ لوگ جو اپنے کسی خواب کے لیے کسی اعلیٰ مقصد کے لئے دار پہ چڑھ گئے میں نے انھیں لوگوں کو اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے۔ آپ بین السطور پڑھنے کی کوشش کریں تو اندازہ ہوگا کہ اس زمانے کے درباروں میں اور اس عہد کے ماحول میں جو سانحہ میرے ناولوں کے کرداروں پر بیتے ہیں ہو سکتا ہے وہ آج کے انسانوں پر بھی بیت جاتے ہوں۔ کل جس شخص کو دار پر چڑھایا جاتا تھا ممکن ہے آج اس کو الیکٹرک شوک سے ہلاک کیا جاتا ہو۔

میں نے ہمیشہ تاریخ سے ایسے کرداروں کا انتخاب کیا ہے جن کی آفاقیت نے مجھے متاثر کیا ہے۔ لوگ تاریخ کو ماضی کی آنکھ سے دیکھتے ہیں میں تاریخ کو اپنے عہد کے تناظر میں دیکھنا چاہتی ہوں۔

دیکھئے جیسے حسین ابن منصور حلاج کا کردار ذہن میں آیا اور میں نے اسے ناول کا موضوع بنانے کا فیصلہ کیا اس کے ساتھ ہی حسین بن منصور حلاج کے متعلق میرے ذہن میں کئی سوالات ابھرے مثلاً وہ کون سے عوامل تھے جس نے اسے دار تک پہنچایا اور وہ کیا چیز تھی جس کے پیش نظر وہ ہنستا کھیلتا اس منزل تک پہنچ گیا۔ ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے کے لئے مجھے اس کے دَور تک کا سفر کرنا پڑا۔ میں نے حسین بن منصور حلاج کے فلسفے کا اور اس دَور کے علمائے کرام کے فلسفے کا مطالعہ کیا اور پھر

اس تصادم اور ٹکراؤ پر غور کیا جس کے نتیجے میں منصور کی موت واقع ہوئی۔
اور یوں میرے ناول کا خاکہ تیار ہوا۔" ۲۱

جمیلہ ہاشمی کا یہ کہنا کہ وہ تاریخ کو اپنے عہد کے تناظر میں دیکھتی ہیں دشت سوس کے سلسلے میں ان کا یہ خیال محلِ نظر ہے۔ ہاں قرۃ العین طاہرہ کے بارے میں وہ ایسا کہہ سکتی ہیں وہ بھی صرف اس حد تک کہ قرۃ العین طاہرہ کے اندر صحیح یا غلط اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا حوصلہ تھا۔ اس نے سماجی اور اخلاقی بندشوں کی زنجیر توڑی لیکن یہ کہ قرۃ العین طاہرہ آزادئ نسواں کی علمبردار بھی ہے یہ چیز ناول میں واضح نہیں ہو سکی ہے بلکہ یہ ایک مرادی مفہوم ہے جس کے بارے میں ہم جمیلہ ہاشمی کے انٹرویو کے ذریعے واقف ہوتے ہیں۔

"دشت سوس" میں جمیلہ ہاشمی نے حسین بن منصور حلاج کے تاریخی کردار کی چھان بین اپنے عہد کے تناظر میں نہیں کی بلکہ اس کردار کے بارے میں جو چند سوالات مصنفہ کے ذہن میں پیدا ہوئے، اس کا حل تلاش کیا اور ابن منصور کو خود اس کے ہی عہد میں رکھ کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے کہ ابن منصور کے کردار کا کوئی ایسا پہلو سامنے نہیں آتا جسے ہم جدید عہد کا تناظر کہہ سکیں۔

انور سدید اور جمیلہ ہاشمی کے خیالات سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ "دشت سوس" ایک تاریخی ناول ہے اور مصنفہ نے "چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو" کے مقابلے میں اس ضخیم ناول کے ماحول کو زیادہ تر تاریخی رکھا بھی ہے۔ انھوں نے اس ناول میں ابن منصور کے عہد کے سیاسی اور سماجی انتشار اور دارالخلافہ بغداد کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی کا ایک جیتا جاگتا مرقع پیش کیا ہے اور دکھلایا ہے کہ جب قومیں زوال آمادہ ہوتی ہیں تو اس طرح کے انتشار سے قوموں کا واسطہ پڑتا ہے۔ اس انتشار کا ایک نقشہ ناول میں اس طرح ترتیب پاتا ہے:

"اس کے (خلیفہ متوکل اللہ) مشیروں کی طرح اس کے بیٹے بھی عزت و جاہ اور دولت کے دیوانے تھے۔ وہ اپنے ضمیر اور دماغ میں کسی مفاہمت

کے قائل نہ تھے۔ بے خرد، بے بصر اور بے ضمیر۔ ان میں اپنے اجداد کی اس سلطنت کے لئے اٹھائی ہوئی سختیاں بھول چکی تھیں۔ وہ متوکل کے خلاف ساری ریشہ دوانیوں میں کسی نہ کسی طور شریک تھے۔ ..... مامون کے وقتوں بلکہ اس سے بھی بہت پہلے یونانی فلسفے کے تراجم نے عرب و عجم کے عقائد کی صورت کو بالکل بدل دیا تھا۔ رواداری ایک حد تک تو ایک دور دراز تک پھیلی ہوئی سلطنت کے لئے بہت ضروری تھی مگر پھر آندھی سی چلی جس میں پوری زندگی ریت کے ٹیلوں کی طرح یہاں منتقل ہوئی تھی۔ آزادیٔ رائے تو قابل قدر شے تھی مگر زیادہ آزادی بے راہ روی بن گئی تھی۔ نئے نئے فتنے یہاں وہاں بھڑکنے والی آگ کی طرح جلتے اور بجھتے رہتے۔ پھر آلِ علی تھے جو خلافت کے مدّعی تھے اور ان کے دعوات گاؤں گاؤں قریہ قریہ پھرتے نامانوس راستوں سے سفر کرتے، راتوں کو بستیوں میں وارد ہوتے اور اپنے معاونین کے گروہ ترتیب دے رہے تھے۔ ان کی دلائی ہوئی جسارتوں سے ہوشیار ہوکر کئی جھوٹے نبی پیدا ہوکر اسلام میں رخنہ اندازی کرتے تھے۔ اسلام ایک ایسی عمارت کی طرح ہو گیا تھا جس میں دریچے ہی دریچے ہوں اور یوں دیوار کمزور ہو گئی تھی.... مامون کے دربار دربار میں جس کشت الحاد کی آبیاری کی گئی تھی وہ اس کو ویران کرنے کے درپے تھا۔ اسے معلوم تھا وہ اپنے کفن میں آخری کیل گاڑ رہا تھا..... وہ نہ صرف اپنی بلکہ مستحکم اور نہایت گراں قدر عباسی سلطنت کی شکست کا سامان پیدا کر رہا تھا۔ مگر سلطنتیں، قومیں آخر عروج سے زوال کی طرف اور زوال سے فنا کی طرف رواں رہتی ہیں۔ یہ سفر بہر طور جاری رہنا چاہیے کبھی کبھار اسے محسوس ہوتا کہ اس کی کشتی نہایت تیزی سے عمیق سمندروں کی طرف بہتی جا رہی ہے اور آخر اُلٹ جائے گی ؛ ۲۲ھ

اور اکثر ایسے عالمِ انتشار میں قومیں خدا پر اور اپنے بازو پر اعتماد کرنا چھوڑ دیتی ہیں اور ایسی بزرگ ہستیوں کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتی ہیں جو انھیں اپنی کرامات سے دنیاوی فائدے پہنچا سکے۔ حسین ابن منصور حلاج کے سلسلے میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا:

"وہ حاجتوں کا روا کرنے والا، دعا کرنے والا، رازوں کا جاننے والا کہلایا جانے لگا تھا۔ وہ جس کی طرف دیکھ لیتا اس کا مقدر بدل جاتا تھا۔ محملوں اور عماریوں میں پیدل اور سواریوں تک عمر رسیدہ اور جوان دوشیزائیں اور ازدواج، بیمار اور تندرست، مغموم اور خوش، شہزادیاں اور گداگر، اس کی شہرت دور دور پھیل گئی۔ وہ دلوں کا بھید جان لیتا۔ پوشیدہ چیزوں کے ٹھکانے بتا دیتا۔ لوگ اس کی پرستش کرنے لگے تھے۔

بغداد کی بیشتر آبادی اس کے اتباع کے لئے تیار تھی وہ کبھی اکیلا نہیں ہوتا تھا۔ وہ رات اور دن کے کسی حصے میں فارغ نہیں ہوتا تھا اور منصور کو محسوس ہوتا تھا جیسے ساری دنیا سوالی، بھٹکی ہوئی اور سچ کی جویا ہے..... انسان کتنا بے چین اور بدحواس اور گم گشتہ ہے۔ اس کا ایمان کتنا کمزور اور اس کی حاجتیں کتنی بے پناہ ہیں خدا نے یہ تماشہ گاہ بنائی تو ہے مگر اس کی آبادی کا کوئی سہارا نہیں۔ لگتا ہے بدحواس جان دار ایک دوسرے پر گرے پڑتے ہیں اور طوفان کی حالت میں مبتلا ہیں۔"[۲۳]

یہ سب کچھ ابن منصور حلاج کے دور کا تاریخی پس منظر ہے لیکن اس ناول کو محض تاریخی ناول کی حیثیت سے پڑھنا غلط ہوگا اس لئے کہ جمیلہ ہاشمی نے ہر چند کہ ناول کو بہت حد تک تاریخی رکھا ہے لیکن اپنے کردار کا کوئی ایسا تجزیہ پیش نہیں کیا ہے جسے ہم سماجی اور نفسیاتی کہہ سکیں۔ دوسرے لفظوں میں کردار کا ارتقا منطقی نہیں ہے جو سبب و علت (CAUSE AND EFFECT) کے دائرے میں آئے۔ مصنفہ نے حسین بن منصور حلاج کی متصوفانہ شخصیت کو جوں کا توں قبول کیا ہے اور اس کے روحانی سفر کو تخلیقی اور تاثراتی اسلوب میں پیش کیا ہے جسے وہ "غنائیہ" کا نام دیتی ہیں۔ جس کا مطلب

یہ ہے کہ یہ ناول زمانی اور مکانی تسلسل رکھتے ہوئے بھی سبب وعلت کی منطق کا پابند نہیں ہے اور ایسے تجربات ومحسوسات کو پیش کرتا ہے جو تمام تر مابعد الطبیعاتی ہے۔ اس طرح ابن منصور کی زندگی کا سفر، روحانی " ہے جو خالص مابعد الطبیعاتی مسئلہ ہے جس کی کائنات عقل (REASON) کے دائرے اختیار میں نہیں آتی۔

ابن منصور کے اس روحانی سفر کی داستان کو مصنفہ نے تین حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ " صدائے ساز " ، " نغمۂ شوق " اور " زمزمۂ موت "۔ پہلے دو حصّوں میں ابن منصور کے روحانی ارتقاء کی داستان بیان کی گئی ہے۔ جس سے ابن منصور کے بارے میں دو باتوں کا علم ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ بچپن سے ہی غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ پہلے حصّے میں اس کے بچپن کا زمانہ، ابتدائی تعلیم، تستر کی خانقاہ میں حضرت سہل بن عبداللہ تستری کی تعلیم اور پھر بصرہ کے قیام کا بیان ہے۔

دوسرے حصّے " نغمۂ شوق " میں ہم دارالخلافہ شہر بغداد میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ ناول کا سب سے طویل حصّہ ہے۔ یہاں حسین ابن منصور کا روحانی سفر عروج پر ہے۔ یہاں اس کی شخصیت اپنی تمام تر سحر سامانیوں کے ساتھ موجود ہے لیکن اس کی سحر انگیز شخصیت سے پردہ نہیں اٹھتا بلکہ اس کی شخصیت کا طلسم اور گہرا ہو جاتا ہے اور حسین ابن منصور کے کشف وکرامات کے مختلف منظر سامنے آتے ہیں۔

آخری حصّہ " زمزمۂ موت " ہے۔ اس میں ابن منصور کی سزائے موت کا بیان ہے۔ ابن منصور کی شخصیت ان تمام لوگوں کے لیے معمہ تھی جنھیں ان کی فکر بھی اور جو طریقت کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز تھے مثلاً سہل بن عبداللہ تستری اور جنید بغدادی وغیرہ۔ وہ حسین کے ساتھ ہمدردی کرتے تھے لیکن ان کا خیال تھا کہ یہ شخص بھٹکا ہوا ہے جس کا انجام سزائے موت کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ ایک ایسی واضح حقیقت تھی جس کا فائدہ خلیفۂ وقت اٹھا لیتا ہے۔ اور اپنی سیاسی طاقت کو استعمال کر کے اپنی رقابت کا بدلہ لیتا ہے۔ یہ رقابت اس حقیقت کے انکشاف سے شروع ہوتی ہے کہ حامد کی منظور نظر کنیز " اغول " جسے اس نے اپنے حرم میں شامل کر لیا تھا حسین ابن منصور کے

عشق میں گرفتار تھی اور اپنی موت کے وقت ابن منصور کے قریب تھی۔ خلیفۂ وقت اس انکشاف کو برداشت نہیں کر پاتا اور ابن منصور کی ہلاکت کے لئے اپنی تمام ریشہ دوانیوں کو کام میں لاتا ہے اور بالآخر حسین ابن منصور کو سزائے موت دی جاتی ہے۔

"دشت سوس" ایک دلچسپ ناول ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ حسین ابن منصور کی ذات اردو ادب اور شاعری کے لئے نئی نہیں ہے۔ لہٰذا اس شخصیت کو موضوع بنا کر لکھا گیا ناول فطری طور پر ہماری توجہ مبذول کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس ناول کی دلچسپی کی نوعیت داستانوں کی دلچسپی سے ملتی جلتی ہے جس میں ہم ایک ایسی کائنات میں داخل ہوجاتے ہیں جہاں سب کچھ ممکن ہے۔ ابن منصور ابتدا تا انتہا کسی غیر معمولی طاقت کا مالک یا اسیر نظر آتا ہے۔ ابتدا سے ہی کہانی کا ایک پیٹرن بن جاتا ہے جسے بہت حد تک داستانی پیٹرن کہہ سکتے ہیں۔ اس ناول سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہمیں ابن منصور کے عشق کی ماہیت یا نوعیت کو عقل کی کسوٹی پر پرکھے بغیر اس کے ذہنی اور روحانی اضطراب اور مابعد الطبیعاتی تجربات کی صداقت پر یقین کرنا پڑتا ہے۔

جمیلہ ہاشمی کے پہلے ناول "تلاش بہاراں" کے برخلاف "چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو" اور "دشت سوس" کی پیش کش میں ایک سنبھلی ہوئی کیفیت ملتی ہے۔ "تلاش بہاراں" کے پلاٹ میں جو انتشار ہے یہ ناول اس سے پاک ہیں۔ گرچہ ان ناولوں میں بھی شاعرانہ اسلوب کا استعمال ہوا ہے لیکن یہاں "تلاش بہاراں" کی طرح شعریت بجائے خود مقصد نہیں ہے بلکہ موضوع کی مناسبت سے یہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ قرۃ العین طاہرہ اور حسین ابن منصور کے نیم فلسفیانہ اور شاعرانہ کردار کی تجسیم اور ان کے سحر انگیز ماحول کی تعمیر کے لئے اسی طرز کی ضرورت تھی۔

بحیثیت مجموعی "چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو" اور "دشت سوس" "تلاش بہاراں" کے مقابلے میں زیادہ اہم تخلیق ہیں۔

دامانِ باغباں
(مجموعہ خطوط)
مرتّبہ:
قرۃ العین حیدر

دامانِ باغباں

(مجموعۂ خطوط)

مرتّبہ

قرۃ العین حیدر

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

DAMAN - E - BAGHBAN

EDITED BY

QURRATUL - AIN - HYDER

Year of Edition 2001

ISBN 81-87667-22-2
Price. Rs. 500/-

کتاب کا نام	دامانِ باغباں
مرتبہ	قرۃ العین حیدر
سنہ اشاعت اوّل	۲۰۰۱ء
قیمت	۵۰۰ روپے
کمپوزنگ	خالدہ تبسم
مطبع	کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی۔

Published by
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan Delhi-6 (India)
Ph.: 3216162, 3214465 Fax:91-011-3211540
E-Mail: eph@onebox.com

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۴۰۔	خجستہ اختر سہروردی	۱۰۶
۴۱۔	سیّد سجاد حیدر یلدرم	۱۰۹
۴۲۔	امتیاز علی تاج	۱۳۷
۴۳	عبدالقادر	۱۳۸
۴۴۔	ایم اے لطیف	۱۳۹
۴۵۔	حجاب امتیاز علی	۱۴۰
۴۶۔	بیگم شبیہہ زہرا افضل علی	۱۴۷
۴۷۔	سیّد حامد	۱۴۸
۴۸۔	مولانا رازق الخیری	۱۵۱
۴۹۔	سیّد حمید علی	۱۵۵
۵۰۔	جلیل احمد قدوائی	۱۶۱
۵۱۔	چودھری سر محمد ظفر اللہ خاں	۱۶۳
۵۲۔	یاسمین طاہر	۱۶۴
۵۳۔ ☆	۵ : نذر سجاد حیدر کے خطوط	
۵۴۔	نذر سجاد حیدر بنام وصل بلگرامی	۱۶۵
۵۵۔	نذر سجاد حیدر بنام خواجہ غلام السیدین	۱۶۷
۵۶۔	نذر سجاد حیدر بنام مولانا رازق الخیری	۱۶۹
۵۷۔ ☆	۶ : مراسلات قرۃ العین حیدر	
☆	(آ)	
۵۸۔	پروفیسر آل احمد سرور	۱۷۰

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۷۹۔	الیاس احمد گدّی	۲۳۵
۸۰۔	سیّد ابوالخیر کشفی	۲۳۷
۸۱۔	اکبر حیدری کاشمیری	۲۳۸
۸۲۔	اعجاز حسین بٹالوی	۲۴۱
۸۳۔	امجد اسلام امجد	۲۴۶
۸۴۔	اقبال ردولوی	۲۴۷
۸۵۔	اختر جمال	۲۴۸
۸۶۔	اختر بستوی	۲۴۹
۸۷۔	انیس دہلوی	۲۵۱
۸۸۔	اطہر عباس حیدر	۲۵۳
۸۹۔	اصغر حمید	۲۵۵
۹۰۔	دکتور الیس۔ حسن	۲۵۷
☆	(ب)	
۹۱۔	سیّد برکات احمد	۲۵۹
۹۲۔	کرنل بشیر احمد زیدی	۲۶۳
۹۳۔	بلقیس جمال بریلوی	۲۶۴
۹۴۔	بمل پرساد جین	۲۶۵
☆	(پ)	
۹۵۔	پروین شاکر	۲۶۶
۹۶۔	پریم کمار نظر	۲۶۷
۹۷۔	پروین عاطف	۲۶۸

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۲۱۶۔	ملک انصاری	۲۳۸
۲۱۷۔	ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن	۲۴۰
۲۱۸۔	پروفیسر محمد حسن	۲۴۲
	☆ (ن)	
۲۱۹۔	نثار عزیز بٹ	۲۴۳
۲۲۰۔	ن۔م۔راشد	۲۴۹
۲۲۱۔	نریندر لوتھر	۲۵۱
۲۲۲۔	نادرہ امتیاز	۲۵۲
۲۲۳۔	پروفیسر نیّر مسعود	۲۵۵
۲۲۴۔	نورالعین حیدر	۲۵۷
۲۲۵۔	نورالحسن راشد	۲۵۸
	☆ (و)	
۲۲۶۔	وجاہت علی سندیلوی	۲۶۰
۲۲۷۔	واجدہ تبسم	۲۶۱
۲۲۸۔	وشواناتھ طاؤس	۲۶۲
۲۲۹۔	پروفیسر وارث کرمانی	۲۶۳
	☆ (ہ)	
۲۳۰۔	ہاجرہ مسرور	۲۷۴
۲۳۱۔	ہرچرن چاولہ	۲۸۱
	☆ (ے)	
۲۳۲۔	یوسف ناظم	۲۸۲

جمیلہ ہاشمی

خانقاہ شریف
۸ رمئی ۶۳ء

پیاری اپنی بی بی..............دعائیں

بی بی تم اتنے دنوں کے بعد خط لکھتی ہو کہ مجھے انتظار کرتے کرتے تھکن سے پریشانی ہونے لگتی ہے۔ تمہیں معلوم ہے میں تم سے بہت دور ہوں ہمارے درمیان جانے کیا کچھ ہے کہ ہم کو دور اور دور کرتا جاتا ہے۔ یہ فاصلے بہت ظالم ہیں جب ایک بار پیدا ہو جائیں تو مشکل سے ہی عبور کئے جا سکتے ہیں یہ ذرا سہارا ہے کہ چلو خط لکھیں گے۔ مگر تم اسے بھی جواب نہ دے کر تقریباً ناممکن بنا دیتی ہو۔

جمیل جالبی نے میری خوشی کا لکھا ہے۔ جمیل نے خود میرے متعلق یہ فیصلہ صادر کر دیا ہے کہ میں سردار احمد کے معاملے میں بہت جذباتی ہوں لہٰذا میرا کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔ جمیل بھی شاید ٹھیک کہتا ہو۔ میری ایک اور ملنے والی ہے وہ بھی یہی کہتی ہے۔

پر تم دیکھنا کسی دن میں اپنی رنگوں کا پٹارا اُٹھائے پریوں کے دیس کا راستہ ڈھونڈنے اس سونے کے محل سے اکیلی نکل آؤں گی اور ضرور۔ صرف پناہ گاہ تعین نہیں کر سکی ہوں اور پناہ گاہیں تلاش کرنے میں اور آسرے ڈھونڈنے میں شاید اتنا وقت لگ جائے، اتنا کہ اکیلے چلنے کی ہمت ہی باقی نہ رہے۔ کبھی کبھار تو یہ سب اتنا آسان لگتا ہے جیسے پلک جھپکتے ہی سب کچھ ہو سکے گا۔ مگر اس کے بعد جھوٹی شرافت بلیوں کی طرح جگہ کی محبت یہ سب راہ میں آ جاتی ہیں۔ سو بی رانی تم نے دیکھا یکسوئی کیسے حاصل ہو۔ انسان ذرا سی سکون کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے۔ اور مدتیں گزر جاتی ہیں پھر بھی کچھ نہیں ہو سکتا۔ کچھ نہیں ہو پاتا۔ اب کے لاہور گئی۔ ہوم سائنس کے کالج کے سامنے سے

گزری تھی تو سوچا اچھو[1] سے ملوں پھر آگے نکل گئی۔ اب دو چار دن میں پھر لاہور جانے والی ہوں اور اگر اس نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا تو خیر ورنہ تم اسے فوراً لکھ دینا، کہ ایک بے حد موٹی بے ہنگم خاتون تم سے ملنے آئے گی اور اگر وہ اپنا نام جمیلہ ہاشمی کہے تو سچ جان لینا۔

ارے وہ گنجینہ گوہر۔ مجھے جمیل کی بیوی نے بھجوایا تھا۔ جمیل کو میں نے خوب شرمندہ کیا اور کہا کہ بھئی یہ تم نے نہایت ذلیل حرکت کی ہے اگر خودستائی کی ضرورت تھی تو اور سو طریقے تھے وہ قسم اٹھاتا تھا کہ اس نے تو یہ تعریف پڑھی ہی نہیں۔ غرض بی بی تم کسی سے بات کرو زمانہ یہ آن لگا ہے کہ کوئی کسی کی عزت نہیں کرتا۔ اگر فارغ بخاری نے لکھا تو ہم نے انہیں برا بھلا کہا۔ اگر تم اور میں لکھتیں تو کم از کم ان مردوں کا ایسا ذکر نہ کرتیں۔ ہر مرد کے اندر جھانکو تو کہیں نہ کہیں گھٹیا نکلے گا۔ ذرا سی بات پر رشتے ختم ہو رہے ہیں۔ چند لوگ نمونے کے طور پر نہیں بلکہ نوادرات سمجھ کر اچھے ہوں گے تو ان میں بھی کوئی نہ کوئی کمی ہوگی۔ ورنہ بس صاحب۔

نثار عزیز اب نیویارک کے فلک بوس منزلوں والے گھر کی مالک ہیں بھائی ہم سے ان سے مدّتوں سے خط و کتابت بند ہے۔ ہاجرہ کراچی چلی گئیں ہیں۔ ممتاز شیریں نے ہاجرہ کی تیسری منزل پر تبصرہ کرتے ہوئے تمہارے ذکر کے ساتھ ایک سطر کے سرمائے میں میرا ذکر بھی کر دیا تھا۔ ''اُن افسانوں سے لگتا ہے انہوں نے کبھی کوئی چوٹ کھائی ہے کہ درد ان کے افسانوں میں نغمہ بن کر پھوٹ نکلتا ہے۔''

انہیں دنوں میں نے اس کا افسانہ ''کفارہ'' پڑھا جس پر ہم قلم پرائز ملا ہے۔ بچہ تو تم جانتی ہو میرا بھی مر چکا ہے۔ میں نے یہ افسانہ پڑھنے کے بعد انہیں لکھا ہے کہ آپ نے درد کو نغمہ میں ڈھال لیا اچھا کیا۔ مگر میرے بوجھ کو کوئی لفظ سنبھال نہ سکیں گے۔ یہ درد ایسا ہے جو کسی نغمہ میں ڈھل نہ سکے گا۔ کوئی گیت ان کا حامل نہیں ہو سکتا۔ جب درد دل میں اُترتا ہے تو بہت گہرا اُترتا ہے پھر وہ کفارے جیسے افسانوں میں نہیں ڈھلتا۔ جہاں

---

[1] مصنفہ کی چچازاد بہن خالدہ حیدر مرحومہ

ماں ایک شاعر کی طرح سوچتی ہے شاید اُن کے اور میرے بچے کے سانحے میں فرق ہو۔
بی بی تم زندگی کے کنارے پر بیٹھی ہو سوچنے کی صلاحیت اس لئے باقی ہے لہروں کے تھپیڑے کھاؤ تو معلوم ہو۔ جب انسان ڈوب رہا ہو اور حواس غائب ہوں وہ ہاتھ پاؤں مارے کہ کسی طرح سطح کے اوپر اُبھر کر سانس لے سکے تو افسانے نہیں بنائے جا سکتے۔ تمہاری شادی نہیں ہوئی اور اگر ہوئی ہوتی میری طرح درمیان قعر دریا تختہ بند نہ ہوئیں۔ غرضیکہ تمہارے جگادری افسانوں کا سن کر مجھے خوشی ہوئی ہے۔

انعام کی بات یہ ہے بھائی کہ میرے انعام کے بعد سے اب جمیل الدین عالی زیادہ پابند ہو گئے ہیں اور خواتین میں سے ہاجرہ کو تو نامزد کیا جا چکا تھا لہٰذا وہ دونوں سے لڑائی لڑنے بلکہ کل عالم ادب سے جنگ کرنے کے ناقابل تھے۔ اس کا انجام یہ ہوا ارے بس یہ کیا کم ہے کہ تھوڑے دنوں کی سستی شہرت ہے چند ہزار روپے سے ہاتھ آ جاتی ہے۔ اب تو یہاں کے ادیب امیر ہو جائیں گے کیوں کہ اگر رفتار آدم جی پرائز یہی رہی تو یہ انعام سب تک پہنچے گا۔

سو بھائی اب گپ شپ سننے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ سب سے پہلے بھائی اعجاز بٹالوی سے شروع کرتی ہوں۔ جو لاہور میں جب جاؤں تو از راہِ کرم میری بہن کے ہاں مجھے ملنے آتے ہیں۔ اعجاز زندہ آدمی ہے گرمیوں میں ماسکو جا رہا ہے اپنا کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے مقدمہ لڑتا ہے افسانہ لکھتا ہے۔ بیوی کو بازار لے جاتا ہے اور بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے زندہ ہے۔ تمہارا ذکر آیا تو دیر تک ہم ماتم کرنے والوں کی طرح چپ چاپ بیٹھے رہے۔ تمہارے یہاں نہ ہونے سے جو خلا پیدا ہوا ہے اسے کوئی نہیں بھر سکے گا۔ تم لوگ خط و کتابت کیوں نہیں کرتے۔ ویسے کیا دوستوں کو خط لکھنا ایسا ہی مشکل کام ہے اپنی اعجاز اچھا آدمی ہے اس کے پاس ہونے سے زندگی کا احساس سا ہوتا ہے۔ وہ مجھے اچھا لگتا ہے۔ اس سے بات کر کے ہمت سی بندھ جاتی ہے۔ دوستوں کا دوست ہے۔ سب سے زیادہ یہ کہ اس کی بیوی بڑی پیاری ہے جیسے کھلونا ہو۔ اعجاز کے ساتھ کسی سوچ سمجھ والی ذہین بیوی کا تصور ہی مضحکہ خیز لگتا ہے۔ فلاحت اس کے ساتھ اتنی بے سہارا اور اتنی

پیاری لگتی ہے کہ میرے دل سے دُعا نکلنے لگتی ہے۔ یا ہم بھی کوئی عورتیں ہیں خدا کی قسم۔ خدا نے ہمیں بنا کر صنفِ نازک کی توہین کی اور یہ Awareness ہم کو لے ڈوبی۔ خطرناک طور پر ہم لوگ Alarmed سی لگتی ہیں اور مردوں کو ہم جیسی عورتوں کی بھی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ وہ گڑیا جیسی عورت سے خوش رہتے ہیں۔ اس لئے اگر مرد ہم لوگوں سے مل کر بھی کبھی ہم کو Seriously نہ لیں تو یہ عین فطرت ہے۔ آخر کون سدا ایک بوجھ کو اپنے ساتھ رکھنا چاہے گا۔ سوائے اصغر بٹ کے وہ محفلوں میں بیٹھ کر جناب نثار عزیز کی تعریف کرتا ہے، خیر۔

تو جناب وہاں حضرت قدرت اللہ شہاب سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان کی بیوی بچے کی زچگی میں بیمار ہوئی ہوسپٹل میں تھی مجھے اعجاز نے بتایا میں بھی گئی۔ ان کے بچے کو بھی میرے بچے کی طرح بیماری تھی وہ دوسرے دن مر گیا تھا۔ سردار احمد نیچے موٹر میں بیٹھے تھے۔ پانچ دس منٹ کے بعد ملاقات کا وقت ختم ہو گیا گھنٹی بجی شہاب مجھے پھاٹک تک پہنچانے آتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ یار لوگ بیویوں سے یوں ڈرتے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں اور دوستوں کا یہ Downfall دیکھ کر دل دنیا سے بے زار ہو گیا ہے اور انسانیت کے گھٹیا ہونے میں میرا یقین مکمل۔ تو شہاب سے دو منٹ کی بات چیت رہی پر خیر یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ۔ شہاب اچھا آدمی تھا۔

قدسیہ بانو اشفاق احمد سے ملاقات ہوئی۔ دونوں باتوں کے شیر ہیں۔ انہوں نے جو میری کتاب چھاپی ہے اس کی بات میں کرنے گئی تو اشفاق نے سردار احمد کو بکریوں کے بیان اور خوبیوں میں یوں الجھایا کہ بھائی مجھ سے بات نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ جب میں نے سُنا تو یہ کہ سردار احمد کہہ رہے تھے کہ آٹھ تاریخ کو آپ بکری کو لاہور اسٹیشن پر اُتروا لیجئے گا۔ وہی گھریلو پن کا پوز۔ اور ہم لوگوں کے پاس تو پوز بھی نہیں ہے۔

اور کسی سے ملاقات نہیں ہوئی۔ سوچتی ہوں ملازمت کر لوں تو خانقاہ سے نکلوں مگر تم جانو یہ بھی مجھ سے ہو نہ سکے گا۔ غرضیکہ یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں

ہو جائے۔

اب دیکھو اس قدر خالص گپوں سے بھرا ہوا خط تم کو لکھا ہے جس میں اطلاعات کا بھی خزانہ ہے اور تم ایسے خط پا کر جواب نہ لکھو تو تم کو کافرِ ہندی نہ کہوں تو کیا کہوں۔

زیادہ زیادہ دعاؤں کے ساتھ۔

تمہاری

جمیلہ بی بی

خانقاہ شریف

۱۳/ جون ۶۳ء

پیاری اپنی بی بی.........دعائیں

مجھے کچھ یاد پڑتا ہے کہ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تم پھر اس قدر دیر سے خط نہیں لکھا کرو گی۔ کیوں بھائی کیا اب ''فنون'' والوں کے خطوں کے جواب لکھنے سے فرصت نہیں ملتی جو تین تین ماہ میں جواب دیتی ہو اور وہ بھی ٹالنے کے لئے۔ میں تم سے زور دار لڑ پڑوں گی مگر تم اتنی دور ہو اور تمہاری خبر پہنچتی رہتی ہے یہی غنیمت ہے۔ کبھی مشرقی پاکستان یاد آتا ہے تو تم ضرور یاد آتی ہو۔ وہ بے پرواہ دن یاد آتے ہیں۔ شاید ہمارے لئے بہت تھا اور اس لئے تم دور جا بسی ہو۔ مینامتی کی رکشہ پر سواری اور ڈوبتے سورج کی روشنی میں ہم چاروں مٹے ہوئے نقوش ڈھونڈتے ہوئے۔ کومیلا کی وہ سڑکیں اور وہ گیت ؎

'' یہ جو محفل ہے ستاروں کی بکھر جائے گی
چاند کا میری نگاہوں کو ملے گا نہ پتہ''

اکثر یاد آتا ہے۔ انسان کے دامن میں ماضی صرف یادیں ہی تو رہنے دیتا ہے۔ اپنی وہ چند لمحے حاصل حیات تھے۔ تم نہیں ہو تو زندگی کا حسن مٹ گیا لگتا ہے۔ اپنی تم انجمن ہو سارے لوگ تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ تم تو ہیلن ہو مگر تمہارے لئے جنگ کرنے کون نکلے گا۔ کیوں کہ تمہارے جی میں تو وہ بھی نہ ہوگا جس سے ہیلن زندہ جاوید ہے۔

خیر۔ اب ریڈیو خانقاہ سے اُردو میں خبریں نشر ہوں گی۔

پچھلے دنوں میرے بھائی سعید کی شادی خانہ آبادی کی ایک زبردست ٹریجڈی ہوئی۔ کیوں کہ نکاح کے بعد سے رخصتی تک بڑے ہنگامے ہو گئے۔ ایک عورت جس سے اس کا رومانس رہا ہوگا۔ (سب بھائیوں کے رومانس ہوتے ہیں) نکاح کے دوسرے دن سسرال والوں کے گھر گئیں۔ اپنے کو سعید کی بیوی بتایا اور ساری شادی ٹھپ ہوگئی۔ ہم سب لوگ تب سے تو آج تک مستقل پریشان ہیں۔ میں پچھلے ماہ تقریباً منٹگمری اور لاہور رہی۔ لڑکی والوں پر یہ ثابت کرنے کے لئے اور جو حقیقت بھی ہے کہ سعید رومانس تو ضرور کرتا رہا مگر شادی وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑا تھا۔ مگر صاحب وہ لوگ کسی طرح راہ پر نہیں آتے۔ حال یہ ہے کہ سعید کا لندن جانا ستمبر میں ضروری ہے وہاں اسے تین سال رہنا ہے دوسری شادی نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا سمجھو کہ ہم لوگ کیوں نہ پریشان ہوں گے۔ اعجاز کی بیوی نے دوسرا بیٹا پیدا کیا ہے جو جب سے پیدا ہوا ہے بیمار ہے اس لئے اعجاز ہسپتالوں وغیرہ کے چکر میں اکثر لگا رہتا ہے اکثر شام کو بہت سعادت مندی سے بیوی کو شاپنگ کروانے لے جاتا ہے اور بچوں کو گود میں اٹھائے رہتا ہے۔ وکالت کرتا ہے اور گورنمنٹ کے خرچ پر اکثر دوسرے ملکوں میں جاتا ہے جہاں سے وہ واپس آ کر افسانے لکھتا ہے اور سمجھتا ہے اس نے بڑا تیر مارا ہے۔ دیکھا اپنی سوائے تمہارے گروپ کے بہت سے لوگ اسی Downfall کی وجہ سے قابلِ ذکر ہو گئے ہیں۔ شہاب سے ملنا ہوا۔ بہت دبلا ہو گیا ہے۔ بیوی سے سخت خائف ہیں۔ اس لیے ان کے بچے کی موت پر افسوس کا اظہار کرنے جو میں ہسپتال گئی تو بے چارے بہت لمبی

لمبی مجھ سے باتیں کر رہے تھے۔ پھاٹک تک پہنچانے آئے جہاں میرے میاں موٹر میں میرا انتظار کر رہے تھے (آئے مگر مارے ڈر کے راستے سے لوٹ گئے) بھائی وہ تو ہماری زندگی کا بہت بڑا پہیہ ہیں لہٰذا جو کیفیت اپنے سے مطمئن برسرِ اقتدار لوگوں کی ہوتی ہے ان کی ہے اور یہ سب اس لئے کہ روٹی کا مسئلہ ست یگ سے اس گھور کل یگ کے آخر تک حیاتِ انسانی کا سب سے بڑا مسئلہ رہے گا اور جس کی جتنی جگہ دنیا میں ہوا سے اتنی ہی زیادہ روٹی ملتی ہے۔ کئی لوگوں کو زندگی میں ذرا سی جگہ بھی نہیں ملتی اور وہ پاتال میں جانکلتے ہیں۔ جہاں اندھیرا ہے اور پروسرپائن تخت پر بیٹھی ملتی ہے مگر میرا خیال ہے جگہ نہ ملنے والے لوگ صرف دریا کے کنارے کھڑے رہتے ہیں اور کبھی پار نہیں اُترتے۔ کسی ناؤ میں انہیں بھرنے کی جگہ کہاں ہے۔ سوائے میری ''آگ کا دریا'' کی مصنفہ ''بس چہ باید کرد۔''

میں نے ''فنون'' میں تمہارا افسانہ قلندر پڑھا تھا۔ قاسمی صاحب نے ہم کو تو گھاس نہیں ڈالی کیوں کہ وہ خدیجہ کے عظیم ترین ناول کے چھاپنے والے ہیں تو انہوں نے World fame کے ادیبوں کے افسانے اکٹھا کئے۔ ''سیتا ہرن'' تو ایسا عظیم ناولٹ ہے کہ سالوں کے بعد پھر تم ویسا لکھ پاؤ گی؟ میں جب بھی دکھیا ہوتی ہوں (جیسا کہ اکثر ہوتا ہے) تو اسے پڑھتی ہوں۔

تو بھائی سیّد وقار عظیم صاحب سے ملاقات ہوئی میرا ذکر کچھ یوں کیا کہ تم کو لوگ پسند نہیں کرتے اس لئے کہ تم ہندی ملی اُردو لکھتی ہو اور لوگ تم کو جذبۂ حب الوطنی سے خالی جانتے ہیں۔ وہ مدھر کومل رسیلے سر انہیں پسند نہیں آتے، اس لئے یہ خیال پوربی کا الاپ بدل کر مجھے جو کچھ بھی کرنا چاہئے اس کی سمجھ مجھے نہیں آتی۔ تو سنو بھائی ہم نے بہت حسد کے جذبے کے تحت ایک ناولٹ لکھنا شروع کیا۔ مگر اپنی ایک گاؤں کی چھت کی کہانی مشرقی پاکستان کے سفر کے پیرہن میں بچ نہ سکی۔ اس لئے اس کی طرف سے منہ موڑ کر آج کل میں بچوں کی اچھی سی کہانی لکھنے کو سوچ رہی ہوں جو مجھے معلوم ہے لکھی نہیں جائے گی۔ ہمیں اپنے پہ سخت مایوسی ہوئی کہ تمہاری طرح سفرنامے اور محبت

نامے کو ملا نہ سکے اور لوگ ہندو کلچر کا مطالعہ کر کے تمہارے ''آگ کا دریا'' کی نقل میں ناول لکھ رہے ہیں۔ بس بھائی آج کل گرمی کے مارے دم پر بنی ہے۔

تم پر اتنی لعنتیں بھیجنے کو جی چاہتا ہے کہ خط نہیں لکھتی ہو۔ مصروف ہو پھر بھی خط لکھا کرو۔ سنا تم نے؟

لاہور جاتی ہوں تو جی چاہتا ہے تم نہیں تو تمہاری بہنوں سے ملوں مگر وہی بات کہ اتنی موٹی خاتون کو اگر انہوں نے پہچان کر نہ دیا تو اپنے پلے کیا رہ جائے گا۔ مری جانے کا پروگرام تھا۔ میرے میاں جا کر گھر لے آئے۔ پھر بی بی اس سارے میلے کے ساتھ تین ماہ جا کر کون رہے۔ سو دیکھو کیا بنتا ہے۔

دیکھو خط جلد لکھنا ورنہ جانتی ہو میں ایک پیر کی بیوی ہوں اور میری دعاؤں میں اثر ہے۔ میں اگر تمہارے لئے یہ دُعا کروں کہ خدا کرے میری طرح کی شادی تمہاری ہو جائے تو بولو کیا رہے باقی۔ پس اے بیوی ڈرو اس دن سے اور بطور نذرانہ ایک خط فوراً لکھو، اماں کو سلام کہنا۔ کہنا میری مغفرت کی دُعا کریں۔ ان کی صحت اب کیسی ہے لکھو؟

تمہاری دُعا گو

جمیلہ بی بی

خانقاہ شریف

۹/اگست ۱۹۶۳ء

پیاری اینی بی بی.........دُعائیں

تمہارا خط ملا اس سے پہلے شاہد صاحب کا خط آیا تھا کہ جمیل جالبی کو خوب چوٹیں لگی ہیں اُن کی کسی بس سے ٹکر ہو گئی۔ میں نے سوچا تھا کوئی خبر آئے خط لکھوں۔ پھر پتہ چلا کہ جمیل کو ایک ماہ کے لئے ڈاکٹر نے بستر پر لیٹنے کو کہا ہے۔ اس کے بائیں ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے اور دائیں ہاتھ ویسے ہی کچل گیا ہے۔ رکشا کی ٹکر بس سے ہو گئی تھی کسی

معجزہ سے جان بچ گئی ہے۔ اب میرا خیال ہے دس پندرہ دن تک کراچی جمیل کی مزاج پرسی کے لئے جائیں گے۔ میں سردار احمد کو ہولے ہولے راہ پر لا رہی ہوں۔

ممتاز شیریں کے ایک خط کا ذکر میں نے پچھلی بار کیا تھا تمہیں یاد ہوگا۔ ان کے خط میں کچھ جن وغیرہ کا ذکر تھا۔ میں نے کچھ یونہی لکھنے اور اس کو Refute کرنے کی خاطر اور کچھ سچ مچ لکھا کہ ہم لوگ جو اپنے آپ کو فن کار کہتے ہیں چار لائن لکھ لیں تو چوہے کی طرح پنساری بن بیٹھتے ہیں چھوٹی چھوٹی ٹر-بجک شخصیتوں کو کیچڑ میں گھسیٹتے ہوئے اپنے آپ پر نازاں ہیں۔ اپنی عظمت منوانے کے لئے دوسروں کے محتاج ہیں۔ کسی نے تعریف کر دی تو خوش ہو لئے وغیرہ وغیرہ۔ غرض یہ کہ ایک ایسی خاتون کی طرف یہ خط جو اپنے آپ کو "ممتاز شیریں"، افسانہ نگار کہتی ہو۔ کتنا بڑا جرم ہے۔ بس اس کا جواب نہیں آیا یقیناً وہ سوچتی ہوگی کہ ایسی چند قسم کی افسانہ نگار سے بات کرنا بھی بے کار ہے۔ کیوں یار کیسی رہی؟ وہ میری عقل پر رو تی رہی ہوں گی اور چونکہ باجرہ کراچی میں ہیں اس لئے انہیں جمیلہ ہاشمی کی کم عقلی کے متعلق بتایا ہوگا۔

نثار عزیز ہے تو Geniune مگر انہیں اپنے Geniune ہونے کا احساس بہت زیادہ ہے اور پھر انہیں بھی اپنے میاں کی پشت پناہی حاصل ہے۔ اس سارے جلسے میں ایک ہم ہیں جنہیں میاں کی زبان سے تعریف کا ایک کلمہ سننے کو نہیں ملا اور ایک تم ہو کہ تم نے کسی کو اپنا میاں نہیں بنایا لہٰذا اس پشت پناہی سے محروم ہو۔ یار میاں لوگ بیویوں کی افسانہ نگاری سے اس قدر مرعوب ہوں میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ بس یہ یونہی ہوا جیسے میں سردار احمد کی دولت سے مرعوب ہو جاؤں یا اس کے حسن سے وغیرہ وغیرہ۔ عورت اور مرد اس سلسلے میں بہت مختلف ہیں خیر تم نے وہ کتاب ہمیں کب بھیجنی ہے جس سے ممتاز شیریں کی نانی کے ہوش اُڑ جائیں گے۔ تصوّف اور بھگتی پر تمہاری زیرِ تصنیف کتاب "چراغوں کا سفر" کا ذکر سن کر میں نے بھی مدّتوں کے بعد مثنوی نکالی اور پڑھنے کی کوشش کی۔ تو بی بی بات یہ ہے کہ ہمیں برتن ڈھنگ سے منجوانا۔ آٹے، روٹی، دالوں والوں، مہمانوں کے چکر سے ہی فرصت نہیں ہو پاتی کہ سوچیں اور کام کریں۔ اب جب کہ تمہیں خط لکھ رہی ہوں اس طرف میرا دھیان ہے اور پھر یہاں

گرمی ایسی ہے جیسے جہنم میں جل رہے ہوں۔ اب عرس آنے والا ہے۔ اُسے بھگت پھر کہیں نکلیں گے۔ سوتم نے دیکھا بی بی پیاری اور تمہاری زندگی میں کتنا بڑا فرق ہے۔ میں ان سارے بکھیڑوں کو چھوڑ کر نکلوں تو بھی میرا دل ان میں اٹکا رہے گا۔ پر اب تمہارے افسانوں کا ذکر سن سن کر میرا جی چاہنے لگا ہے کہ میں بھی گھر سے نکلوں اور کام کروں۔ یہاں پر زندگی کے جو ہنگامے ہیں ان کی یہ مصیبت ہے کہ ذہن میں سوچ پیدا نہیں کرتے۔ بس صبح و شام گزرتے جاتے ہیں۔ کبھی دور پیڑوں کے جھنڈوں میں کسی چرواہے کی بانسری بجتی ہے کجاوٗں میں لدی براتیں رنگین کپڑے پہنے عورتوں کے کھنکتے گہنوں سے بھری اونٹوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کے سڑک پر اِدھر اُدھر آتی جاتی ہیں۔ سویرے طوطے کے بولنے سے شام کو درختوں پر بسیرا کرنے والی چڑیوں تک دن خاموش تپتا ہوا سہا سہا سا گزر جاتا ہے۔ تم بادوباراں کے طوفان میں بیٹھی ہو اور ہم دوزخ کی آگ میں جل رہے ہیں۔ سردار احمد کا پاسپورٹ بنا ہوا ہے۔ آج کل تم سے ملنے کو بے شمار جی چاہتا ہے کہ سوچتی ہوں ویزا بنوا کر انڈیا کا چکر لگا جاوٗں تم سے ملنا ہو جائے گا، ہوا بدل جائے گی، تم شاید میرے سوئے ہوئے ذہن کو جگا سکو، مجھے کچھ لکھنے پر تمہاری مثال سے ذہن شاید آمادہ کر لے۔ بہر حال بھائی اب تو سوائے ماتم شہر آرزو کے اور کچھ نہیں ہو پاتا۔ تم لوگ وہاں ادب وغیرہ کا کوئی ہنگامہ نہیں کرو گے کیا؟ تا کہ آئیں اور ان کی نمائندگی میں منّت سماجت کر کے میں بھی شامل ہو جاوٗں گی۔

میں جہاں بیٹھتی ہوں وہاں شاخ پر ایک طوطا جھول رہا ہے، ایک کوّا فوّارے میں نہار رہا ہے اور کسی طاق میں کبوتری ہولے ہولے غٹرغوں کہہ رہی ہے اور اب ایک زمانہ کی جس میں نہ دن ہے نہ رات، میرا پیچھا کر رہا ہے۔

اچھا بی بی اس بکواس سے تمہارا جی بیزار کر کے اب یہ احقر رخصت ہونے کی اجازت چاہتی ہے۔ اللہ تمہیں سکھی رکھے۔ بھگوان تمہارا اکلیان کریں۔

تمہاری

جمیلہ بی بی

خانقاہ شریف

۵ رنومبر ۱۹۶۳ء

میری بے حد پیاری اپنی بی بی..........دعائیں

میں لکھنے پڑھنے کے سلسلے میں یہ کرتی ہوں کہ گندم کو منگوا کر رکھا ہے پھر اسے کیڑے نے کھانا شروع کیا تو دھوپ میں ڈلوایا۔ ناپ تول روٹی کپڑا ان چکروں میں میرا سارا وقت گزرتا جارہا ہے اور تم کہانیاں لکھتی ہو نام پیدا کرتی رہو پھر جب تمہارا دیبانت ہو جائے گا تو تمہارے لئے نمبر نکلیں گے یا پھر اگر زندہ رہیں تو خاصے عطیہ فیضی کی طرح یا سروجنی نائیڈو کی طرح یا پھر فی الحال مجھے کسی اور خاتون کا نام یاد نہیں آرہا ہے۔

پس تمہارا خط پڑھ کر مجھے بہت پرسنتا ہوئی۔ میرا خط ایک قسم کا ہفت کشور سمجھ لو۔ اس لئے کہ میں اس خط کو اپنے شہر کراچی سے شروع کر کے جناب شہاب کی بیگم پر ختم کروں گی۔

میرا بھائی ولایت جارہا تھا ہم اسے پہنچانے کراچی گئے۔ پہلے دن وہاں پر داؤد ادبی انعام کا چکر چل رہا تھا۔ گورنمنٹ ہاؤس بقول شخصے ایک بے انتہا نفیس اور گنی چنی Gethering میں انعام دیئے گئے۔ ادیب اور یوں قبول کریں اور آنکھیں مارے بار احسان کے انہیں ہی نہیں۔ سو اس کے بعد چائے ہوئی اور وہاں پر میری ملاقات خانوادۂ داؤد کی خواتین سے ہوئی۔ سونے میں پیلی ہیروں میں چمکتی ہوئی سیدھی سادی خواتین جو زیادہ سے زیادہ Agatha cheatee کے ناول پڑھ لیں۔ اس کے بعد چائے پی گئی اور پھر صاحب سانس روکے اسے جب تک کے یہ سارا سلسلہ ختم نہ ہو گیا ترقی کی ایک اور منزل طے ہو گئی۔ عالی کے ہاں مع طیبہ کے چلی گئی تھی وہاں پر ماتم کرنے والوں کی طرح تمہیں یاد کر کے روتے رہے تم چلی گئی ہو پر اب تک لوگ تمہیں

[illegible]

تھیں۔ میں نے کہا اپنی کی بہت یاد آتی ہے کہنے لگیں ہاں اچھی تھی اور موضوع ختم ہو گیا۔ انہوں نے مجھ سے بڑی ٹھیٹ پنجابی میں ممتاز شیریں کے سامنے پوچھا کہ کیا حال ہے۔ میں نے کہا میرا حال تو اچھا ہے آپ (ڈرامے) لکھتی ہیں، کراچی لگتا ہے بہت زرخیز زمین ہے۔ پھر اس کے بعد اگلی شام کو فون پر ان سے ملاقات ہوئی کہنے لگیں۔ تمہاری بھابھی کیسی ہے۔ میں نے اپنا جی خوش کیا اور وہ مجھ سے بہت ناخوش ہوئیں۔ راستے میں صہبا بھی اسی موٹر میں تھے جو ہم کو پہنچانے آئی۔ ہاجرہ کا نام لینا ان کے لئے تکلیف دہ ہو گیا۔ سنا بعد میں میرے خلاف بہت کچھ فرمایا۔

ذکر ممتاز شیریں کا ـــــ

ان سے بھی ڈنر پر ملاقات ہوئی تھی۔ کسی نے تعارف نہیں کروایا ہم سے بات کرنے لگیں ہم نے بھی کی۔ آدم جی انعام کے لئے ہم نے کہا بھئی گھبرانے کی کیا ضرورت ہے یہ انعام ہر ایک پر پہنچے گا۔ پانچ ہزار کی رقم خاصی معقول ہے کئی طرح سے کام آسکتی ہے اور شہرت سوا الگ۔ کہنے لگیں ہم لوگ تو پہلے بھی لکھتے تھے اور لکھتے رہیں گے۔ کہنے لگیں مجھ سے مفصل ملو۔ میں یوں بھی جاننا چاہتی تھی کہ کتنے پانی میں ہیں۔ لہٰذا ایک شام گھومتے گھومتے ان کے یہاں پہونچی، دس منٹ تک انہوں نے انتظار کروایا، بعد میں برآمد ہوئیں تو کانوں میں پھول اور منہ پر تازہ پوڈر کی تہہ پینٹ وغیرہ خوب تھا۔ میں نے کہا کسی ڈنر میں جا رہی ہیں کہنے لگیں نہیں۔

بھئی ایک بات ہے ان کے یہاں کتابوں کا خوب Collection ہے۔ خاص طور پر اپنے بوگس انگریزی افسانوں کی باتیں کرتی رہیں جن کے انگریزی تراجم ابھی ابھی چھپے ہیں اور جن میں انہوں نے کوئی خاص بات نہیں کہی تھی۔ آج کل تو ہم لوگ اکٹھا وقت گزارتے ہیں۔ خدیجہ آئیں تھیں تو کسی دن نثار کے ہاں بیٹھتے تھے کسی دن ہاجرہ کے ہاں (افسوس اب ممتاز شیریں یہ ساری رونقیں چھوڑ کر۔۔۔۔ ہجرت کر گئی) اپنی ان کوٹھیوں کا ذکر کرتی رہتی ہیں جو کراچی میں تھیں۔ میں نے بھی ذرا شیخی مارنی مناسب سمجھی اور اپنے میاں کا چکر چلایا کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ انہوں نے بھی جواباً شیخی

کے طور پر بنگلور میں اپنی Coffee اسٹیٹ کا ذکر کیا۔ پھر انہوں نے اپنی "میگھ ملہار" مجھے دی۔ کافی کی ایک پیالی پلائی اور مجھے آنا پڑا۔ یار کیا میں بھی ایسی ہی کند ذہن غبی اور برخود غلط لگتی ہوں؟ (میں موٹی بھی تو ہوں) تو افسانے لکھنے چھوڑ کر کوئی اور کاروبار شروع کر دوں۔ میگھ ملہار میں کیسی دیدہ دلیری سے انہوں نے اپنے افسانوں کا ذکر کیا ہے۔ یا اللہ! تمہارا ذکر بھی آیا ہے۔ انہوں نے تمہارا کوئی افسانہ اپنے ایک انتخاب میں رکھا ہے۔ مجھ سے تمہارا پتہ مانگا میں نے دے دیا۔ تم سے بقول ان کے کسی زمانے میں ان کی بہت گاڑھی رہی ہے۔

ذکر عالی کا____

عالی کہنے لگے میں نے کسی طرح لوگوں کو نثر کے میدان میں شکست دی ہے۔ وہ آج کل "جنگ" میں سلسلہ وار" دنیا میرے آگے" لکھ رہے ہیں۔

میں نے اسے بری باتیں کہیں، اس نے مجھے اور بھی بری باتیں کہیں اور یوں ہماری ملاقات ختم ہوئی۔ آدمی خاصہ معقول ہے لیکن مجھے ہر وقت بری باتیں کہتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے اپنے سے بھی اسی طرح لڑتا ہوں۔ خیر اچھا خاصہ آدمی تھا سکریٹری وغیرہ ہو کر رہ گیا ہے۔

پھر یوں ہی لاہور چلی گئی۔ ایک صاحب ہیں مختار مسعود کسی زمانے میں بھاولپور کے ڈپٹی کمشنر تھے اُن کی بیوی کراچی کی ہے۔ بہت ہی سویٹ اور محبت کرنے والی۔ میری اس کی دوستی ہوگئی ہے مختار مسعود مداحوں میں سے ہیں اور چونکہ آج کل ادب میں افسریت کا دور ہے۔ وہ بھی شعیب کو الوداع کہنے والوں میں پیش پیش تھے۔ ایک دعوت کا حال جو انہوں نے مجھے سنایا حاضر ہے۔

شہاب بطورِ سفیر ہالینڈ جا رہے تھے۔

وہ ایک دعوت میں بیٹھے تھے کہ ایک نوجوان ادیب بچشمِ پرنم آگے بڑھے اور کہنے لگے کہ آپ تو ادیبوں کے خضرِ راہ ہیں (خضرِ حیات ہیں) اور بہت ہی روانی سے اس نے تعریف کی۔ بے چارے شہاب اس تعریف کو قبول کرتے ہوئے جھینپ رہے

تھے اور کھل کر بات نہیں کر رہے تھے۔ اس ادیب نے پھر کہا آپ ہمیں بھول تو نہیں جائیں گے۔ شہاب نے کہا نہیں میں یاد رکھوں گا وغیرہ وغیرہ۔ شہاب کو پیر سمجھ کر اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا رہے ہیں۔ یہ کیا منظر ہے۔ میں ایک دن دیر سے پہنچی تھی ورنہ اس تماشے میں شریک ہوتی۔ شہاب بہت عظیم آدمی لگ رہے تھے اور ان کی بیوی ایک سفیر کبیر کی بیگم۔ سیدھی لڑکیوں کا حشر تو بہت برا ہوتا ہے۔ اللہ اللہ۔

عنقریب میں لاہور شفٹ ہو رہی ہوں۔

ایک دن لاہور گھومتے ہوئے حمن[1] آپا مل گئیں۔ کریم بخش کے یہاں انہوں نے بتایا کہ اچھو کے ہاں آئی ہوئی ہیں۔

ڈاکٹر شاہ زمان گئی تھیں تو تم سے مل کر آئی تھیں۔

تمہاری

جمیلہ بی بی

لاہور

۲۷/۶/۱۹۶۴ء

پیاری اپنی بی بی۔ دعائیں۔

اگر تم کسی ایسی خاص وجہ سے مصروف ہو جس میں خط لکھنا قطعاً ممکن نہ تھا تو خیر میں تم کو معاف کیے دیتی ہوں۔

اگر تم نے اماں کی بیماری وغیرہ کی وجہ سے خط نہیں لکھا تو تب بھی تم کو بخشا جا سکتا ہے۔

مگر اپنی بی بی اگر تم نے اپنی وفاداریاں بدل ڈالی ہیں اور فنون والے گروہ کے ساتھ مل کر ہمیں بھلا دیا تو ہم تم کو کبھی نہیں بخشیں گے بلکہ تم نے کسی ایسی خاص وجہ کی

---

[1] مصنفہ کی چچازاد بہن بیگم حمیرا سیّد۔

بنا پر ہم سے قطعہ تعلق کرلیا ہے۔ جس کا ذکر ہم سے نہ کرسکو تو تب بھی تم قابلِ گردن زدنی ہو۔

بھئی تم کو یہ خط اس لئے لکھ رہی ہوں کہ اگر تمہارا دیہانت نہیں ہوگیا تو تم ہمیں خط لکھو۔

اب یہاں لاہور میں ایک سے ایک چغد جمع ہو گئے ہیں۔ مثلاً میں اور تجمل دونوں یہاں ہیں۔ وہ کمشنر آف انکم ٹیکس ہے اور میں خالی خولی گھر میں رہ کر دیواروں کو گھورا کرتی ہوں اور کبھی کبھار اسے فون کرلیتی ہوں۔ بلکہ یہاں تھنکرز فورم اس نے بنائی ہے اور بڑا بھاری ثقافتی میلہ افریقی ایشیائی لیول پر نومبر میں کرنے کی سوچ رہا ہے۔ ایک پرچہ یہاں سے نکالنے والا ہے غرضیکہ بہت ادھم مچ رہی ہے۔ جاوید کی شادی ہونے والی ہے اور اب وہ امریکی لڑکیوں کے ساتھ کم گھومتا ہے۔ خدیجہ ایک جلسے میں اپنی آپ بیتی کے سلسلے میں مل گئیں۔ واللہ ان لوگوں کی اتنی زوردار آپ بیتیاں ہیں کہ جواب نہیں۔ نقوش نے اپنا سوواں نمبر آپ بیتی نمبر نکالا جس میں خدیجہ کے پیارے سوتیلے بھائیوں کو لے کر اکلوتے سوتیلے باپ تک کا ذکر ہے، تمہارے ٹھنگرا کیدار کا بھی۔ میرا خیال ہے وہ تم نے کم لکھی ہوگی یا تمہارے حالات سے اخذ کر لی گئی ہے واہ سبحان اللہ۔

بھئی: غرضیکہ اے عزیز تمہارے خط نہ لکھنے سے مجھے اتنا افسوس ہوتا ہے اور آنکھوں میں آنسو آتے ہیں جیسے تمہارا آب و دانہ ہی اس دنیا سے اُٹھ گیا اور ہم ماتم کرنے والوں کی طرح دیر تک تمہارا ذکر کرتے ہیں۔ پھر دفعتاً چپ ہو جاتے ہیں اور آسمان کی طرف ماتھے اُٹھا کر سرد آہیں بھرتے اور تمہارے حق میں دعائے مغفرت کیا کرتے لیکن۔ کہو اب بھی تمہیں اپنے سر گباش ہونے کا یقین نہیں ہوا۔

زیادہ مغفرت کی دعاؤں کے ساتھ۔

تمہاری

جمیلہ بی بی

سمن آباد، لاہور
۱۶ر جولائی ۱۹۶۴ء

پیاری اینی بی بی

تمہارا ۱۱ ۳ر جولائی کا خط ملا پڑھ کر اس بات کی خوشی ہوئی کہ تم بہر حال ہماری گالیوں سے فوراً مرعوب ہوگئی ہو اور خط لکھنے کے سوا تمہیں کوئی چارہ نظر نہیں آیا خیر خیر۔

تجمل[1] کو میں نے تمہارا سلام دعا کہہ دیا تھا۔ کہہ رہا تھا تم جھوٹ بولتی ہو۔ اینی نے میرے لئے سلام نہیں بھیجا ہوگا۔ اگر اس نے یہ کرم فرمائی کی ہوگی تو میں اسے خود خط لکھوں گا۔ جاوید[2] سے ملاقات مشکل ہے۔ کیوں کہ آج کل مراقش میں ہے گویا نکاح اس لڑکی سے ہو چکا ہے جن سے اس کی ملاقاتیں نیویارک میں ہوئی تھیں۔ خود کہہ رہا تھا کہ مجھ سے دس گنا تو وہ امیر ہے اور ساری دنیا میں گھوم چکی ہیں۔ بے انتہا خوب صورت ہیں، بہت باتیں کرتی ہیں، میں نے کہا چلو امریکن لڑکیوں سے جان چھٹی۔

اماں سے سلام کہنا میں انہیں یاد بھی ہوں کہ نہیں!

اعجاز سے کوئی چار دن ہوئے ایک جگہ کے انتہائی ذلیل ڈنر میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ آج کل تقریریں کرتا اور مزید تقریریں کرتا ہے اور مستقل بڑا آدمی بنتا جا رہا ہے۔

خدا حافظ

تمہاری
جمیلہ بی بی

---

[1] الطاف گوہر کے برادرِ خرد راجہ تجمل حسین

سمن آباد
۳۱راگست ۱۹۶۴ء

پیاری اپنی بی بی..........دعائیں

تمہارا ۳۱راگست کا لکھا خط مجھے ۲۰ کو ملا جب میں ایک ہفتے کے بعد پنڈی اور مری کا چکر لگا کر آئی تھی۔ تم نے کیسری پڑھ کر میری ہمت افزائی کی، اس کا یہ فائدہ ہوا کہ میں نے خوش ہو کر اور یہ جان کر کہ بقول تمہارے چونکہ میری Creativity موجود ہے اور زوروں پر ہے، اس لئے اس زور کو میں کسی اور طرح آزماؤں، ایک ناولٹ لکھا اور آج صبح اس کا حرف آخر لکھا ہے۔ نام اس کا میں نے "رنگ ہجوم" رکھا ہے۔ بھاولپور کے قرب و جوار ہیں ایک علاقہ وہی ہے خواجہ غلام فرید نے بھی اپنے دیوان میں اس علاقے کی تعریف میں بہت سی خوبیاں لکھی ہوئی ہیں۔ پس میں نے تہذیب کے ہر مرکز سے دور ہٹ کر اس ادبی علاقے کو اپنا مرکز بنایا اور کہانی لکھ ڈالی۔ وہ جانے کب تمہاری نگاہوں کے سامنے گزرے اور تم مجھے بتا سکو کہ وہ کیسی لگی۔

سو بی بی میں نے اپنے حالوں تمہاری طرف سے کی گئی حوصلہ افزائی کا خوب فائدہ اٹھایا۔ ویسے کیسری اعجاز کو بالکل پسند نہیں آیا۔ کہنے لگے تم اس طرح کی عورت ہو یوں سوچتی ہو؟ کیا مور بذ کہانیاں لکھتی ہو۔ پھر اس کی میری ذرا سی لڑائی ہو گئی۔ وہ پچھلے ہفتے سے کراچی گیا ہوا تھا۔ کل اس کی بیوی فلاحت بیگم سے پتہ چلا وہ آ گیا ہے۔ اب کل شاید اس سے بات ہو سکے۔

تجمل حسین کمشنر ہے اور اپنی پوزیشن سے خطرناک حد تک آشنا ہونے کی وجہ سے کچھ خیرات میں ادب نوازی کرنا چاہتا ہے۔ اس نے کچھ ادیبوں اور زیادہ بڑے افسروں کو ملا کر ایک جماعت بنائی ہے جس کا نام تھنکرز فورم رکھا اور یہ جماعت اب نومبر میں افریقی ایشیائی لیول پر ایک ثقافتی میلہ کرنے والی ہے۔ اس کا اپنا پرچہ ہو گا اور تمام بڑے ادیبوں افسروں وغیرہ سے وہ کام لیا جائے گا جس کے وہ اہل نہیں ہیں۔ سو بی بی یہ تو ادبی گپ نمبر ایک ہوئی۔

دوسری بڑی گپ یہ ہے کہ عالی یکایک امتدادِ زمانہ سے بڑا آدمی بن گیا ہے۔ وہ ترقی اُردو بورڈ کا سکریٹری ہے۔ پریس ٹرسٹ کا بھی ہے اور خود اپنے میں گرفتار ہو گیا ہے۔ جنگ میں دس ماہ سے مستقلاً اپنے ایک ماہ کے سفر یورپ کی داستان لکھتا چلا آرہا اور دعویٰ یہ کرتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر اس کی نثر کے مقابلے میں کوئی شئے نہیں۔ اگر اس سے بحث کرنے کی کوشش کرو تو دوسروں کو بوگس نہ جانے کیا کہنے لگتا ہے۔ مجھ سے تو اس نے کبھی سنجیدگی سے بات نہیں کی۔ سمجھتا ہے میں بہت بوگس خاتون ہوں اور میں جواباً اسے بوگس کہتی ہوں۔ اکتوبر میں گلڈ کے انتخابات ہونے والے ہیں۔ بہنوں میں سے نمبر ایک بڑی والی جوزیادہ ہی تلخ ہے ایک جلسے میں مجھے ملی تھی اس کے بعد ان کی شکل دکھائی نہیں دی۔ وہ بڑے پن کے مارے بازار بھی نہیں نکلتیں مبادا کوئی دیکھ لے۔ آنگن کے چار ایڈیشن تو ہندوستان میں فروخت ہو چکے ہیں۔ میں نے کہا ''اسے پڑھنا بہت آسان ہے ایک دفعہ بیٹھ کر آدمی پڑھ سکتا ہے سوچنا سمجھنا کچھ نہیں پڑتا''۔ مل کر دوسری طرف منہ پھیر لیا اور پھر مجھ سے بات تک نہیں کی۔

بہت سی نئی خواتین ابھر رہی ہیں۔ بانو قدسیہ پرانے لکھنے والوں میں سے اپنے آپ کو نمبر ون ڈرامہ نگار بتا رہی ہیں۔ میاں بیوی دونوں بیٹھے نثار اور اس کے میاں کی طرح ایک دوسرے کی تعریف کرتے رہتے ہیں۔ آصف جلیل کو میں نے بھی دیکھا تھا وہ مختار مسعود کے یہاں مجھے ملی تھیں۔ مختار مسعود اُن کے بھائی کے دوست اور ان کی بیوی میری عزیز سہیلی ہے۔

تمہارے کہے کے مطابق میں نے اپنی آتشِ رفتہ فلم والوں کو دی ہے شاید کام بن سکے۔ تمہاری کہانی '' آوازیں'' میں نے ایک پرچے مستور میں پڑھی تھی بے حد پیاری اور جاندار کہانی ہے۔ اپنی تم اچھا اور مکمل لکھتی ہو کہ تمہارے بعد کسی کا قلم اُٹھانا بے وقوفی لگتا ہے مگر اب بھی کہانی لکھنے کی اور اسے بھجوانے کی کوشش کروں گی۔ تم اللہ کا نام لے کر اپنا پرچہ مجھے بھیجا تو کر دچوری ہو گیا تو میری قسمت۔ جمیل جالبی نے اپنی کتاب

"پاکستانی کلچر" بھیجی تھی اتنی پیاری کتاب ہے ایک خشک مضمون کے لئے ایسا جاندار طرزِ تحریر میں نے کم ہی دیکھا ہے۔ جمیل بہت نیک اور اچھا آدمی ہے۔ ایسے آدمی کا اس زمانہ میں ہونا حیرت کی بات ہے۔ تم اپنی مصروفیت کے باوجود وقت نکال کر پاکستانی دوستوں کو خط لکھا کرو۔ بھئی آخر تم پر ہمارا حق ہے۔

اماں کو میرا اسلام کہنا۔ انہیں یاد دلاؤ تا کہ مجھے بھی اپنی دعاؤں میں شریک کیا کریں خط کا جواب فوراً دینا ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔

تمہاری

جمیلہ بی بی

کراچی

۳رنومبر ۱۹۶۴ء

نہایت پیاری بلکہ بے حد دلاری اپنی بی بی

خط تمہارا میرے ۳۱راگست کے خط کے جواب میں لکھا ہوا مجھے اکتوبر میں ملا تھا اب تمہاری مصروفیت کا بہانہ بہت لمبا ہونے لگا ہے اور تمہارے خطوں سے وہ پیار غائب ہوتا جا رہا ہے جس کی جوت سے ہمیں سارا جگ روشن لگتا تھا اور تم بمبئی میں ہونے پر بھی بہت دور نہیں دکھائی دیا کرتی تھیں۔ سو اپنی بی بی تمہاری یہ نہایت کمینی خصلت ہے اگر چھوٹ جائے تو میں تمہیں انعام دوں ورنہ ہوگا یہ کہ میں بھی وقت اور جگہ کی دوری کو محسوس کرنے لگوں اور جانتی ہو نتیجہ کیا ہوگا؟ کسی جلسے یا میلے ٹھیلے میں تم سے ملاقات ہوگی تو میں کہوں گی اور تم بھی تقریباً ایسا ہی جواب دو گی۔ عزیزہ جو دم ہے سو غنیمت ہے اور دوست اس لئے روز روز نہیں لگ سکتے اور نئے پودوں کو کبھی آب و ہوا راس آتی ہے اور کبھی نہیں آتی۔ ہمارے یہاں کی ہوا میں نئے پودے پنپ نہیں سکیں

گے اور تمہیں ہم اس سرزمین سے باہر اگنے نہیں دیں گے۔ خیر یہ تو ہوئی اپنی بات اب جگ بیتی سنو۔ میرا میاں ایک عدد موٹر خریدنے آیا تو میں اس کے ساتھ ساتھ چلی آئی کہ سیر بھی ہو جائے گی اور دوستوں سے بھی مل لیں گے۔ اس لئے میں یہاں پر ہوں سو بی بی یہاں پر تو بڑے زور کی ادبی ہوائیں چل رہی ہیں اور ہر طرف وہی چرچے ہو رہے ہیں۔ یہاں پر گلڈ کا کتاب گھر ہے اس میں مصنف کے دستخطوں سے کتابیں فروخت ہوا کرتی ہیں تو جناب چھ نومبر کو ہاجرہ اپنی کتاب بیچیں گی۔

آج سات نومبر ہے بی بی اور جب سے میں نے تمہیں خط لکھنا شروع کیا ہے اس بیچ میں کئی باتیں ہو گئیں۔ نثار عزیز بٹ کو بھی اس کے میاں کے ساتھ ہوٹل فاروق میں مدعو کیا مگر وہ صاحب بہت لئے دیئے ہوئے آئیں ہم سے ڈھنگ سے بات تک نہ کی۔ اس کے بعد تمہارا ذکر سفرناموں کے سلسلے میں چل پڑا۔ تمہاری دوست کہنے لگیں کہ اپنی بھی گئیں تو سفرنامہ انہوں نے ضرور لکھا ہوگا۔ میں نے تمہارے سفرناموں کی خوبیاں گنوائیں تو جناب اور خفا ہو گئیں۔ یہ سب لوگ تم سے جلتے ہیں اور تم یہاں سے کیا گئیں گویا ان کے لئے میدان صاف ہو گیا۔ ہم تو نثار عزیز کے نزدیک کسی گنتی میں شمار نہیں ہیں اور ہمارے نزدیک ان کی بھی یہی عزت و توقیر ہے تھنکرز فورم کا ایک اجلاس جس میں افریقہ اور ایشیا کے ایک سے ایک بڑھیا رائٹر آ رہے ہیں دسمبر کے دوسرے ہفتے میں ہونے والا ہے کاش تم آ سکو تو تم سے ملاقات بھی ہو جائے اور تم شرکت کرو۔

جمیل کہہ رہے تھے کہ تم انہیں خط نہیں لکھتی ہو وہ کہہ رہے تھے کہ تم ٹائپ کروا کر اپنا خیریت نامہ رکھ لو ہر دو ہفتے کے بعد اس پر اپنے دستخط کرا کر اسے بھیج دیا کرو وغیرہ۔ اور یہاں پریس ٹرسٹ بنا ہے جس کے کرتا دھرتا جناب جمیل الدین عالی ہیں اور لکھنے والوں کے معاملے میں ہر شئے کے کرتا دھرتا سے دور ہی ہوتے جا رہے ہیں۔ تم اپنی بڑھیا فلمیں بناتی پھرو اور زمانہ کہاں سے کہاں نکل گیا۔ ''آگ کا دریا'' کو فلمانے کے لئے دل چاہئے اور بہت ہمت۔ اور سناؤ تم آج کل لکھ کیا رہی ہو۔ میرا افسانہ ''بجھتے دیئے'' چھپا ہے کیسا ہے یہ بھی تم پڑھ کر بتاؤ گی۔

اخبار جہاں ہم نے تمھیں سناڈالی اور تم مگر زندگی کی وہ باتیں جن کا پوچھنا اور سنانا ضروری ہے اتنے فاصلے سے۔ بہر حال فاصلے اپنی جگہ جامد ہوں مگر بڑی جاندار حقیقت بن کر زندہ ہوتے ہیں۔

اماں سے سلام ضرور کہنا۔

تمہاری

جمیلہ بی بی

سمن آباد، لاہور

۱۲؍دسمبر ۶۴ء

پیاری اپنی بی بی
دعائیں

فلسفیانہ موڈ

زندگی کے ہنگاموں اور رونقوں میں تمہاری یاد دل کے ساتھ ہوتی ہے مگر غم و فکر کے لمحوں میں بھی تم کو نہیں بھولتیں میری امی بیمار تھیں۔

فلسفے کے موڈ کی کہانی ختم ہوئی اگلا خط اگر جلد لکھو تو تم کو مختصر خط لکھوں گی کہ موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے۔

نوٹ: ارے بھئی خطوں کے قصے پر سو بار لعنت بھیجنے کو ہم تیار ہیں۔ اگر تمہارا خط نہ ہوتا تو مشاہیرِ عالم کے دربار میں.........کو کیسے جگہ ملتی۔

میں نے تو یونہی کہہ دیا بھلا یہ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی اشاعت کے لئے دیتی اپنی بی بی خط تو ایک بڑے راز کی شئے ہے یوں اس کی تشہیر تو میں کبھی پسند نہ کروں۔ تمہیں پتہ ہے ''کفارہ'' پڑھ کر میں نے ممتاز شیریں کو خط لکھا تھا اس لئے کہ ان دنوں میرے بچے کو

فوت ہوئے چند دن ہوئے تھے انہوں نے وہ خط فنون والوں کو بھجوا دیا اور مجھے اطلاع دے دی۔ میں نے فوراً انہیں خط لکھا کہ بھائی مجھے خط چھپوانا نہیں ہے یہ آپ نے کیا کیا فوراً فنون والوں سے خط واپس لیا۔ نتیجہ یہ رہا کہ فنون والوں نے خط تو واپس کر دیا اور مجھ سے سدا کے لئے بائیکاٹ کر لیا۔

میری جان اگر تم آتیں اور مجھے لکھتیں میں تب بھی خطوط کے اس احترام کی خاطر جو مجھے اس صنفِ ادب سے ہے نہ چاہوں کہ خط چھپیں خیر۔

''چھڈ و مٹی پاؤ''

''بیرآ کھیا جو گیا جھوٹھ بولیں۔ کون وچھڑے یا ملا وندا ائی''

والسلام

تمہاری جمیلہ بی بی

سمن آباد، لاہور

۳۰ر جنوری ۱۹۶۵ء

پیاری اپنی بی بی..........دعائیں

نیا سال مبارک ہو۔

تمہارا خط مل کر کاشف احوال ہوا۔ عزیز برخورداری یہ جہاں جس کو تم دارِ حیات اور میں دارِ فانی سمجھتی ہوں۔ اس میں نہ سکھوںؑ کی کہانیاں ہیں نہ مسلمانوں کی۔ بات انسانیت کی ہے۔ اگر میں اس کی بات کرنے میں کامیاب نہیں ہوں تو فائدہ ہی کچھ نہیں۔ تم مجھے اس سلسلے میں کچھ بتا سکو تو بتاؤ۔ ورنہ میں اب لکھنا ہی ختم کروں کیا لکھنا

ؑ جمیلہ ہاشمی نے اپنی اوّلین کتاب سکھوں کے متعلق لکھی تھی جن کی وجہ سے ان کو بے حد شہرت حاصل ہوئی۔

اور کیا آگے بڑھنا۔

تجمل کو میں نے تمہارا دُعا وسلام دے دیا تھا۔ اس کی لو لائف کا حال میں نے کیا پوچھنا اور کیا اس نے بتانا۔ وہ خود ہی اس عورتوں کے معاملات میں ماہر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں ایک دن تو سخت شرمندہ ہوئی جب یہاں پر آئی ہوئی ایک امریکن شاعرہ کو اسے ملوانے لے گئی۔ آج کل لاہور میں ایک جماعت تھنکرز فورم بنا کر خود اس کا سکریٹری جنرل بنا ہے۔ اور افریقی ایشیائی لیول پر اس کی ایک کانفرنس ۱۰ رفروری سے شروع ہو کر ۱۴ رمارچ کو ختم ہوگی جس میں ۲۳ افریقی ایشیائی ملک آرہے ہیں اور خود وہ اس ساری برات کے دولہا ہوں گے۔ میرا بھائی مجھے ایک دن کہہ رہا تھا تم سوائے ہنسنے کے اور کچھ نہیں کر تیں۔ میں نے کہا بولنے کا کام تم کرو ہنسنے اور سوچنے کا کام میں کروں گی۔ غرضیکہ عجیب مرنجان مرنج اور ہسوڑ آدمی ہے۔ اس کی بیوی کو میں نے ایک محفل میں دیکھا بڑی اچھی عورت لگتی ہے بیچاری ذرا کم رو تو ہے مگر کمال کا زور ہے وہ لڑنے مرنے والی بی بی ہے بھائی خاموشی سے اپنی جگہ کسی کو نہیں دے سکتی۔

جاوید کی بیوی سے میں نہیں ملی بھائی چونکہ میں نے اس کی شادی کو اس خاتون کے ساتھ بہت زیادہ Approve نہیں کیا تھا اس لئے اس نے مجھے بلوایا ہی نہیں۔ لوگوں سے سنا ہے کہ بس ایسی ہی اپنے آپ کو سورگ کی اپسرا سمجھتی ہیں۔ بہر حال میں تو اس خانوادہ سے ہوں شہزادیوں سے عشق کرنے والے اللہ اللہ دیکھو اسے جو دیدہ عبرت نگاہ بھر کر اللہ تمہیں اتنی طمانیت دے اور اتنا سکون کہ تم زندگی میں کبھی پریشان نہ ہو یہ میری دُعا ہے۔ ہندوستان سے تمہارے تھنکرز فورم کی میٹنگ میں خوشونت سنگھ اور ڈاکٹر تاراچند آرہے ہیں اور اللہ کے فضل سے تم سے ملنا جانے کب ہو سکے؟ اماں کیسی ہیں؟ انہیں میرا اسلام کہنا بہت زیادہ اور میرے لئے دعا بھی کرنا۔ جواب جلد دینا۔

خدا حافظ

تمہاری

جمیلہ بی بی

سمن آباد، لاہور

۲۴راپریل ۱۹۶۵ء

پیاری اینی بی بی

شکر کرو خدا کا کہ یہ خط تمہیں لکھ رہی ہوں ورنہ کل اگر میں مرگئی ہوتی تو تمہیں اپنی کتاب پر میرے نام کے ساتھ مرحومہ لکھنا پڑتا۔ بی بی کل میں نے ایک لمحے کے ہزارویں حصے کے لئے موت کو اپنے سے گزرتے دیکھا ہے۔ کل دوپہر میں اپنی ترنگ میں سمن آباد کی (اوپر جدھر بانو قدسیہ رہتی ہیں) سیدھی سپاٹ خالی سڑک پر فراٹے سے کار چلاتی آرہی تھیں (سردار احمد نے مجھے ایک گاڑی لے دی ہے) کہ سامنے سے دو بچے اسکوٹر چلانا سیکھتے پوری رفتار سے ایک گلی میں سے نکلے اور ٹکرا گئے۔ خدا نے خیریت رکھی اسکوٹر پہلے سیدھے ہاتھ کی بتی اور سامنے کے شیشے پر لگا بچے اچھل کر بیس گز کے فاصلے پر گرے موٹر قابو سے باہر ہو کر ایک کھمبے سے الٹی طرف سے ٹکرائی دروازہ نکل گیا اور چکنا چور ہو گئی اللہ جانے میں نے کیسے سوئچ بند کیا مگر تم جانو یہ موت کے منہ سے نکلنے کا سانحہ ہے میرا دل کل سے یوں دھڑکتا ہے جیسے اس میں پنکھے لگے ہوں شکر ہے خدا کا کسی کو خراش تک نہیں آئی مگر کچھ نہ پوچھو میرا کیا حال ہوا ہے کہ کانپتی رہی اور اتنا رونے پر بھی دل ہلکا نہ ہوا۔ یہ تو تھیں میری خبریں۔

احوال زمانہ

راجہ تجمل حسین الطاف گوہر کے چھوٹے بھائی

راوی یوں کہتا ہے کہ ٹھنکر زفورم کا ہنگامہ ختم ہو گیا اور تجمل حسین نے اپنے آپ کو کنونیر بنا کر فورم کو شاید توڑ دیا کہ اب اس کی خبر نہیں ملتی۔ تجمل کا سنا ہے کہ ۲۴ گھنٹوں میں اٹھارہ گھنٹے نشے میں دُھت رہتا ہے اور ہیرا منڈی کے کوٹھوں پر جا کر گانے سنتا ہے اور پھر وہاں مار کٹائی بھی ہوتی ہے۔ کہنے والے بہت کچھ کہتے ہیں مگر میرا اپنا خیال ہے کہ آدمی نہایت بے ضرر ہے اور ہماری حد تک تو بہت شریف بھی ہے اس کی بیوی سے

اکثر ملاقات ہو جاتی ہے۔ جاوید اقبال کی شادی خانہ آبادی ہو گئی ہے تجمل نے ایک دن مجھے فون پر ایک گپ سنائی وہ یوں ہے کہ کسی محفل میں ایک گانے والی تھیں وہیں پر منیرہ کے شوہر نے کہا کہ اچھا بھئی میرے سسر کی غزل گاؤ۔ گانے والی جب اس شعر پر پہنچی ''کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری ابتدا کیا ہے'' تو اس نے یوں گایا'' کہ میں اس فکر میں رہتی ہوں۔ تجمل نے کہا بھئی صلاح الدین یہ غزل تو تمہاری ساس کی لگتی ہے اس پر جاوید اٹھ کر چلے گئے۔ ایک دن تجمل نے کہا اپنی کا خط جمیلہ کو آیا ہے جس میں اس نے جاوید تمہاری بیوی کا حلیہ جو ہو سکتا ہے لکھا ہے بہت پریشان ہوا کہنے لگا خط دکھاؤ تجمل نے کہا جمیلہ کو میں نے واپس کر دیا، سنا ہے اب مجھ سے وہ خط مانگے گا۔ حاصل کلام یہ کہ تمہارا ذکر اب بھی یہاں کی محفلوں میں ہلچل مچاتا ہے۔ لوگوں کو تمہاری رائے کی بہت قدر اور اہمیت ہے یہی نہیں کہ تم جب تک یہاں تھیں تم نے یہاں بے کھٹکے حکومت کی ہے اب بھی تمہارا راج ہے۔ کہا جاتا ہے گلڈ نے جو ریکٹ خود کتاب فروخت کرنے کا چلایا ہے اس میں دو گھنٹوں میں دستخطوں سمیت ہاجرہ نے چار ہزار کتابیں بیچیں۔ واللہ عالم خدیجہ تو بہت کم دکھائی دیتی ہے۔

ہمیں تو کہیں نظر نہیں آئیں وہ لالہ دکھائی دے جایا کرتے ہیں اب بہت بڑے ہوتے جاتے ہیں۔

میں نے ''آبلہ پا'' نہیں پڑھی مگر میرا خیال ہے رضیہ فصیح احمد کے افسانوں میں جس طرح سطحیت ہوتی ہے کہیں کوئی گہرائی نہیں ایسے ہی اس کی کتاب ہوگی۔ اس سارے گروپ کی ہاجرہ کی اور رضیہ وغیرہ کی بہت دوستی ہے گلڈ کا انعام اب شاید ہاجرہ کو ملے۔ میں کبھی کبھار حلقے میں جاتی ہوں۔ پچھلے اتوار میں نے افسانہ پڑھا تھا'' تم جی ہو بہت بے ایمان'' پسند نہ آیا۔ میرا تو لکھ دیا ماشاء اللہ ماشاء اللہ۔ اے بیوی یہ لکھتیں کہ تم ایسے افسانہ مت لکھو تم سے تو یہ امید کی جاسکتی ہے کہ تم مروت میں تعریف نہیں کرو گی۔ صرف تم ہی تو ہو جس سے ہمیں سچی تنقید کی امید ہے۔ لوگوں کا یہ جلوس ممتاز شیریں۔ نثار عزیز۔ خالدہ اصغر الطاف فاطمہ لکھ رہے ہیں۔ نثار عزیز تو عسکری کی طرح شاید

خود روایت بننے کی فکر میں ہیں اور انہیں ایسا بنا رہے ہیں جناب جمیل جالبی ۔ نثار تو سدا سے شوقین ہیں بہت اونچی باتیں کرنے کی ۔ تم پر بہت رعب پڑا تو خیر اچھا ہی ہوگا ۔

ملک راج آنند کہتے تھے کہ ان کا ایک پاؤ بمبئی میں اور ایک چنڈی گڑھ میں ہوتا ہے میں نے کہا تھا اگر اپنی سے ملئے تو میرا پیار دے دیجئے میرا خیال ہے وہ تم تک ابھی نہیں پہنچا ۔ مجھے وہ بہت اچھے لگے ویسے تمہارے بڑے مداح ہیں ۔ یہاں تو جناب ہاتھوں پر اٹھائے اور سر پر بٹھائے گئے اور بہت ان کی خاطر مدارات ہوئی اور میرا خیال ہے ان کا دم غنیمت تھا اس سارے ہنگامے میں مجھ سے انہوں نے آتش رفتہ مانگی تھی میں نے انہیں ابھی تک نہیں بھجوائی تمہارے پاس بھی کہاں ہوگی؟

اپنا لکھو کیا کرتی ہو ماں کو اگر میں یاد ہوں تو میرا اسلام کہہ دینا انہیں کہنا میرے لئے دُعا کریں ۔

تمہاری

جمیلہ بی بی

سمن آباد، لاہور

۸؍جولائی ۱۹۶۵ء

اپنی بی بی........دعائیں

بی بی میں مری سے واپس آگئی ہوں ۔ پرچہ میری جان پر سوار ہے زندگی میں پہلی بار کسی ذمہ داری کا کام کرنے جا رہی ہوں اس لئے ذرا زیادہ سنجیدگی سے اس کو کرنا چاہتی ہوں ۔

تمہارے افسانے کا انتظار!

کرشن چندر اور سلمٰی نے افسانے ابھی تک نہیں بھیجے کیا وجہ ہے؟

میں اس وقت نہایت جلدی میں ہوں اور تم سے درخواست کرتی ہوں کہ اب بھیج دو افسانہ۔ مشکل ہے زمانہ۔ کڑا وقت آپڑا۔

جمیل جالبی اور بی بی نثار عزیز ہارورڈ تشریف لے جارہے ہیں۔ ہم اور تم خیر ان کے پرانے واقف اور دوست ہیں۔ جمیل جالبی کا کہنا ہے کہ نثار عزیز بہت لائق اور پڑھی لکھی ایک خاتون ہیں۔ خیر بھئی ہم سے تو ایک رسالہ بھی نکل نہیں پارہا۔ ہم ہیں کس قابل۔ رسالے میں مَیں نے اپنا پیسہ نہیں لگایا، میرے پاس اتنا فالتو پیسہ کہاں سے آتا؟ اس خط کو خط نہیں تار سمجھو اور افسانہ فوراً بھیجو ورنہ میں بہت گڑ بڑا جاؤں گی فوراً بھیجو بی بی۔

یہاں گرمی بہت ہے اتنی کہ دل جینے سے بے زار ہو جاتا ہے۔ تمہارے ہاں تو آندھی اندھیاری گھور گرج والی برساتیں ہوں گی اور سناؤ کیا حال ہے؟

میں پرچہ کے بعد تفصیل سے تم کو خط طویل وعریض لکھوں گی زیادہ دعائیں۔

تمہاری

جمیلہ بی بی

خانقاہ شریف

۱۰ر نومبر ۱۹۶۶ء

اپنی بی بی............دُعائیں

اتنے بہت دنوں کے بعد خط لکھتی ہو کہ آنکھیں خط کی راہ دیکھتے دیکھتے تھک جاتی ہیں اور میں جو اکیلی یہاں ہوں اداس اور پریشان ہو جاتی ہوں تم نے جو کچھ ''تلاشِ بہاراں'' کے لئے لکھا ہے۔ اور جو کچھ تنقید اس کی ملی وہ ٹھیک ہوگی مگر میں اس سے پہلے خط میں تم کو تفصیل سے اس کی شانِ نزول وغیرہ کے لئے لکھ چکی ہوں اور مزید کیا لکھوں گی۔ آج سے سات سال پہلے جب بقول تمہارے انسان کو اپنے لکھے کا ایک ایک لفظ صحیفۂ آسمانی لگتا ہے اور اب، اب تو اپنے اندیشوں اور تفکرات سے

کیسے نکلوں۔

اگر تم کو یہ لکھوں کہ میری شادی ایک خواب فلم کی طرح محض دو دن کے بعد ہی فیل ہوگئی تھی تو تم مانو گی نہیں۔ یا یوں سمجھو کہ میری یہ زندگی ایسی فلم کی طرح ہے جو چار آنے والے لچر طبقے کو پسند نہیں آئی اور میرے لئے یہ اسکوپ بھی نہیں کہ اسے کسی Festival کے لئے رکھ چھوڑوں میں اسے گھسیٹتی جا رہی ہوں اور اتنی بزدل ہوں کہ آگے بڑھ کر دنیا کے سامنے کبھی یہ اعتراف نہیں کروں گی کہ یہ زندگی نبھانا میرے لئے اب تقریباً ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ اتنا ذرا سا تو دیس ہے اس میں عافیت کا کوئی تو ہوگا جہاں چھپ سکوں۔ پھر آنے والے بچے کا مستقبل ہے اس کا کیا بنے گا۔ یعنی تم نے مبارک باد دی ہے نا مگر سوچو تو سہی آگے تو اس جہنم میں اکیلی میں ہی تھی اب ایک اور انسان بھی جھلسے گا۔

میرے میاں کا اصل Standard اس کی وہ بیوی ہے جس کے ساتھ وہ تیس سال سے زندگی گزار رہا ہے۔ میرے لئے مشکلوں سے نکلنے کا راستہ کہاں ہے کہ نکلوں اور جاؤں بھی تو کہاں جاؤں؟ اچھا ہے تمہارے پاس وقت نہیں ہے میرے پاس ہے تو میں اس کا کیا بنا سکتی ہوں؟

اور یہی سوال جو تم نے مجھ سے پوچھا ہے میں اپنے سے بار بار پوچھتی ہوں یہ Frustration کی زندگی کب تک گزاروں گی؟

میرے خیال میں میرا میاں کب تھا وہ تو سدا سے اس عورت کا ہے جو اس کی خالہ زاد بھی ہے۔ یعنی اب تم مجھے ڈانٹو گی ایسی شادی کرنے پر۔ تو سوال تو یہ ہے کہ اب کیا کر سکتی ہوں۔ میں نے نماز میں پناہ لینے کی کوشش کی ہے وہاں مجھے کچھ نہیں ملا۔ پڑھتے پڑھتے سب کچھ بھول جاتی ہوں دماغ سن ہو جاتا ہے۔

گلڈ نے لوگوں کو بہت فائدے دیئے ہیں۔ میں نے قدرت اللہ شہاب سے بامنت کہا تھا کہ مجھے کوئی نوکری دے دو مگر اس نے نہیں سنی کوئی کسی کی بات نہیں سنتا۔ اپنی زندگی میں روشنی کا کہیں وجود تک نہیں رہا۔ کوئی میرے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ اور پھر

بچے کا کیا بنے گا۔ منٹگمری جا کر کیسے بیٹھ جاؤں ماں باپ نے سر سے ٹالا تو اب وہاں کیا کروں گی۔ سدا کا جلنا ہے اور میں ہوں۔ کوئی سننے والا نہیں تم کہتی ہو میں اپنے آپ کو Disintegrate ہونے سے بچاؤں۔ اپنی بتاؤ میں کیا کروں؟

مجھے میری کہانیوں کا معاوضہ اب تک تو ایک پیسہ نہیں ملا۔ اپندر ناتھ اشک نے آتشِ رفتہ کو کتابی صورت میں چھاپ لیا ہے مگر وہی بات رائلٹی کیسے دیں گے۔ یہ لکھو تلاش کی خدمت میں اپنے آپ کو یوں فنا کر دیتی ہیں کہ خود بڑا صاحب بن جاتی ہیں تم اور میں ٹیڑھی دام کی طرح کبھی کسی شئے میں فنا نہ ہو سکے۔ لہٰذا اگر تم شادی کر تیں تو جو میرا حال ہوا سو تمہارا ہوتا اور آدمی ہر حال میں اس عورت کو پسند کرتے ہیں جن کے دماغ سے وہ خائف نہ ہوں جن پر اپنا رعب بٹھا سکیں اور پھر تم سے ایسا سر پرستانہ انداز میں ملنا اللہ اکبر۔ یعنی واقع اللہ اکبر۔

تجمل کی مجھے خبر کسی سے نہیں ملی۔ یوں اس سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ جاوید اس ہوٹل کے عین سامنے رہتا ہے جس میں ہم جا کر ٹھہرے ہیں کبھی وہ نہیں ملتا کبھی میں نہیں ہوتی اس لئے ملاقات نہ ہو سکی اس کی خاصیت یہ ہے کہ وہ بڑے باپ کا بیٹا ہے اب امریکنوں سے عشق کر کے اپنے آپ کو شاعر مشرق سے فرق ظاہر کرنے میں اس کا سارا زور صرف ہو رہا ہے۔

اب اگر تم میری Analysis کرنے پر اُتر ہی آؤ تو میں کیوں نہ خود بھی تمہاری ہم خیال ہو جاؤں۔ اپنی بی بی پر اب کیا ہو۔ اس لئے بہتر ہے کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں اپنی قید کو فراغت میں بدل رہی ہوں۔

باقی اب گلڈ کی ہمیں خبر نہیں۔ گلڈ لڑائیوں، فسادوں، حسرتوں کے لئے آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ شکر ہے ہم وقت پر علیحدہ ہو گئے اور عزت بچ گئی۔ ایک آدم جی ادبی مقابلے میں آتشِ رفتہ جا رہی ہے دیکھئے کیا ہو۔

زیادہ دُعاؤں کے ساتھ۔

تمہاری

جمیلہ بی بی

۱۰ر مارچ ۱۹۶۷ء
سمن آباد، لاہور

پیاری اپنی بی بی دعائیں!

بھئی اپنی کئی دنوں سے تمہارا خط نہیں آیا میں نے سوچا تمہیں عائشہ کی تصویر بھیجوں گی تو ایک اور خط لکھوں گی مگر تصویر کا معاملہ التوا میں پڑ گیا اور خط بھی اس مناسبت سے مزید لیٹ ہوتا گیا۔

بی بی کبھی کبھار تم بہت یاد آتی ہو۔

جمیل کا خط کل آیا تھا اس نے لکھا ہے ''بوجہ گونا گوں پریشانیوں سے میں اپنی بی بی کو بہت دنوں سے خط نہیں لکھا سکا کیا ہی اچھا ہو اگر میری طرف سے ایک خط لکھ دیں''۔ سو یہ خط میں جمیل کی طرف سے تمہیں لکھ رہی ہوں۔

جمیل 'نیا دور' سال دو سال میں ایک آدھ بار نکالنے کے قائل ہیں۔ ان کی پریشانیوں میں پرچہ لیٹ ہوا ہے اور اس میں میرا ایک ناولٹ ''روحی'' چھپ رہا ہے۔ دیکھئے کب نکلتا ہے۔

میں اب کے عید پر بچی کو لے کر خانقاہ جا رہی ہوں۔ آٹھ دس دن وہاں رہنے کا ارادہ ہے وہاں سے بھی ایک خط لکھوں گی مگر اس بیچ یہ خط ملتے ہی فوراً ایک دم تم اپنی خیریت کی اطلاع دو۔ اماں کیسی ہیں عاشی کی یہ انمول سی تصویر بھجوا رہی ہوں۔ اعجاز اور جاوید سمیت سب نئے پرانے آپ کو انتہائی اہمیت دینے پر تیار ہیں۔ ہاں بحمد اللہ شہاب صاحب نے ایک نہایت معقول بنگالی قسم کی چنگی داڑھی بھی رکھ لی ہے۔

اچھا اب رخصت۔

دعا گو
تمہاری
جمیلہ بی بی

خانقاہ شریف

۱۹۶۷ء

اپنی بی بی...........دُعائیں!

کل یہاں جمیل جالبی کا خط آیا تمہاری اماں کی فوتدگی کا لکھا تھا شاید تم نے کوئی خط مجھے بھی یہ اطلاع دینے کے لئے لاہور کے پتے پر لکھا ہو مگر مجھے تو نہیں ملا۔ بی بی تمہیں کیا لکھوں کہ جس سے تم صبر کرو۔ کیسے لکھوں کہ اس نقصان کی تلافی ہو سکے گی۔

وہ ماضی تھیں ہندوستان کے ایک عہدِ نصف صدی کی یادگار، ان کے چلے جانے کا یوں بھی افسوس ہے اور پھر وہ تمہاری اماں تھیں مجھے یاد آتا ہے جس دن ہم شاہد صاحب کے یہاں کھانے پر جانے والے تھے۔ (افسوس شاہد صاحب بھی نہ رہے اور کسی دن ہم تم بھی نہیں ہوں گے۔) شام کو محض مجھے دیکھنے کے لئے بیٹھی رہیں میں سدا یہاں ان کی صحت کے لئے فکر مند رہتی تھی۔ سردار احمد بھی اماں کے فوت ہونے کا سن کر بہت رنجیدہ ہوئے۔ تمہیں سلام لکھاتے ہیں اور تمہارے رنج میں شریک ہیں۔ دُعا کرتے ہیں کہ خدا تمہیں صبر و سکون دے اور اماں کو سایہ رحمت میں جگہ دے (آمین)

دُعا گو

تمہاری

جمیلہ بی بی

سمن آباد، لاہور۔
۲۸ر مئی ۱۹۶۸ء

پیاری اپنی بی بی.........دُعائیں

بی بی تمہارا خط آیا تو مَیں کراچی جانے کو تیار بیٹھی تھی مگر اعجاز حُسین بٹالوی کے گھر گئی وہاں ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی بھی مل گئے، ان سے خطوں کا ذکر کیا تو انہوں نے خود سارا مضمون جو میر افضل[1] علی سے متعلق تھا مجھے پڑھ کر سنا دیا میں نے کہا یہاں تک تو سب ٹھیک ہے مگر آپ مجھے ایک رات کے لئے دے دیں تو میں اسے نقل کر کے اپنی کو بھجوا دوں۔ اس کے لئے وہ ہرگز تیار نہیں ہوئے۔ میں نے پاس بیٹھے ہوئے اعجاز سے کہا مگر اس نے بھی کہا "بھئی جب یہ نہیں دے رہے تو میں کیا کروں"۔ پھر میں نے اعجاز کی بیوی کی مِنّت سماجت کی اُس نے وعدہ کیا کہ نقل کر کے ایک دو دن میں مجھے دے دے گی مگر کراچی سے آنے کے بعد پتہ چلا کہ اس کے ذہن سے یہ بات اُتر گئی تھی۔ میں ۲۵ تاریخ کو اُن کے یہاں گئی تو ڈاکٹر عاشق بٹالوی پھر ملے مگر وہ مسودہ پبلشر کو دے چکے ہیں اور اسے انہوں نے کہہ دیا ہے کہ پہلی کتاب تمہیں روانہ کر دیں۔ وہاں سے میں بے نیل و مرام واپس آئی اب بتاؤ قصور کس کا ہے۔ میں نے امتیاز علی تاج کو بہت فون کئے بالآخر انہوں نے بھی کہا کہ وہ مضمون اتنا پرانا ہے کہ ٹریس نہیں کیا جا سکا۔ میں نے اس کام میں اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کی مگر اللہ کو جو منظور تھا وہی ہوا۔

ڈاکٹر عاشق بٹالوی نے بتایا کہ تمہارا خط تمہاری خالہ بیگم افضل علی کو کسی اور رشتہ دار کے ہاتھ پنڈی میں ملا تھا۔ اعجاز سے مجھے پوری مدد کی امید تھی مگر اس نے ہاں تو کیا

---

[1] نذر سجاد حیدر کے بہنوئی اور فرسٹ کزن میر افضل علی مصنف تخیلات جو اُردو کے ایک صاحب طرز لیکن گمنام ادیب تھے۔ وہ پنجاب کے پہلے ہندوستانی اسسٹنٹ کمشنر بھی تھے۔ پطرس بخاری اور سر ظفر اللہ خاں کے بچپن کے دوست تھے۔ اُن کی والدہ اکبری بیگم کا مشہور ناول "گودڑ کا لال" ۱۹۰۷ء میں لکھا گیا۔ میر افضل علی نے ۱۹۳۷ء میں وفات پائی۔

زبان تک اس سلسلے میں نہیں ہلائی۔ اب اللہ سے امید رکھو کہ جب سال دو سال میں کتاب چھپے گی تو تم کو پہنچے گی۔ مَیں تم سے شرمندہ ہوں مگر یہ سب تمہارے دوستوں کے سبب ہوا خیر۔ میں کراچی میں تھی کہ تمہارے متعلق جمیل جالبی سے خبر ملی ہم لوگ اُن کے یہاں ہی ٹھہرے تھے میں جو دس بارہ دن رہی سوچتی ہی رہی کہ تمہیں یہاں سے خط لکھوں مگر وہی شاید مضمون کی وجہ سے لکھنا چاہنے کے باوجود بھی چپ رہی۔ پھر اُن دنوں اختر الایمان کی بیوی یہاں آئی ہوئی تھیں میں نے اس سے پوچھا کہ تم کیسی لگتی ہو کیسی ہو وغیرہ وغیرہ۔ وہ نہایت دُبلی پتلی خاتون تھی ساری ملاقات کے دوران ایک بار بھی مسکراہٹ اس کے لبوں تک نہیں آئی۔ دو باتیں تمہاری اس سے پوچھیں وہ بھی اس دیس سے آنے والے کا خیال کر کے تمہاری دوستی سلمیٰ صدیقی سے بہت ہے وہ کیسی ہیں کرشن چندر اب کیسے ہیں۔

عالی کی بیوی سے ملاقات ہوئی تو تمہارے خط کا ذکر انہوں نے کیا تمہارے وہ سارے ٹھاٹھ جن کا ذکر تم کبھی ہم سے نہیں کرتی ہو اُن کی زبانی سنے تو خوشی ہوئی۔ الحمدللہ ہاجرہ مسرور سے ملاقات ہوئی اُن کا To the point قسم کا رویہ تھا کہ ہمارے پسینے چھوٹ گئے۔ میں اب پھر ایک ڈیڑھ ماہ میں خانقاہ جانے والی ہوں۔

عائشہ اب سیانی ہو رہی ہے رونے دھونے اور تنگ کرنے والی نہیں شکر ہے خدا کا اور میرا جی بہت دنوں بعد خوش ہوا ہے۔ اللہ کا کرم ہے۔

سناؤ تمہارا کیا حال ہے؟ کاش میری عائشہ تمہیں دیکھ سکتی اور پھر خوش ہوتی کہ اس کی موسی کیسی اچھی ہیں۔ تمہیں بتاؤ میری بیٹی محبت کرنے والا دل لے کر پیدا ہوئی ہے۔ ابھی سے ہر کسی کو یاد کرتی ہے اور دوسروں کو خوش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ باقی کوئی گپ شپ نہیں۔

دُعاؤں کے ساتھ۔

تمہاری

جمیلہ بی بی

خانقاہ شریف
۵ر جولائی ۶۸ء

پیاری اینی بی بی..........دُعائیں

میں کراچی گئی تھی اور آ بھی گئی شاید آ کر میں نے تمہیں لکھا تھا ہاں لکھا تھا اور اس کا جواب بھی تم نے دیا تھا۔ ''نیا دور'' کے لئے تم کہانی بھیجو تو کرم کرو پچھلے شمارے میں نہ تمہاری کہانی ہے اور نہ میری۔ میں تو اب عاشی کی بیماری اور گھرداری اور سستی میں گھری ہوں اس لئے لکھنا لکھانا نہیں ہوا تم تو اب بہت سے غموں سے آزاد ہو دنیا میں نام پیدا کر رہی ہو۔ گرمی کا شباب ہے دھوپ چمکتی ہے ریت چمکتی ہے ہر شے تپ رہی ہے اور آدمی کا دل تک تپ جاتا ہے اس ریگ زار میں بھلا کوئی کیا جی سکتا ہے۔ خیر۔

تم سمندر کنارے مزے کی زندگی گزارو اور کتابیں لکھو کبھی بڑھاپے میں جب بچے بڑے ہو جائیں گے اور میں دنیا کے سفر پر نکلوں گی تو تم سے ملنا ہوگا اور تب ہمیں پتہ نہیں چلے گا کہ ہم کیا بات کریں۔

اپنے گلڈ کا ڈیلیگیشن باہر جا رہا ہے عالی نے مجھے بھی کہا ہے مگر میرا جانا ہو سکے گا یا نہیں عاشی تو ذرا سی دیر مجھ سے الگ نہیں ہوتی یہ میں کیسے برداشت کروں گی کہ اس کی چھوٹی سی جان کو تکلیف دوں۔ تمہیں اس کی تصویر لاہور جا کر بھیجوں گی۔ گفتگو کا چوتھا شمارہ جانے مجھے ملے کہ نہیں کیوں کہ تمہیں پتہ ہے ڈاک چوری ہو جاتی ہے اکثر بہر حال تمہارا یہ ناول بہت خوب ہے۔ میں نے بیچ کا نمبر نہیں پڑھا اب اللہ کرے یہ مل جائے۔

جمیل صاحب بھی بیمار رہتے ہیں اصل میں گھر کے کاموں کے علاوہ لکھنے پڑھنے میں بھی لگے رہتے ہیں اور کھانا اتنا کم کھاتے ہیں کہ قوت مدافعت نہیں رہتی تمہارے افسانہ کے نہ آنے کا اکثر ذکر کرتے ہیں۔

تو بھائی تم جلال الدین بخاری اُچ والے کی پوتی ہو ہندوستان میں کیا جھک مار رہی ہو یہاں آؤ کہ لوگ تمہارے قدموں پر جھکیں اور تم پر سے جان نچھاور کریں۔

اُچ تو ہم سے چالیس میل پر ہے اور میں خود پرسوں اترسوں تک وہاں جا رہی ہوں۔ سیّدانی اپنی بی بی تم آ کر کسی گدی پر بیٹھو تو کیسا رہے گا!

میرا گھر اب اتنا اچھا لگتا ہے کہ اس پر جنّت کا گمان ہوتا ہے کاش تم یہاں آتیں اور دیکھتیں۔ خیر یار زندہ صحبت باقی۔ ملک راج آنند ملیں تو میرا اسلام آداب کہنا۔

دعاؤں کے ساتھ۔

تمہاری

جمیلہ بی بی

لاہور

۲ر جنوری ۱۹۶۹ء

پیاری اپنی بی بی............دعائیں!

تمہارا خط پچھلے سال ملا تھا اور میں جواب دینے سے پہلے عاشی کی ایک اچھی سی تصویر کی تیاری میں لگ گئی کہ تمہیں بھجوا سکوں بس یوں جواب دینے میں دیر ہو گئی۔ یہ خط جس کا جواب میرے ذمّے ہے میری عدم موجودگی میں آیا تھا جس میں تم نے نہرو ایوارڈ کی بات لکھی تھی۔

عاشی کی تصویر تمہیں بھیج رہی ہوں۔ میں پچھلے دنوں کراچی گئی ہوئی تھی میرے میاں کو کوئی کام تھا وہاں میری ملاقات تو کسی سے نہیں ہوئی کیوں کہ میں فی الحال اپنے کسی اہرام کی تعمیر میں مصروف نہیں ہوئی اگر کہانیاں یہاں وہاں چھپتی ہیں تو پڑھنے والے لوگوں کا بھلا ہو جو ہمیں پڑھنا پسند کرتے ہیں کرشن چندر کا کیا حال ہے؟

واجدہ تبسّم سے لگتا ہے۔ تمہاری خوب گاڑھی چھنتی ہے۔ جواب جلد دینا کہ مجھے پھر بلاوا آیا ہے اور سب جنوب کی طرف پرواز کرنے والی ہوں۔ ہم لوگ صحرا میں

ہرن کے شکار پر جانے والے ہیں۔
دعاؤں کے ساتھ۔

تمہاری
جمیلہ بی بی

سمن آباد، لاہور۔
۱۰ر ستمبر ۱۹۶۹ء

پیاری اپنی بی بی
کل شام ہم لوگ پکچر دیکھ کر واپس آ رہے تھے میری بہن اور اُس کے بچے بھی ساتھ ساتھ تھے۔ عاشی نے کہا ''تمہیں پتہ ہے بھیا میری اپنی ماسی نے انگوروں والا کارڈ بھیجا تھا۔ بھیا نے پوچھا کہاں رہتی ہیں تمہاری اپنی ماسی''۔'' کہنے لگی بہت دور رہتی ہیں''۔ تم عاشی کے پاس ایک ایسا کارڈ ہو جس کا جواب بھیا کے پاس نہیں ہے کیوں کہ بھیا بے چارے کی تو کوئی ماسی بہت دور نہیں رہتی۔ میری عاشی کو ابھی سے تم اچھی لگتی ہو جب وہ بڑی ہوگی تمہاری کتابیں پڑھے گی ہوش اور سمجھ سے معاشرے کے متعلق سوچے گی تو اس کا سر غرور سے اونچا ہوگا اپنی ماسی کی وجہ سے۔ یار روس کی سیر کر کے آئیں، اور ہم کو ایک کارڈ اور ایک ذرا سے جملے میں ٹرخا دیا۔
جمیل جالبی کے لئے تم نے رپورتاژ لکھا ہم سے کہا؟
شکر کرو بھائی کم از کم چغتائی جیسے لوگ تو ہیں ورنہ......... میں ان سے مل کر کہہ دوں گی کہ تم کیا کہتی ہو۔
ویسے تو تم سخت مصروف رہتی ہو اور ہم عاشی کو کھلانے، پلانے، نہلانے سے

جو وقت ملتا ہے اُس میں کچھ لکھ پڑھ لیتے ہیں۔ امی کے پاس پچھلے دنوں میں گئی ہوئی تھی (اس وجہ سے میں تمہیں جواب دیر سے دے رہی ہوں) ملک راج آنند کو اگر میں یاد ہوں تو تم ملو تو ان سے میرا اسلام کہنا۔ بہت پیارے آدمی ہیں تم نے ہزاروں میل کا سفر لازماً کیا ہوگا، ہوائی جہاز میں۔ مگر جمیل الدین عالی کو تم پھر بھی نہیں ہرا سکتیں جن کے کانوں کے پردے ہوائی جہاز کے سفر کی وجہ سے متاثر ہوئے۔ دیکھا تم نے ہم بھی تمہارے مقابلے میں کچھ نہ کچھ پیش کر سکتے ہیں۔ پھر تم کو تو پرسنل سکریٹری ابھی تک نصیب نہیں ہوا ہوگا مگر ہماری فلاں فلاں خواتین میں سے ایک ایسی ہیں جن سے ملنے سے پہلے اُن کے سکریٹری سے وقت لینا ضروری ہے۔ دیکھنا تمہارے بعد ہم نے کیا کیا باتیں پیدا کی ہیں۔

اعجاز بٹالوی صرف اور محض وکیل رہ گئے ہیں عطیہ حبیب اللہ کی یاد اُن کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے مجھے تو لاہور میں رہتے ہوئے کم ہی نظر آتے ہیں دُنیا کا یہی احوال ہے بی بی۔

میں اپنی کتاب انہیں بھجوا رہی ہوں اور پھر برائے ریویو لکھا جائے تو شاید جا سکتی ہے بہر حال دُعا ہے کہ تمہارے رپورتاژ کا ہم کو بھی وقت نصیب ہو سکے۔ عاشی تمہیں پیار کہتی ہے کہ انگوٹھا لگانے کو تیار ہوئی ہے مگر میں نے بمشکل اسے باہر بھیجا ہے۔ بے حد شریر ہے نئی نئی باتیں پیدا کرتی ہیں جینا مرنا حرام کر رکھا ہے اپنی شرارتوں سے۔

تمہاری

جمیلہ بی بی

سمن آباد، لاہور۔

۱۸؍جون ۱۹۷۰ء

میری نہایت پیاری اپنی بی بی............جیتی رہو

تمہارا خط ملا تھا اتنی فرصت کہاں کہ میرے جواب کا انتظار کرو اس لئے سوچا اپنا مزے میں جب جی چاہے گا لکھیں گے۔ پھر کئی دنوں سے جی چاہنے کے باوجود لکھ نہ سکی پھر سوچا تم جولائی میں آنے والی ہو مل لیں گے خط کیا لکھیں اور پھر سب سے زیادہ ڈر یہ کہ تمہارا مطالبہ تو پورا نہیں کیا۔ وہ ایک صاحب ہیں صفدر میر تم شاید جانتی بھی ہوگی اُنہوں نے وعدہ کیا تھا کہ '' آتشِ رفتہ'' کا ترجمہ انگریزی میں کریں گے اُن کو میں نے کتاب دی تھی مگر ستم دیکھو کہ ابھی تک ملنا نہیں ہو سکا بھائی ہم نے اُردو میں لکھ کر کونسا تیر مارا ہے جو اب انگریزی کی دُنیا میں قدم دھریں اور رُسوا ہوں۔ آج کل ہمارے ایک افسانے کا گھر گھر ذکر ہے جو نیا دور میں چھپا ہے۔ اس میں لوگ باگ اپنی اپنی صورتیں تلاش کرتے ہیں گھبراتے ہیں اور جھلاّہٹ کے بارے میں ہم سے ہمدردی جتاتے ہیں، اُن میں سے ایک اپنے اعجاز بھی ہیں۔ کل اُن سے بات ہوئی کہنے لگے مجھے تم سے ہمدردی ہے اور میں مشورہ دوں گا کہ تم بیدی اور منٹو کو دوبارہ پڑھو۔ بس بیدی سے اگر کوئی مشورہ لیا جا سکتا ہے اور وہ میرے کسی کام آسکیں تو میں ضرور اُنہیں پڑھوں گی۔

لاہور تو تمہارا دیکھا ہوا ہے آج کل میں چھاؤنی کے علاقے میں اونچے پل سے اُتر کر (مال والا پل جو ائیر پورٹ کو جاتا ہے) سیدھے ہاتھ کو گھر بنوا رہی ہوں۔ گھر آدمی کا خواب ہوتا ہے بس اس خواب کی تعمیر میں لگی ہوں۔ عاشی اچھی ہے اور تمہیں آذر بائیجان سے بس آئے انگوروں والے کارڈ کے ناتے یاد کرتی ہے جب کبھی تمہارا ذکر آتا ہے وہ کہتی ہے '' امّی اپنی ماسی نے وہ کارڈ بھیجا تھا نا'' اب بڑی ہوگئی ہے کچھ دِنوں میں اسکول جانے لگے گی دیکھو تو ضرور پسند کرو گی مجھے تو پیاری لگتی ہی ہے پر لوگ بھی کہتے ہیں پیاری ہے باتیں بڑی بناتی ہے اور ابھی سے ستار سیکھنے کے شوق میں مجھے تنگ کرتی

ہے کہوتو تمہارے پاس بھیج دوں؟

میں نے اپنی کتابیں خود چھاپنے کا پروگرام بنایا ہے بلکہ میں اور جمیل صاحب مل کر یہ کام کریں گے۔ لاہور میں ایک دفتر اور ایک کراچی میں رہے گا۔ میں نے اپنی ایک طویل کہانی چھپنے کے لئے دے دی ہے پریس میں ہے تم اگر اجازت دو گی تو تم کو بھی ہم چھاپیں گے۔ جمیل صاحب نے عزیز احمد کو اُن کی کہانی ''جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں'' کے لئے لکھا ہے امید ہے انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ تم کو کوئی اعتراض ہے بھلا۔

کسی نے پچھلے دِنوں مجھ سے پوچھا کہ اپنی کشمیر کے کسی کالج میں پڑھا رہی تھیں میں نے کہا'' اسے کیوں اس واہیات کام کی ضرورت ہوتی بھلا''لوگ کیا کیا بے پر کی اُڑایا کرتے ہیں۔

امّی حج پر گئی تھیں میں اُن کو چھوڑنے اور لینے دو بار پچھلے تین ماہ کراچی گئی۔ وہیں جمیل صاحب کے خط میں تمہارے نزول اجلال کے متعلق سنا بلکہ پڑھا۔'' بھائی تم آنا مانگتی ہو تو ہم کو بھی بولو بھائی ہم بھی جی خوش کریں بھائی اپن تم کو بہت یاد کرتا ہے خدا قسم بہت یاد کرتا ہے۔''

اختر جمال سے ملاقات ہوئی تھی بالآخر جلدی میں تھیں مگر پھر بھی پندرہ، بیس منٹ باتیں کیں محمد نقوش کے ہاں ٹھہری تھیں۔ ایک انہوں نے بھائی چارے کا اتنا زبردست ریکٹ چلا رکھا ہے اور ایک اپنے لالہ نے دونوں ہر خاتون کو کھٹ سے بہن بنا لیتے ہیں۔ ایک تمہارے ہاں سے ممتاز مرزا آئی ہوئی ہیں وہ بھی قرائن سے لگتا ہے اُن کی بہن ہی ہوں گی سمجھ میں نہیں آتا اب محمد نقوش بڑے آدمی تو ہیں ہی بڑے بھائی بھی ہیں آپ کو لاہور میں اگر مکان اور کھانے کی تنگی ہو انہیں بھائی بنا لیجئے سب غموں سے آزاد ہو جایئے ہمیں تو اس سلسلے میں کوئی گھاس نہیں ڈالتا۔ ہم کو سخت وحشت ہوتی ہے کسی کو بھائی کہتے ہوئے ہم تو جمیل صاحب کو بھی بھائی نہیں کہہ سکتے حالانکہ میں جاتی ہوں تو برابر اُن کے یہاں جا کر ٹھہرتی ہوں۔

دُعاؤں کے ساتھ۔

تمہاری

جمیلہ بی بی

سمن آباد، لاہور۔
۸/اگست ۱۹۷۰ء

پیاری اپنی بی بی........دُعائیں

تمہارا خط کراچی سے ہوتا ہوا جمیل صاحب کے خط کے ساتھ ہی ملا۔ بھائی یعقوب میرا بہنوئی ہے پہلے جس مکان میں رہتا تھا اب اس میں نہیں رہتا لہٰذا میں نے بھی اپنا پتہ بدل لیا ہے۔ تم اتنے زمانوں بعد تو خط لکھتی ہو اور اس لئے تمہیں جو خبریں میں پہلے خط میں لکھتی ہوں بھول چکی ہوتی ہوں۔ بہر حال تم نے میرے خط پر اس قدر جلد ایکشن لیا اس سے میری طبیعت نہایت باغ باغ ہوگئی ہے اور مابدولت بہت خوش ہیں۔

کتابوں کا سلسلہ ابھی چلا تو نہیں مگر انشاء اللہ چل نکلے گا۔ تم سے اِجازت اخلاق لینی تو ضرور تھی ورنہ یہاں پر لوگ تمہاری کتابوں کے ساتھ جو ستم ظریفیاں کرر ہے ہیں خون کھولا دیتی ہیں پر افسوس کہ سوا ہم کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ ابھی میں نے قاسمی صاحب کو فون نہیں کیا کروں گی تو اُن کا کیا کرلوں گی وہ لوگ عرش پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں نیچے آنے کا نام ہی نہیں لیتے کیا کیا جائے خیر کوئی بات نہیں جی۔

یہ سن کر کہ تمہاری کتاب کا ترجمہ چودہ زبانوں میں ہورہا ہے خدا کی قسم دِل خوش ہوگیا اللہ تم کو خوش رکھے۔

دُعاؤں کے ساتھ۔

تمہاری
جمیلہ بی بی

لاہور کینٹ

۱۷ر دسمبر ۷۴ء

بھائی اپنی بی بی.............دعائیں!

جنوری ۷۴ء کا لکھا تمہارا خط دسمبر ۷۴ء میں محمد نقوش صاحب نے پہنچایا۔
تب سے اب تک کتنا پانی پلوں کے نیچے سے گزر چکا زمانہ بدل گیا ہے۔ کئی دنوں سے سوچ رہی تھی تمہیں خط لکھوں بلکہ عاشی نے (جب خط و کتابت کھلنے کا اعلان ہوا) تو کہا تھا امی اپنی ماسی کو خط لکھوں گی پھر اس سے پہلے جب تمہاری تصویر نقوش میں دیکھی تو اسے فریم کروانے کا کہنے لگی۔ میں نے کہا تھا بیٹی انشاء اللہ کبھی حالات سازگار ہوں گے تو تم ماسی کو لکھ کر اس کی اچھی سی تصویر خود ہی منگوا لینا۔ آج کل اس کا جی اچھا نہیں اسکول کو جاتی مگر تمہیں خط انشاء اللہ اگلے سال وہ خود لکھے گی جس محبت سے وہ تمہارا ذکر کرتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی کہانیاں ایک دو سال سے لکھ رہی ہے لیکھک ہوئی جا رہی ہے۔
پتہ نہیں اور کیا لکھوں نہ پڑھنے کا جی کرتا ہے اور نہ لکھنے کا کچھ حوصلہ ہے۔ اختر جمال آئی ہوئی تھیں میں نے اس سے کہا تھا بمبئی چلو تو ہم بھی چلیں۔ ممتاز شیریں کو اس کے شوہر نے مار ڈالا کبھی اسے بولنے ہی نہ دیا اتنی پڑھی لکھی خاتون (مگر کبھی اُس نے دو باتیں ڈھنگ کی کر کے نہ دیں) ترکی اور بنکاک کا ذکر البتہ کیا کرتی تھیں اس کے مرنے کے بعد چیختے چلّاتے رنگوں کی قمیضیں اور اونچی ایڑی کے جوتے پہن کر موصوف دفتر سے ریٹائر ہوئے اور کراچی جا کر بیٹھ گئے پتہ نہیں اب کیا کرتے ہیں۔ گھروں کی آبادی عورتوں کے دم سے ہوتی ہے اسلام آباد میں اُن کے گھر کی آبادی بس خاموش ہو گئی۔ فلاں فلاں خواتین کا ذکر تمہارے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا اس لئے کہ بڑی جو چھوٹی لگتی ہے غریبوں سے نہیں ملتی۔ بچپن سے ہی بقول ان کے منع کر دیا گیا تھا کہ بچوں کے ساتھ نہ کھیلیں۔ یہ بیان انہوں نے خود ایک ریڈیو انٹرویو کے دوران دیا۔ ہم سے بھی کوئی سلام پیام نہیں اُن کی بکتی ہو چکی تم زمینی آدمی ہو اور میں بھی زمینی انسان ہوں وہ ستارے

سے آگے پہنچ چکی ہیں۔

عبدالعزیز خالد آج کل یہاں انکم ٹیکس کمشنر ہیں۔ کل اُن سے ملاقات ہوئی تمہیں سلام لکھواتے ہیں (کہہ گئے تھے کہ سلام لکھنا) جمیل جالبی بہت لکھتے پڑھتے ہیں اور بہت بڑے آدمی ہو گئے ہیں۔ تمہیں انہوں نے شاید خط لکھا ہو۔

تم بھی کچھ اپنا لکھو کیا نوکری کرتی ہو فارغ وقت میں کیا کیا کرتی ہو۔

زیادہ محبتوں اور دُعاؤں کے ساتھ۔

(محمد نقوش نے کبھی تمہارا اسلام مجھے نہیں بھجوایا)

فقط

جمیلہ بی بی

نیا دور

نیا دور
کراچی

۴۱ ، ۴۲

سالانہ:۔ ۱۶ روپے

قیمت فی پرچہ:۔ ۴ روپے

شائع کردہ:۔ پاکستان کلچرل سوسائٹی کراچی ۵

ترتیب

افسانے

چھ نظمیں، ایک خط

مضامین

دس نوحے

رائنر ماریا رلکہ ــــ (ایک مطالعہ)

تبصرے

روہی

(ایک طویل کہانی)

جمیلہ ہاشمی

جنگل کی بھیگی ہوئی ہوا درختوں گھاس اور کلی کی باس سے بوجھل ہے اور اونچے پتھروں سے ٹکراتا جھاگ اڑاتا بہتا ہوا پانی نیلی دھند میں گھری وادیاں بادلوں کی سیاہی میں چھپی چوٹیاں بل کھاتی سڑک خاموشی کا جادو جھرنوں کی کل کل سے ٹوٹتا ہے گاؤں کے لوگ اپنے کاموں میں مگن سر اٹھا کر دیکھتے ہیں اور میرا پوتا مسکراتا ہے۔ شام سناٹے میں گم ہو رہی ہے۔ نیچے وادیوں میں چراغ ٹمٹماتے ہیں جیسے آسمان ہمارے قدموں میں بچھا ہو۔

"بابا ہم تھوڑی دیر میں اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔ آپ کو سردی تو نہیں لگ رہی۔ بڑا لمبا سفر تھا۔ آپ کمزور ہیں اس لئے میں ڈرتا ہوں کہیں طبیعت بگڑ نہ جائے۔

میں آپ ہی آپ مسکراتا ہوں اسے کوئی جواب نہیں دیتا۔ ایک تیز موڑ آتا ہے۔

رات کی سیاہی ہمارے چاروں طرف ہے۔ سڑک کے کنارے جگنوؤں کی برات کسی کے کھیتوں پر سے گزر رہی ہے۔ جانے کتنا سمے بیت گیا ہے دھرتی کی مانگ یونہی سجتی ہے براتیں یونہی گزرتی ہیں۔ دور کسی گھنے کنج میں کوئی پپیہا بولا ہے تھوڑی دیر خاموشی رہی ہے ایک تیز سیٹی سی بجاتا جانور ہمارے پاس سے گزر گیا ہے پھر نیلاہٹ میں تارے آنکھیں جھپکانے لگے ہیں دوج کا چاند ہولے سے دھند کے اوپر ریت میں دبے ہوئے سکے کے کنارے کی طرح چمکا ہے۔ دور سے روشنیاں اور شہر نظر آتا ہے ہم منزل کے قریب آگئے ہیں۔

منزل کونسی منزل کس کی منزل؟

شیر دل نے بہت ملائمیت اور محبت سے جھک کر کہا ہے "بابا آپ تھک گئے ہوں گے میں ابھی آپ کا بستر لگوائے دیتا ہوں۔ میرا دل اس بے پناہ محبت اور ملائمیت کے نیچے اپنے فرض

سے سبکدوشی کے ایک احساس سے جو شیر دل کی آواز میں ہے نرم ہو رہا ہے۔

محبت کا ایک بول کیسے دل کو پگھلا دیتا ہے۔

میں نے روشنی بجھا دی ہے میری بوڑھی ہڈیوں میں سردی کی وہ لہر جو کھلی کھڑکی سے اندر آ رہی ہے لرزتی ہوئی ہوئے ہوئے سما رہی ہے۔ مجھے اپنا وجود ایک لاش کی طرح سردی کے اس کنڈھر پر تیرتا لگتا ہے۔ وجود جو مردہ یادوں بیتی کہانیوں گزری محبتوں مایوسیوں اور ناکامیوں خوشیوں اور مسرتوں کی لاش ہے۔ وجود جسے مریم نے ٹھکرایا تو کسی نے کبھی قبول نہ کیا جسے کبھی کہیں کوئی ٹھکانہ نہ مل سکا۔ حیرت ہے ایسی مکمل اور بے پناہ حسن سے مدہوش اپنی خوشبو سے آپ ہی دیوانی ہوتی رات میں مجھے مریم کی یاد کیوں آئی ہے۔ کیا رات بھی مریم ہے کنواری عفت وراداپنی خوبصورتی سے گناہ کی حد تک آشنا۔

رات مریم ہے اور رات مریم نہیں ہے۔ رات آسرا ہے پناہ گاہ ہے محبت کی خوشبو ہے لمس کی نرمی ہے سانس کی پاکیزگی سے وسعت کی حد تک درماں کرنیوالی ہے اور مریم نے ایک بے سہارا دل کو سہارا نہ دیا۔

شیر دل نے اندر آ کر بتی پر ہاتھ رکھا تو میں نے کہا "نہیں بیٹے بتی مت جلاؤ میری آواز میں آنسوؤں کی رندھن ہے جیسے محسوس کر کے وہ اندھیرے میں ہی میری طرف آیا ہے۔ اس نے میرے تکیے پر ہاتھ رکھا اور جھک کر پوچھا۔

کیوں بابا کیا آپ کو یہ ٹھنڈ اور خوبصورتی پسند نہیں آئی۔ یا تھکن سے پریشان ہیں؟

نہیں بیٹے تم پریشان کیوں ہوتے ہو۔ میں اچھی طرح سے ہوں صرف یوں لگتا ہے جیسے یہ جگہ میں نے پہلے بھی کہیں دیکھی ہے۔ یہ کمرہ اور اس میں سیلن کی ایک دبی دبی سی بو جسے کچھ کہہ نہ سکو یہ بے نام اداسی جو زندگی کے کنارے سے لپٹی لگتی ہے یہ ساری چیزیں۔

شیر دل ہولے سے ہنس دیا اس نے کہا: "آپ اگر سو سکیں تو اچھا ہو۔ تھکن اتر جائے تو ہر طرف تازگی خوشبو اور خوشی ہو گی۔ اس کے لئے ہمیں صبح تک ٹھہرنا ہو گا۔ تاکہ وقت گذر جائے اور اپنے ساتھ اداسی کا احساس لے جائے۔ کیا میں یہ کھڑکی بند کر دوں؟"

میں کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیتا ہوں اُسے کیا بتاؤں کہ وقت گذر جاتا ہے اور احساس باقی رہتا ہے ہاں صرف احساس ہی باقی رہتا ہے اور زمانوں کے پار سے برچھی کی انی کی طرح چبھتا ہے۔ تم اس احساس کو ایک ایسی کرچ کہہ سکتے ہو جو کبھی نکالے نہیں نکلتی دوج کا چاند دھند کے پردوں میں بھربھری ریت میں دھنسنے والے سکّے کی طرح چھپ گیا ہے۔ مکمل سیاہ رات تارے کی کناری سر پر تاروں بھری چنری ڈالے تیزی سے لپک جھپک گزر رہی ہے۔ میں نے سیدھا اس کی آنکھوں میں جھانکا وہ بھی بنا پلکیں جھپکائے میری طرف دیکھ رہی تھی اور اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے خالی تھا۔ میں نے سوچا تھا وہ خفا ہو گی مگر وہ خفا بھی تھی خوش نہ تھی اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ نہ تھی۔ ان کالی آنکھوں میں گہرے توے کی سی ٹھنڈک اور تاریکی تھی۔ میں اس لڑکی کو پہلی بار دیکھ رہا تھا میں اسے کیا جانتا تھا کیا جان سکتا تھا؟

گاری خان نے اُسی رات جب ہم پہنچے تھے اور بے پناہ تھکن سے چور ہو رہے تھے۔ ہمارے گوپے میں آ کر کہا تھا مریم لڑکی نہیں ایک قوت ہے تم شیر سے لڑ سکتے ہو اسے گرا سکتے ہو مگر مریم کسی بھی آدمی کے مقابلے میں زیادہ ہے تم مریم کو نہ خرید سکتے ہو اور نہ ہی ہار دے سکتے ہو۔"

گاری خان نے دیسی شراب پی رکھی تھی وہ لڑکھڑا رہا تھا پھر نوذان آیا اور اسے گھسیٹ کر لے گیا۔ میں اور پیرن ہنسنے لگے اور رات بیت گئی۔

ریت کے ٹیلوں سے پُر اور ریگستان کے دل میں جگہ جہاں پوسٹ تھی اور ہم لوگ کئی دنوں کے سفر کے بعد یہاں پہنچے تھے۔ اپنی ہمت اور قوتِ برداشت کو آزمانے کے لئے دوسروں پر اپنا آپ ثابت کرنے کے لئے میں نے اپنی مرضی سے ایک معمولی سپاہی کی زندگی پسند کی تھی۔

آج یاد آتا ہے تو ہنسی آتی ہے آدمی ساری زندگی کیا کیا حماقتیں کرتا ہے دیوانوں کی طرح خوابوں کے پیچھے بھٹکتا ہے۔ اندھیروں سے اندھیروں تک سفر کرتا ہے اپنے آپ سے بچنے کے لئے کیا کیا مصیبتیں برداشت کرتا ہے ساری عمر جو اپنے سے ہی بے خبر رہتا ہے۔ اور آج جب کھلی کھڑکی میں سے سیاہ رات اندر آئی ہے سیاہ بادلوں کی دھند کی طرح کمرے میں بھر گئی ہے۔ ٹین کی

چھت پر چھائے اخروٹ کے درخت پر سے قطرے ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ جیسے کوئی آنکھ مچولی کھیلتے میں بھاگتا ہی جائے ایک ہنسی کا نغمہ کسی اوٹ سے سنائی دیتا ہے اور پھر گھنٹیاں سی بجنے لگی ہیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں وقت بیت گیا اور تم کچھ بھی ثابت نہ کر سکے۔ وقت بیت گیا اور وقت بیت گیا اور وقت بیت گیا۔

تم نے رینگنے والے ایک کیڑے کی طرح جی لیا۔

جھاڑیوں سے پرے جگنوؤں کی طرح آنکھیں جگمگا اٹھی ہیں پر میرے لئے نہیں ان کی جوت میرے لئے نہیں ہے۔

کرنل مرزا نے کہا تھا میاں ایک سپاہی کی زندگی میں کوئی کشش نہیں اور پھر سرحد کی فوج تو اور بھی سختیاں سہتی ہے۔ کبھی دشمن گھات سے نکل کر حملہ کر دیتے ہیں ہر وقت چوکس رہنا پڑتا ہے زمین کے ایک ایک انچ کے لئے اپنی زندگی کی قیمت چکانی پڑتی ہے۔ میری مانیں تو یہ خیال دل سے نکال دیں۔ مگر مجھے اپنے بابا کی گرجتی ہوئی آواز سنائی دے رہی تھی جسنے کہا تھا۔

"تم سب کیڑوں کی طرح میرے جسم کا خون چوس کر زندہ ہو، تم میں خود اتنی سی ہمت بھی نہیں ہے کہ اپنے آپ کو سنبھال سکو۔ میں نے آج تک ایک نہایت شفیق باپ کی طرح تمہاری ایک ایک ضرورت کا خیال رکھا ہے اور اب جب کہ میں ایک فیصلہ کر چکا ہوں تم سب کیا کہنا چاہتے ہو۔ کیوں بھیڑوں کے ایک ریوڑ کی طرح میرے پاس جمع ہوئے ہو؟ میں علاقے کا مالک و مختار ہوں مجھے اس کا اختیار حاصل ہے میں جو چاہوں گا کروں گا اور تم مجھے اپنے زور اور جوانی سے نہیں ڈرا سکتے۔ جاؤ زمانے میں نکلو اسکے گرم و سرد کا مقابلہ کرو اپنی ہمت کا امتحان لو اپنی جگہ خود بناؤ۔ میں نے اور میرے آباؤ اجداد نے اس علاقے کے لوگوں کا خون چوسا ہے اور آج تک زندہ رہے ہیں۔ میں نہیں چاہتا تم اور تمہارے بعد میری تمہاری نسلیں یہی کچھ کریں۔ زمانے کا تقاضا ہے کہ تم اپنے آپ کو ثابت کرو۔ سن رہے ہو جاؤ اپنے آپ کو ثابت کرو۔"

میں اور میرے سترہ بھائی ان کا منہ دیکھتے رہے اور پھر بابا کے پاس بھی محلوں اور نوبت خانے کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔ محل کے دروازے پر سپاہیوں کا پہرہ اب بھی تھا۔ ان گنت سامان سے بھرے محل ہر جگہ تھے۔ موٹر خانوں میں موٹریں نئی دلہنوں کی طرح آراستہ کھڑی تھیں۔ عدالتوں میں

ان کے نام کے آگے اب بھی ظل الہٰی لکھا جاتا تھا۔ مسجدوں میں اب بھی خطبوں میں ان کا نام آتا تھا مگر بابا کو خود معلوم تھا کہ وہ بجھتا ہوا دیا ہیں۔

ہمارے اور ان کے درمیان صدیاں پڑی ہیں اور فاصلے رہے ہیں۔

کرنل نے اپنے طور پر مجھے سمجھایا۔ شدید گرمی اور ہڈیوں کا گودا تک جما دینے والی سردی کا ذکر کیا۔ تہذیب کے ہر مرکز سے دوری کا خوف دلایا مگر مجھے تو ایک عام آدمی کی طرح اپنے آپ کو ثابت کرنا اور بابا کی گرج کا جواب گرج سے دینا تھا۔ میں خود اپنا مالک، و مختار تھا ایک ایسا انسان جس کے سارے بندھن شکستہ زنجیر کی طرح ٹوٹ چکے ہوں۔ پندرہ سو میل پھیلے اس علاقہ میں سناٹا تھا اور میں اس سناٹے سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔

میں نے ایک معمولی سپاہی کی طرح کرنل کے سامنے والی کرسی سے اٹھ کر سلام کیا اور الٹے قدموں باہر نکل آیا۔

بانکی چتون اور خوبصورت آنکھوں والی مادہ اونٹ اٹکھیلیاں کرتی ہوئی یوں آگے بڑھ رہی تھی جیسے بجرہ پانی پر تیر رہا ہو۔ میں پہلی بار اونٹنی پر سوار تھا۔ سجی سجائی ہوئی۔ دلہن کی طرح زیوروں سے آراستہ کسا ہوا جسم، چمکتا بدن اور سورج کی روشنی میں مہاروں پر لگے شیشے آنکھیں مار رہے تھے سر پر بندھے ہوئے کے پھندنے کوڑیوں اور موتیوں کی جھالروں سے بوجھل رنگین دھاگوں سے بنی گانی تک آتے اور اسے چھوتے ہوئے۔ ناک میں چاندی کا لاٹ۔ گردن میں ذرا ذرا سے گھنگرو لٹکتے ہوئے کہ چلتے میں ان میں سے آواز نکلتی جو گھٹنوں پر بندھے بندلے اور ٹخنوں کی جھانجھروں کے ساز میں سُر پیدا کرتی۔ پلان جس پر میں بیٹھا تھا سیاہ دھاگوں سے بنا تھا اور اس میں نیلی کوڑیاں بڑے بڑے منکے موتی پھندنے تھے۔ آگے جس اونٹ پر سامان لدا تھا اس کے ساتھ سیاہ بٹے ہوئے اُون سے بنے رسوں سے میری اونٹنی کا رشتہ قائم کیا گیا تھا۔ گھنٹیاں اس سے میں جگہ جگہ پروئی ہوئی تھیں کہ چلنے میں بہت سہانی آواز آتی ہے اگلے اونٹ کی مہار تھامے ایک راہبر تھا اور پچھلے اونٹ پر پیرل تھا جس نے میرے منع کرنے کے باوجود دو اونٹوں کو سامان سے

لا دلیا تھا۔

سورج اس علاقے میں مانو سوا نیزے پر کھڑا رہتا ہے آسمان سے آگ برستی ہے گرم دوزخی ہوا کے جھکڑ چلنے میں ریت کے پہاڑ اڑ کر ادھر سے ادھر بہتے ہیں دن جینے کو ناقابل برداشت بنا دیتا ہے ہر طرف خاک اڑتی ہے اجنبی آدمی راہ بھول جاتا ہے۔

شام ڈھلے سورج میں ذرا دھیرج آتا ہے، تو ریت ٹھنڈی پڑنے لگتی ہے ساز جنڈ اور کیکر کی سائے سے اٹھتے ہیں جوتے اور کپڑے جھاڑتے ہیں اور تاروں کی چھاؤں میں اپنی منزلوں کی طرف جاتے ہیں پہلے پہر اونٹوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی ٹنٹا ٹنٹ گیتوں کے بولوں میں ڈھلتی ہیں اور ریت کے ان پہاڑوں میں جہاں کوئی پگڈنڈی نہیں لوگ ستاروں کی سمت دیکھ کر راہ طے کرتے ہیں تیز آندھیاں سیلاب کی طرح جب تندی سے چلتی ہیں تو پہاڑوں کو ایک پل میں اٹھا کر ذروں کی طرح بکھیر دیتی ہیں۔

شام کا تارا مغرب میں چمکا تو ہم لوگوں کا قافلہ بڑی نہر کی پٹری سے اتر کر اس راہ پر ہو لیا جو تیس ہزار میل کے رقبے میں پھیلے اس صحرا کے کنارے کنارے چھوٹی بڑی بستیوں، اجاڑ شہروں ویرانوں ڈاہروں گھاس کے قلعوں۔ پھوک اور لانے کے جنگلوں میں سے ہوتا ہوا صحرا کے دل میں نہال سٹ تک اترتا ہے۔

کبھی یہ علاقے بھی آباد تھے۔ یہ جگہ دریا کی گذرگاہ تھی یہاں بستیاں تھیں بھرے پرے گاؤں تھے اور خوشی تھی۔ نہریں تھیں زندگی تھی پھر ہوتے ہوئے یہ سارے علاقے بے توجہی کا شکار ہو گئے۔ نہریں ریت سے اٹ گئیں آبادی کم ہو گئی گاؤں اجڑ گئے جانوروں کے گلوں کو لے کر پانی اور چارے کی تلاش میں لوگ میلے نہروں کے قریب آباد ہو گئے۔

ہم ایسے اڑے ترچھے راستوں سے جا رہے تھے جن کا اندازہ مجھے نہیں ہو سکتا۔ پیر آن اور اس کا ساتھی کبھی کبھار باتیں کرنے لگتے اور پھر لمبے وقفے خاموشی کے آتے جس میں صرف اونٹوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی صدا آتی یا جھانجھروں کے گیت۔ صحرا کی ہوا نشہ بن کر میرے رگ و پے میں اتر رہی تھی مجھے نیند سی آنے لگی تھی مگر میں مہاریں پکڑے اونٹنی کو تیز چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

کبھی ان ویرانوں میں آبادی ہو گی۔ ہرن کی آنکھوں والی عورتیں ان لبالب بھری نہروں

کے کناروں پر ملتی ہوں گی حسن و عشق کے کیا کیا قصے نہ ہوں گے۔ زندگی کی ہماہمی اور زمین کی دھڑکتی نبضیں زمانوں سے یہاں پر تھم گئی تھیں۔ساڑکی کنواریاں حسین اور جوان مرد گیتوں سے گونجتی فضائیں اور پانی کے ٹوبوں کے کنارے گول ٹوپیوں کی سی چھتوں والے کھمپ کی گھاس کے جھونپڑے مویشیوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کے نغمے۔ تازہ دوہے دودھ کی خوشبو اور صبحدم صحرا کی نرم ہوا جس میں جادو ہوتا ہے۔

پیرن نے قطب نما کالا دیا سلائی جلا کر سمت کا تعین کیا۔ راہبر نے کہا تم مجھ پر بھروسہ کرو پیرن میں ان راہوں سے آنکھ بند کر کے گزر سکتا ہوں۔"

پیرن نے کہا میں اپنے لئے نہیں سائیں کے لئے دیکھ رہا ہوں۔ مجھے اپنی فکر نہیں ہے میں گم بھی ہو جاؤں تو کیا غم ہے۔"

راہبر نے کہا "تمہیں قطب نما سے بھی کچھ پتہ نہیں چل سکتا۔ ریت کے ٹیلے دھوکا دے جائیں گے۔"

میں اپنی اونٹنی کی جھکتی مہار پکڑے ریت اور خشک ہوتی جھاڑیوں کی بو کو محسوس کرتے ہوئے ہچکولے کھاتا جیسے جھوم رہا ہوں خاموشی سے ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا اور سنسانی رات تیر کی طرح ہمارے سروں کے اوپر آوازوں سے خالی لگتی تھی اور پھر بھی گزرتی جارہی تھی پھر دلوں نے گیت گانا شروع کیا بول بہت دھیرے دھیرے میرے گرد بکھرتے اور سمٹتے تھے ٹھنڈی ہوا اور نرم جھونکوں کے ساتھ مل کر آواز پھیل رہی تھی اونچی اٹھتی جاتی تھی جیسے ستاروں بھرے آسمان کو چھولے گی ہمارے گرد ریت کے ٹیلے اور خشک جھاڑیوں کے جھنڈ بھی اس لئے میں شامل ہو گئے۔ گیت ہر شے پر چادر کی طرح چھا گیا۔

میں نے اپنے گھر میں صرف اعلیٰ درجہ کی موسیقی سنی تھی۔ مغربی طرز پر گائے ہوئے مشرقی گیت جن میں سوائے دل اور ملن کے کوئی شے نہیں۔ سب طرف محبت کا چرچا سننے کے باوجود محبت کوئی ارفع و اعلیٰ جذبہ نہیں لگتا۔ محبوب اتنا قریب کہ ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکو۔ زندگی کی ہر خوشی کو مہنگے یا سستے داموں خرید سکو تڑپ اور طلب کی شدت کا کہیں دور دور تک پتہ نہیں سپاٹ اور بےحسی کا شکار زندگی۔

میں نے جب بھی کسی لڑکی کو چاہنے کی کوشش کی پتہ چلا کہ وہ پہلے سے میری نگاہ کی منتظر تھی۔ ہجر اور فراق کے نقصوں میں وہی بدمزگی جیسے بہت بار بکی ہوئی کسی شے میں۔ محبت نے کبھی اپنے سے باہر دیکھنے پر مجبور نہیں کیا سوز دروں سے بھی بیگانہ۔ مگر اس گیت میں جو صحرا کی ہوا کے دوش پر اڑ رہا تھا اور جسے دو سادہ قاعدوں اور قانون سے ناآشنا آدمی گا رہے تھے جانے کیا تھا کہ مجھے اپنے اندر ایک خلا ابھرتا لگا جیسے بیماری سے اٹھ کر بہت زوروں کی بھوک لگ آئے اور دل ڈوبنے لگے۔

راہبر نے کہا "سائیں اب ہم بھوک اور لاتنے کی خشک جھاڑیوں کے جنگل میں سے گزر رہے ہیں۔ اونٹنی کی مہار ذرا مضبوطی سے پکڑیں اندھیرے میں گرملعوں کا پتہ چلانا مشکل ہے اور پھر یہ نئے ٹھیکیدار بے پرواہ کئے بنا کر بستیوں کے لوگ راہوں پر سے گزرتے ہیں جہاں جی چاہے کھار بنانے کے لئے گڑھے بنا لیتے ہیں۔ پچھلی بار یہ راہ صاف تھی مگر اب اسپر گزرے موسم کی خشک بوٹیاں بکی ہوئی جھاڑیاں پڑی ہیں جیسے کسی چیل کا بکھرا ہوا گھونسلا ہو۔ مادہ اونٹ کے پاؤں کے نیچے چرمُر کی آواز آتی اور وہ بھی بہت سنبھل کر آگے بڑھتی تھی۔ ہم شام کے چلے تھے اور اب ہمارے سروں پر سے سات ستاروں کی کھاٹ جسے مولوی صاحب نے بچپن میں جانے کیا کہا تھا اور جس کا نام مجھے یاد نہیں پڑتا تھا کھسک کر نیچے اتر آئی تھی۔ ٹھنڈی ہوا میں ایک ملائمیت تھی میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں میرے چاروں طرف ایسی بو سی تھی۔ جیسے کوئلے اور جلن کی چراند سی ہو۔ میں نے کہا پیر آن اب رکنا چاہئے آخر آج ہی تو منزل پر پہونچنا ضروری نہیں ہے میں تھک گیا ہوں۔"

راہبر نے کہا ذرا سا اور چلیں گے تو ایک بستی آئے گی وہاں آرام کرنے کی جگہ ہو گی۔"

صبح کا تارا آنکھیں جھپکانے لگا تھا جب جھاڑیوں اور جلن سے پرے ایک جھٹپٹے اندھیرے میں کالے سایوں کی طرح نظر آیا۔ یہ سیاہ دھبے سے ہماری نگاہوں کے سامنے بڑھتے اور پھیلتے گئے ہم ایک بستی کے سرے پر آ گئے تھے۔

آنکھ کھلی ہے تو گرمی اور پسینے کے مارے برا حال تھا میں ایک جھونپڑے کے اندر تھا جس کا دروازہ بمشکل گز بھر کا اونچا ہو گا جیسے ایک مٹی سی کھڑکی ہو اندر ریت پر بچھے بستر کی نمی خوشگوار بھی لگتی ہے اور ناگوار بھی گنبد نما چھت میں سے ایک کرن اندھیرے میں اترتی اجنبی سی

بھٹکی ہوئی کنواری کی طرح لگی۔ باہر دھوپ تمتا رہی تھی یوں معلوم ہو رہا تھا روشنی اور تپش کے جھکڑ سے چل رہے ہوں۔ زمین پر ایک جلانے والا نور پھیلا تھا۔ میری زبان سوکھ رہی تھی۔ گو پیرن پنکھا جھل رہا تھا مگر بے پناہ شدت کی جلن تھی کہ کسی طرح بھی کم نہ ہو سکتی تھی۔ رومال سے پسینہ پونچھ کر میں نے پانی مانگا تو پیرن نے مجھے ستو گھول کر دیئے۔

سائیں اس گرمی میں یہ ہزار شربتوں سے بہتر ہیں پیاس اور بھوک کے علاوہ گرمی کے اثر کو زائل کرنے میں ان کا کوئی جواب نہیں۔

میں نے ستو پی کر ایک آسودگی محسوس کی تو پوچھا اس گھر کے رہنے والے کہاں گئے تم نے ان سے یہ کیسے حاصل کیا۔

کہنے لگا آپ دھوپ ڈھلے دوبارہ سفر کے لئے باہر نکلیں گے تو آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گا میں نے پھر کچھ نہیں پوچھا دوبارہ نیند نے مجھ پر یورش کی۔ خواب میں میں نے دیکھا کہ ٹھنڈے پانی کے چشمے رواں ہیں اور لوگ عید کی طرح خوشیاں کرتے نئے نئے کپڑے پہنے پانی کے کنارے بیٹھے ہیں جگہ جگہ قالین بچھے ہیں۔ کالی آنکھوں والی جوان عورتیں ستاروں سے جڑے چولے پہنے اپنے گھاگھرے اٹھا کر جس کی گوٹ چمک رہی ہے ناچنے کی تیاریاں کر رہی ہیں ان کے سروں پر چنریاں ہیں جن میں صبح کے تارے ٹکے ہیں گلابوں کی مہک چاروں طرف ہے ایک میٹھا شروب جو شراب نہیں پیتے ہوئے لوگ جھوم رہے ہیں مرد جن کی نگاہوں میں نرمی ہے اور بازوؤں میں طاقت ناچنے میں عورتوں کا ساتھ دے رہے ہیں ناچ کے چکروں میں گھومتی عورتیں جب ہاتھوں سے چنریوں کے کنارے اٹھاتی ہیں تو ستاروں کی جوت سے آنکھیں چندھیا جاتی ہیں ہوا میں خوشبو اور جنگل کی مہک ہے جیسے بارش ابھی برس کر کھلی ہو اوپر آسمان سیاہ ہے اور بادلوں کی گرج سنائی دیتی ہے۔ درختوں کے جھنڈ سے پرے گائیوں کے بولنے کی آواز آتی ہے دودھ کی باس ہے لوگ الاؤ جلائے جانے کیا پکا رہے ہیں۔ آگ کی گرمی بڑی ہی خوش کن ہے بادلوں کی سیاہی کالی رات سے بھی زیادہ دبیز ہے چاروں طرف چہل پہل اور مستی ہے ایسی خوشی جو میں نے اپنے باپا کے محلوں میں بھی کبھی نہیں دیکھی سجی سجائی اونٹنیاں کھڑی ہیں جب وہ گردن ادھر ادھر ہلاتی ہیں تو ایسی ایسی دلفریب آواز ان گھنٹیوں میں سے

آتی ہے جوان کے سر اور گردن کے زیوروں میں ہیں۔ پھر ناچ ختم ہو گیا اور میں بھی نہانے کے لئے ایک آبشار میں کود جاتا ہوں۔

جاگ کر میں نے دیکھا کہ جھونپڑے میں اندھیرا تھا۔ پیرن اور ہمارا راہبر باتیں کر رہے تھے میں پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔

باہر اونٹ تیار تھے سامان بندھا رکھا تھا اور ہم تینوں کے علاوہ وہاں کوئی نہ تھا۔

میں نے کہا "پیرن اس بستی کے لوگ کہاں گئے کہ کوئی آواز نہیں آتی۔ یہ بستی اجڑی ہوئی بھی نہیں لگتی۔ جھونپڑوں کے دروازے بند ہیں کیا بات ہے؟"

راہبر نے آگے بڑھ کر کہا "سائیں لوگ پانی کی کمی اور گرمی کی شدت سے گھبرا کر بستی کو خالی کر گئے ہیں جب برسائیں آئیں گی روحی آباد ہو گی تو یہ خشک جھاڑیاں سبز ہوں گی یہ ٹوبہ جس میں اب سوکھے کیچڑ کے اور کچھ نہیں پانی سے بھر جائیگا تو لوگ نہروں کے کناروں سے اپنے گھروں کو لوٹ آئیں گے اب کے بے پناہ گرمی ہے پچھلے سال میں یہاں سے رکن پور گیا تھا لوگوں لے بستی خالی نہ کی تھی آج بھی میں نے کوشش کی ہے گلیوں میں گھوما ہوں گوپوں کے پٹ کھول کر اندر جھانکا ہے مگر ایک جان بھی یہاں نہیں"۔

میں ٹوبے کے کنارے کھڑا تھا اور سانس روکے پریوں کی کہانیوں کے اس گاؤں کو دیکھ رہا تھا۔ گاؤں جس کو کسی طلسم کے زور سے خالی کیا گیا تھا۔ اندھیرے گوپے قبروں کی طرح خالی تھے زندگی یہاں پر صرف پانی کا سوال بن کر رہ گئی تھی۔

میں نے اپنے ہاں پانی کی افراط پر شکر کیا اور بہت دنوں بعد ویران بستی کی چھوٹی سی مسجد کے دراڑیں پڑے صحن میں سجدۂ شوق ادا کیا اس لذت اور سرور کو میں آج بھی محسوس کر رہا ہوں۔

چاند لانے اور کھار کی جھاڑیوں پر چمک رہا تھا ڈاہروں اور ریت کے سرابوں سے آباد یہ ویرانہ جہاں ہرنوں کے غول کلیلیں کرتے بھاگتے پھرتے ہیں گروہوں میں جمع ہو کر چارے کی تلاش کرتے ہیں بھیڑیوں کے خوف سے چھپتے اور پھر بھی زندہ رہنے پر خوش۔ زندگی ہر جگہ رواں دواں ہے جھاڑیاں تیتروں سے آباد تھیں کیونکہ ان کے بولنے کی آواز بار بار آتی تھی اور میرا ہاتھ بے خیالی میں اپنے کندھے کی طرف جاتا تھا جہاں بندوق نہیں تھی ہم جھاڑیوں کے ایک جھنڈ سے نکلے تو

لومڑی کود کر دوسری طرف نکل گئی اس کی پھولی ہوئی دُم ہوا میں اٹھی ہوئی تھی پھر گیدڑوں کے رونے کی آواز کہیں قریب سے آنے لگی دور ڈاہر پر بھاگتے ہوئے ہرنوں کی قطاریں نظر آئیں۔

راہبر نے کہا "یہ پہلی چاند راتیں ہیں جلد ہی چاند چھپ جائے گا تو اندھیرے میں ہم کسی جگہ ٹھہر کر آگ جلائیں گے پھر تماشا دیکھئے گا۔"

میں اور پیرن آنے والی گھڑی کا انتظار کرنے لگے۔

چاند جھاڑیوں کے جنگل پر چمک کر بے نور ہوتا اور جھکتا چلا گیا۔

آگ جلا کر ہم لوگ ذرا اوٹ میں ہو گئے میرے ہاتھ میں بھری ہوئی بندوق تھی۔ ہم سب دم سادھے ہونے والے تماشے کا انتظار کرنے لگے۔ دیر تک کچھ بھی تو نہ ہوا۔ میں اس بے فائدہ انتظار سے تھک ہی چلا تھا جب میں نے جھاڑیوں میں تیتروں کے بولنے کی آواز سنی اور پھر انہیں قطار باندھے آگ کی طرف آتے دیکھا میں نے گنا تو وہ گیارہ تھے اور بہت اطمینان سے آگ سے تھوڑی دُور پرے رُکے ہوئے تھے۔ میرا اٹھا ہوا ہاتھ رک گیا۔

"پیرن انہیں بھی ہماری طرح جینے کا حق حاصل ہے میں ان کے اطمینان کو دھوکا کیوں دوں میں اوٹ سے باہر نکل آیا۔

جھاڑیوں کے جھنڈ چھدرے ہونے لگے اور گھاس کا میدان جھاڑیوں کے حاشیے سے شروع ہوا چلی ہوئی گھاس کے نشانوں پر چلتے ہوئے ہم نے دور دور تک انسان یا جانور کا نشان ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر یہاں پر زندگی کی سُن گن بھی نہ تھی۔ ایسا سناٹا جس میں اکیلے آدمی کا دل دہل جائے روح میں ایک عجیب ویرانی پھیلنے لگی۔ پھر جانے کب مجھے نیند آ گئی اور میں سو گیا اونٹنی کی مہاریں میرے ہاتھ میں ڈھیلی ہو گئیں گردن ایک طرف جھک گئی زندگی میں پہلی بار ایک مختصر جگہ میں جہاں آدمی کا آرام کرنا ممکن نہ ہو۔ انسان کی ضرورتیں کتنی کم ہیں اور قدرتی تقاضے کتنے اٹل۔

رُکن پور میں بھی ہم نے آدمی کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر پکے مکانوں کی سفیدی اور آسائش پانی کی کمی سے مات کھا چکی تھی۔

راہبر نے کہا "کسی زمانے میں یہ گھی اور دودھ کی منڈی تھی ہندو تاجر صحرا کے دل میں جس نے

کی چٹان پر رہتے تھے اور راجپوتانے تک تجارت کا سامان بھیجتے تھے اب سوائے مندر کے وہاں پر کوئی شے آباد نہیں۔"

مندر آباد تھا میں نے آسن پر مورتی کو دیکھا جو ایک ٹمٹماتے دیئے کی روشنی میں دودھ میں نہائی ہوئی لگتی تھی۔ پجاری نے رات کی پوجا کے لئے تیاریاں شروع کر دی تھیں وہ اکیلا گھنٹیاں بجا رہا تھا۔ سوگند سے بھرے مندر کی چوکھٹ کے باہر سے جب میں لوٹا ہوں تو صندل کا ٹیکا لگائے اور کھڑاویں پہنے وہ باہر کی چار دیواری تک میرے ساتھ آیا۔ تلسی کے پودے دروازے کے باہر سبز اور خوشنما لگتے تھے۔ اسنے کہا بھگوان کا کرنا تھا کہ میں اکیلا مورتی کی رکشا کے لئے یہاں رہوں۔

تلسی کے پودوں کی طرف اشارہ کر کے میں نے کہا "آدمیوں کے پینے کا پانی تو یہاں ملتا نہیں تم انہیں کس طرح تازہ رکھتے ہو۔

اسنے چونے کے بنے ہوئے چوڑے ڈھکنے کو زمین سے اٹھا کر ایک طرف کر دیا ایک چھوٹا سا کنواں پانی سے بھرا تھا نتھرا ہوا صاف پانی۔

کہنے لگا "بھگوان کی دیا ہے جب پانی پڑتا ہے تو مندر کے پچھواڑے ٹوبے میں سے لا کر میں پوری گرمی کی ضرورت کے لئے یہ سارے چونے کے کنڈ بھر لیتا ہوں۔ میں نے دیکھا قطار در قطار درجنوں کنڈ تھے چٹان کو کاٹ کر بنائے ہوئے یہ گڑھے زمین میں یوں دبا دیئے جاتے تھے کہ پانی خشک نہیں ہوتا تھا۔"

میں نے کہا اکیلے میں جی نہیں گھبراتا۔

"نہیں قافلے یہاں سے گذرتے رہتے ہیں گرمی کے دو تین ماہ تکلیف ہوتی ہے اور تکلیف بھی کیا میرے لئے بھگوان کافی ہیں انہیں کے کاموں سے مجھے وقت نہیں ملتا کہ اکیلا اور اداس ہو سکوں۔ ٹھیک ہے جہاں ایک بھگوان اور ایک انسان ہو وہاں معاملہ الٹ ہو جاتا ہے وہاں آدمی کو بھگوان کے کام کرنے پڑتے ہیں اور وہ آپ آسن پر بیٹھا دودھ سے نہاتا دیوں کی روشنی میں ایسے سپنے دیکھتا ہے جو سکے پجاریوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ سپنے جن میں وہ اکیلا ہے اور بستیاں اجڑ رہی ہیں اور مندر صرف ایک دیئے سے آباد ہیں اور انسان انسان سے نفرت کرتا ہے۔

افسر نے میرے کاغذات دیکھ کر کہا "یہاں پوسٹ پر آپ کے رہنے کے لئے کیا بندوبست

ہو سکتا ہے آپ رہنال بستی میں رہیں تو بہتر ہو گا۔ ہماری زندگی میں کوئی گہما گہمی نہیں عجیب اکتا دینے والی یکسانیت ہے جب کبھی دشمن کے سپاہی اونچے ٹیلوں کے پیچھے سے اپنی بیکاری سے تنگ آ جاتے ہیں تو ہم پر حملہ کرتے ہیں۔ ورنہ ہم سرحد کی موہوم لکیر کی نگرانی کرتے یہاں پڑے ہیں عام حالات میں یہاں دم گھونٹنے والا سناٹا رہتا ہے صرف ہمیں چوکس رہنا پڑتا ہے اور تیار۔

تو یہ رہنال پوسٹ تھی جسکے لئے میں گھر میں اتنی دور سے آیا تھا مجھے بہت مایوسی ہوئی مگر پھر بھی میں ایک عام سپاہی تھا۔ ریت کے ٹیلوں کے اس جنگل کے دل میں رہنال بستی کے سردار نور خاں کے گھر میں ہمیں ٹھکانہ مل گیا۔

بستی اصل میں پوسٹ سے کوئی ایک میل پورب کی طرف تیس چالیس گوپوں کا ایک چھوٹا سا جھنڈ تھی درمیان میں ایک ٹوبہ تھا جب گرمی کی شدت میں ٹوبہ خشک ہو جاتا تو ایک کنوئیں سے کام چلایا جاتا۔ پانی کنوئیں کی تہہ میں تارے کی طرح چمکتا تھا اور بمشکل اتنا ہوتا کہ بستی کے لوگ پیاس بجھا سکیں۔

نور خاں کا گھر بستی کے سرے پر ایک علیحدہ احاطے میں تھا جس میں پانچ چھ گوپے تھے۔ دو گوپے جو احاطے میں ہی تھے جن کا راستہ الگ تھا اور جو اب تک چوپال کے طور پر استعمال ہوتے آئے تھے ہمیں دیئے گئے۔ پیرن نے اپنا سامان نکالا اور انہیں سجانے میں لگ گیا۔ بڑا گوپا اندر سے کھلا تھا اس کا دروازہ بھی ذرا بڑا تھا۔ اسے ہم نے نشست کے لئے ٹھیک کیا۔ لکڑی کے تختے جوڑ کر ایک تخت بنایا گیا جسے قالین بچھا کر اور تکیے لگا کر ہم نے بیٹھنے کی جگہ بنائی پھوس کی دیواروں کو ریشمی چادروں سے ڈھانپ دیا چھت کے نیچے رنگین کپڑا تان کر گول ٹوپ کے نیچے ایک اور چھت بنائی جس پر چمکتے دھاگے سے تارے بنے تھے اور بتی کی روشنی میں خوب چمکتے تھے زمین پر پھوس بچھا کر اس پر قالینوں کا فرش کیا اور اپنے حالوں ہم نے محل کا ماحول پیدا کر لیا۔ دوسرے گوپے میں پکانے کے برتن اناج کا ذخیرہ، شراب کی بوتلیں اور ایسا سامان تھا جس کی ضرورت کا اندازہ پیرن کو ہی ہو سکتا تھا۔

اور یہی پہلی رات تھی جب گارتی خاں نے آ کر کہا تھا "مریم کو نہ تم جیت سکتے تھے اور نہ وہ تم سے ہار مان سکتی ہے۔

گاری خاں بستی کا دیوانہ تھا۔ وہ صبح ایک پرانی بندوق کو کندھے سے لٹکا کر باہر نکل جاتا اور تپتی دھوپ میں بھی ریت کے ٹیلوں میں گھومتا پھرتا۔ جب ملک تقسیم نہیں ہوا تھا تو وہ فوج میں تھا پھر یہ لکیر رہنمال کے سینے پر ابھری تو اسے بستی میں ایک گوپا بنا لیا اور پوسٹ کی طرف جانے سے بھی انکار کر دیا۔ اس کی شدت انکار کو لوگوں نے اس کی دیوانگی جانا۔ جانے کونسی تلخی تھی جس نے اسے فوج کی زندگی سے اس حد تک متنفر کر دیا تھا۔ دھوپ میں بھی وہ گھومتا رہتا۔ خانہ ساز شراب پی کر رات کو بے سدھ پڑا رہتا۔ بال بچوں کے جھنجھنٹ سے دور اپنی تنہا اداسی کو وہ شکار اور شراب سے آباد کرتا اور پرانے گیت گاتا جن میں عورتوں کے حسن کا ذکر ہوتا محرومی کی اداسی کا رونا ہوتا۔ مگر جب وہ ہوش میں آتا اور اپنے حواسوں میں ہوتا اور اس سے گیت کا پوچھا جاتا تو وہ صاف مکر جاتا کوئی گیت اسے یاد نہ تھے۔ لوگ اس سے محبت کا برتاؤ کرتے۔ عورتیں اسے دیکھ کر افسوس کرتیں اور بستی والے اس آدمی کو جس کا اپنا کوئی نہ تھا اپنے درمیان میں پاکر اجنبی نہ سمجھتے۔

گرمی ہوش اڑائے دیتی تھی گائیں بھینسیں مرجھائی ہوئی صورتیں لئے بھاتوں کے آگے کھڑی ہوتیں تو نور خاں کی بیوی اور بیٹی شام کو دودھ دوہنے میں لگ جاتیں۔ جانی کی گھم کار سے میری آنکھ کھلی تو صبح کے آسمان پر رات کے تاروں کا غبار ابھی باقی تھا اور پورب کی ہوا بستی کو ریشمی ٹھنڈے بچھونے کی طرح بنانے کی خاطر ہولے ہولے تھپک رہی تھی۔ اپنی زندگی میں پہلی بار میں نے جینے کی سادگی ضرورتوں کی کمی اور آسانی کو قریب سے دیکھا تھا ہمارے ہاں ہر شے تہذیب اور رواج کی مناسبت سے دوری یا نزدیکی درجوں اور قاعدوں کی مرہون منت ہے۔

پیرن اور گاری خاں کے درمیان ایک خاموش معاہدہ ہو گیا تھا جب سورج ٹیلوں کے پیچھے چھپنے لگتا اور مغرب کی طرف ہوا بادلوں کی لالی بن جاتی تو گاری خاں ہمارے گوپے میں آجاتا۔ سارے دن کی داستان، گزرے ہوئے قصے کہتے سنتے۔ پیرن میرا کھانا تیار کرتا۔ میں کھانے سے فارغ ہو کر اکیلا ہی ٹیلوں کی طرف نکل جاتا اور وہ دونوں جانے کب تک بیٹھے رہتے۔

پوسٹ کے مینار میں بیٹھے جس سپاہی کا خیال آتا اور اپنی بے کار زندگی کا۔ آتے ہوئے

میں جلدی میں اور جذبات کی رو میں اپنا ستار چھوڑ آیا تھا اگر وہ لے آتا تو شام ابھی گزر جایا کرتی۔ لوگوں کو معلوم تھا کہ میں کون ہوں اس لئے وہ مجھ سے زیادہ بات کرنے سے گھبراتے تھے۔ بستی کے کنارے گلی کے موڑ پر جھاڑیوں کے قریب ٹیلوں پر گھومتے اگر کوئی مجھے مل جاتا تو میرے گھٹنوں کو چھو کر اور راہ چھوڑ کر الگ ہو جاتا۔ میں ایک اچھوت کی طرح تھا۔ جو مندر کی چوکھٹ سے باہر کھڑا رہ کر بھگوان کے درشن کر سکتا تھا مگر اسکے چرن نہیں چھو سکتا۔

پوسٹ کی طرف جاتا تو سپاہی مجھ سے بات نہ کرتے ان کی آنکھوں میں بے یقینی ہوتی اور حقارت بھی کہ میں جو امیر زادہ تھا بھلا کیسے ایک عام سپاہی کی زندگی گزارنے آیا تھا۔ نور خاں نے بھی مجھ سے میل جول بڑھانے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی روز صبح اٹھ کر آدمی مجھ سے پوچھ جاتے تھے کہ مجھے کسی شے کی ضرورت تو نہیں اور پھر سارا دن یوں گزر جاتا کہ بستی میں کسی سے بات کرنے کو میرا دل ترس گیا۔

گوپے میں تخت پر بیٹھے دیوانِ غالب پڑھتا میں دیکھتا کہ نور خاں کی بیٹی اور بیوی کاموں میں جتی ہیں احاطے میں باتیں کر رہی ہیں نور خاں اونٹوں پر محنت کرتا۔ محبت سے ہاتھ پھیرتا انہیں لمبے سفر کے لئے تیار کر رہا ہے۔ یہ سارا تماشا میری نگاہوں کے سامنے ہوتا۔ گلی میں سے عورتیں گزرتیں۔ پیرن سے ہنس کر بات کرتیں مگر گوپے کی طرف بھی دیکھ لیتیں۔ ساری بستی مجھے ایک اجنبی بوجھ کی طرح محسوس کر رہی تھی۔ میں انہیں کیسے سمجھا سکتا تھا کہ میں ان مصیبتوں میں پڑ کر اپنے آپ کو مضبوط بنا رہا تھا تاکہ اپنا آپ اپنے اس بابا پر ثابت کر سکوں۔ جو جانے کب کے یورپ روانہ ہو چکے ہوں گے اور جن کا بیشتر وقت اپنے کمرے میں بیٹھ کر شطرنج کی بازی جیتنے اور ہدایات دینے میں صرف ہوتا تھا جو علاقے پر ہوتے تو گھبرائے ہوئے رہتے اور یورپ میں رہ کر ریس کھیلتے اور گھوڑوں مغربی عورتوں اور تھیٹروں پارٹیوں اور کلبوں میں مصروف رہتے اور زندگی سے زیادہ سے زیادہ خوشی حاصل کرنے کے درپے تھے۔ ایک ایسے آدمی کی طرح جو مصر ہو بضد ہو کہ وہ ایک گلاس شراب کو دو گلاسوں میں بھر سکے گا اور ان سے لطف اندوز بھی ہو گا۔ انہی دنوں گھومتے پھرتے اور چارے کی تلاش میں سرگرداں روہیلوں کا ایک قبیلہ بستی کے باہر آ کر رکا ان لوگوں نے یہاں ایک کنوئیں کا سنا تھا اور پانی لینے ٹھہر گئے تھے۔ اس دن سردار کے گھر گہما گہمی سی تھی اور چوپال خالی نہ ہونے کی وجہ سے سارے بڑے بوڑھے نور خاں کے گھر اس چبوترے

پر بیٹھے تھے جس پر دودھ کے برتن مکھن کی ٹکیاں اور اناج کے مٹکے رکھے تھے۔ نور خاں کی بیوی جو سخت مزاج اور تیز طبیعت کی تھی بار بار گوپے میں اندر اور باہر آجا رہی تھی جیسے اسے کہیں بھی قرار نہ آتا ہو۔ پریشان سی ہو کر کبھی اپنی بیٹی کو آواز دیتی اور کبھی برتنوں کو الٹنے پلٹنے لگتی۔ مریم نے سارے جانوروں کو ہنکا کر ٹیلوں کا رخ کیا تو ماں نے کہا۔

"مریم تم آج اکیلی مت جاؤ۔ پرائے لوگ بستی کے باہر ڈیرے ڈالے ہیں۔"

لڑکی نے ہنس کر ماں کی طرف دیکھا اور کہنے لگی تو پھر تم جاؤ گی۔ دیکھتی نہیں ہو دن بڑھنے لگا ہے اور یہ جو تم دوسرے قبیلے والوں کا ڈر دیتی ہو کیا تم کو معلوم نہیں کہ میں کسی کو کچھ نہیں سمجھتی۔"

ماں نے زور سے کہا "تم اپنے باپ کی لاڈلی ہو کسی کی بات کیا مانو گی۔ میں کہتی ہوں کیا تم کسی اور کے ساتھ گائیں نہیں بھیج دو گی۔"

مریم نے ماں کی بات سنی ان سنی کر دی اور گلی میں آگے بڑھ کر سنبل کو آواز دی جو بھیڑوں کو ہنکائے جا رہی تھی۔ پھر دونوں سہیلیاں ٹوبے کے کنارے سے گھوم کر نظروں سے اوجھل ہو گئیں اور گلی سنسان ہو گئی۔

میں گاری خاں کی بات پر غور کرنے لگا۔ پہلی بار مجھے رنہال کی بستی میں چہل پہل رونق اور جینے کے آثار نظر آئے۔ کوّے تیز تیز پر مارتے جاتے تھے اور چڑھتے سورج کی کرنیں دھار والے آلے کی طرح زمین کا سینہ چیر رہی تھیں۔ بچوں کے رونے کی آوازیں۔ بھیڑوں کا ممیانا گائیوں کے گوبر اور موت کی بو ٹیلوں پر ریت کے لہریئے۔ خشک جھاڑیوں کے سبز پتے گویوں کی قطاروں میں ایک بے پناہ خوبصورتی ٹوبے کے کنارے کنارے جھاڑیوں کے جھنڈ جو جانے کس طرح ابھی تک سبز تھے۔ کھپ اور کھوگ کے سوکھے ہوئے پودے۔ یہ ویرانہ تو بہت آباد تھا۔

بستی کے لوگوں نے فیصلہ کیا ہو گا کہ پیرن بھاگا آیا اور کہنے لگا "سائیں آج رات آنے والے قبیلے کو دعوت دی جائے گی تاکہ وہ اپنے آپ کو یہاں مہمان سمجھیں اور تین دن بعد بنا کسی خون خرابے کے رخصت ہو جائیں۔ سردار نور خاں نے یہ طریقہ سوچا ہے۔

شام دیوں کی قطاروں پر اپنے نیلے دھند لکے سمیت اتری اور بستی میں آنے والے جشن کی تیاری دیکھ کر حیرت سے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ نور خاں کے احاطے سے پرلی طرف لوگ قبیلے کے لئے کھانا پکا رہے تھے۔ ساری بستی آج سردار کے ہاں کھانا کھانے والی تھی اس لئے عورتوں نے کنگھی چوٹی کی تھی۔ بچے نئے کپڑے پہنے گلیوں میں گھومتے پھر رہے تھے اور کنواریاں ڈھلے ہوئے جوڑے پہنے احاطے میں ٹولیاں بنا کر باتیں کر رہی تھیں۔

یہ جشن بستی کے باہر بھٹ پر ہونے والا تھا۔ نقاروں والے نقارے پیٹ رہے تھے ڈھول بج رہے تھے اور پورا چاند ٹیلوں کے پیچھے سے بے قرار ہو کر کبھی سے اس سارے تماشے کو جھانکنے لگا تھا۔ پھندرے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ چڑیوں کی ٹولیاں لانے کی جھاڑیوں میں شور مچا رہی تھیں اور نرم ہوا کبھی سے چاندنی کو اڑانے کی کوشش کرتی ہوئی چل رہی تھی۔ اس رات کے مکمل حسن اور سادگی کو میں بھول نہیں سکتا۔ زندگی میں میں نے بہت حسین راتیں دیکھی ہیں ایسی بھی جب انسان کا جی مر جانے کو چاہنے لگتا ہے ایسی راتیں جب جنت کا گمان دنیا پر گزرتا ہے۔ ٹھنڈک راحت، آسودگی ایسی چیزیں جو محبت کے بنا بھی سکون دیتی ہیں۔ مگر وہ رات سادہ سی تھی۔ پوسٹ کے وہ سپاہی جو اپنی ڈیوٹی سے فارغ تھے عام کپڑوں میں آئے تھے ہمارا افسر بھی اس میلے کو جو بہت دنوں کی یکسانیت کے جمود کو توڑنے کا کام دینے والا تھا دیکھنے آیا تھا اور اسے مجھ سے بھی چلنے کو کہا۔ سردار نے خود آکر بھی مجھ سے کہا تھا۔

"مانتیں اگر بلاؤں اور آفتوں کو بھلا کر دور کیا جا سکتا ہے تو میں یہی کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آپ کو دعوت تو کیا پسند آئے گی مگر میرا دل بہت خوش ہو گا اگر آپ ہمارے جھوم اور کھیل دیکھنے آئیں۔"

میں نے سوچا تھا کسی دور کے ٹیلے پر پیرن کے ساتھ دیکھ لوں گا ایک اجنبی کی حیثیت سے شریک ہونے سے تو بہتر ہے کہ میں محض تماشا دیکھوں مگر جب افسر بھی آیا تو میرا دل خوش ہو گیا۔ ایک سے دو بھلے تو جنگل کی اجنبیت دور ہو جایا کرتی ہے۔ میں نے بہت دنوں کے بعد ذرا اچھے کپڑے پہنے شراب پی اور روح کو گرم کرنے کا سامان کیا۔ شراب پرانی اور تیز

بھی ڈھول مسلسل بج رہا تھا۔ نقارے کو بجانے والا نقارے کو پوری قوت سے پیٹ رہا تھا۔ ریت کے ٹیلوں کی ایک خشک سی بوتل تھی جس میں مہمان قبیلے کی عورتوں کی لمبی تانوں والے گیتوں کا سہاگ رنگ بھی تھا۔ ہم لوگ کھٹ سے ذرا دور ایک ٹیلے پر بیٹھے تھے اور پھر بھی کھٹ پر ناچنے والے ٹولوں میں شریک تھے۔ کنواریاں گیت گاتی تھیں ادھیڑ عمر کی عورتیں اور مرد ناچ رہے تھے۔ جب چاندنی تیز ہو گئی ستارے چھپ گئے تو ناچ کی رفتار تیز ہو گئی۔ کنواری لڑکیاں اپنا الگ ٹولہ بنا کر ناچ رہی تھیں۔ ہم لوگ اس میں شامل ہو گئے تو ساری لڑکیاں شرم کے مارے سکڑ کر کھڑی ہو گئیں۔

مریم نے کولھوں پر ہاتھ رکھ کر بڑی ادا سے کہا "سائیں میں نہ آپ کے لحاظ کے مارے ناچ رہی ہوں اور نہ پوسٹ سے آئے ہوئے بڑے آدمی کے لئے۔ میرا تو بس ناچنے کو جی چاہتا ہے" اور یہ کہہ کر نقارے کی تیز تال پر گھوم گئی۔ اور سنبل بھی اس کے ساتھ شریک ہو گئی۔ شراب میری رگوں میں پانی بن گئی۔ یہ کیسی کنواری تھی شاید گاری خاں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اب گاری خاں مجھے وہ دیوانہ نہیں لگتا تھا۔

لمبی تانوں والے گیتوں میں شیام سندر کا نام بار بار سننے میں آتا تھا جیسے رنگ پور کے مندر کا پجاری تلک لگائے، دودھ میں نہائی مورتی کے سامنے بیٹھا کہہ رہا ہو۔

"نت جاگن میریاں انکھیاں"

افسر کا ہاتھ پکڑ کر جب میں کھٹ سے اپنے احاطے کی طرف مڑا ہوں تو ہنستی ہوئی لڑکیوں کا ایک ٹولا ہمارے آگے آگے چل رہا تھا وہ مریم کو چھیڑ رہی تھیں اور علینے خاں کا نام لے رہی تھیں۔ چاندنی مجھے پھیکی اور بے کیف لگنے لگی۔ اس لڑکی سے بدلہ لینے کے سارے منصوبے مجھے خاک پھنکنے جان پڑے۔ میں جو شام کو زندگی کی ہماہمی سے بھرپور اور خوش ہوتا ہوا ایک رومیلے کی طرح نکلا تھا گلیوں میں ایک آوارہ امیر زادے کی طرح بھٹکتا ہوا گھر آیا۔ چیزوں عورتوں اور محبتوں کو بس میں کر لینے والے انسان کو پہلی بار پتہ چلا تھا کہ اپنا آپ بھلانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔

گاری خاں سچا آدمی تھا۔

تین دن کے بعد قافلہ کوچ کر گیا۔ جھٹ پٹ بجتے ہوئے نقارے ہو نکتی ہوئی گرمی سے بھری فضا میں خاموش ہو گئے اور بستی ایک آفت سے بچ گئی جیسے لمبی بیماری کے بعد اٹھی ہو جو ان بلکے گھوم رہے تھے ان کے سروں سے بوجھ اتر گیا تھا۔ مریم کو میں دیکھتا احاطے میں بھیڑوں کو ہنکا کر لاتی اور روزمرہ کے کام کرتی اسے شاید بھول چکا تھا کہ وہ دعوت والی رات مجھے ایک خاموش مقابلے کے لئے پکار چکی ہے اس کی ماں کی آواز اس کے وجود پر چھا نہیں سکتی تھی۔

سنبل گلی میں سے گزرتے ہوئے ایک شام پیرن سے کوئی چیز مانگنے کھڑی ہوئی تو میں ہمت کر کے کوٹھے میں سے نکلا وہ مڑ کر بات ختم کئے بنا جانے لگی تو میں نے اس سے کہا "ناچ کی رات کے بعد سے کہیں دکھائی ہی نہیں دی ہو۔"

پیرن نے مڑ کر میری طرف حیرت سے دیکھا۔
سنبل نے بھی اس سے دگنی حیرت سے مجھے دیکھا اور پھر جھک کر میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر کھڑی ہو گئی۔

میں نے کہا آج کل کام بہت ہے کیا؟
سنبل نے بڑے سکون اور دھیرج سے آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور کہنے لگی بلند خاں کا بیٹا عیسیٰ خاں رکھنی پوسٹ سے چھٹی پر گھر آنے والا ہے میں مریم کے ساتھ مل کر اس کے جوڑے میں موتی لگوا رہی ہوں جو وہ اپنے نکاح پر پہننے والی ہے۔"

تو یہ سکون سے اٹھنے والی آنکھیں میرا راز جانتی ہیں؟

اس شام پہلی بار ٹیلوں کی طرف گھومنے جاتے ہوئے جب میں نے گاری خاں کو دیکھا تو اسے اشارے سے بلا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ ہم شام کی سرخی میں غروب ہوتے سورج کی لالی سے رنگین ٹیلوں اور چڑیوں کی آوازوں سے آباد جھاڑیوں سے بھی دور نکل آئے تو میں نے کہا گاری خاں میں تھک گیا ہوں کوئی گیت سناؤ۔

اسنے کندھے سے لٹکی اپنی بندوق اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی اور اسے پیار سے تھپکتے ہوئے اونچی لے میں ایک عشقیہ گیت گانے لگا۔ پھر وہ ایک ہی فقرے کو بار بار دہرانے لگا یہاں تک کہ

شام کے دھندلکے میں اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ رونے لگا۔ اس نے بندوق کو سینے سے لگایا چوما پیار کیا اور کہنے لگا "زندگی میں میری پہلی اور آخری محبوب یہی ہے۔ کیوں سائیں کیا آپ کو میری محبوبہ پسند نہیں۔

وہ تو سچ مچ دیوانہ تھا۔

ہم جب گھر لوٹے ہیں تو پچھلی راتوں کا چاند ان ٹیلوں کی ریت کو چمکا رہا تھا جن پر ہم بیٹھے پرانے قصے زمانے کے ظلم اور جانے کیا کیا دہراتے رہے تھے۔ ہرنوں کی ڈاریں بھاگ رہی تھیں اور ویرانے کی آبادی اپنی ساری خوشبوؤں کے ساتھ نظر حد تک پھیلے صحرا کے کنارے پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ اس رات میں اور گاری خاں دیر تک شراب پیتے رہے اور یوں گم سم بیٹھے رہے جیسے کسی کو دفن کر کے آئے ہوں۔

اگلے دن سردار نور خاں کی بیوی نے مجھے گوپے سے نکلتے دیکھا تو کہنے لگی۔

"سائیں آپ مالک ہیں چھوٹا منہ بڑی بات میں کہنا نہیں چاہتی مگر پھر بھی کہہ رہی ہوں یہ بڈھا بہت لالچی، غلیظ اور پاگل انسان ہے اس کو زیادہ منہ لگانا ٹھیک نہیں۔

میں نے سر ہلا دیا اور گوپے میں چلا آیا مجھے شراب پی کر بہکنے والے لوگ پسند ہیں۔ وہ زیادہ سادہ دل اور بے ضرر ہوتے ہیں ان کے جی میں ریا اور فریب نہیں ہوتا۔ میں خود اتنی نہیں پیتا کہ بہک جاؤں۔ ایک ایک جرعہ جیسے کوئی خوشی کی ساعتوں کا استعمال سنبھل سنبھل کر کرے۔ مجھے رگوں میں سیال آگ اچھی نہیں لگتی یوں کہ آدمی اتنا گرم ہو جائے کہ لگے وہ آتش فشاں کے دہانے کی طرح کھلے گا اور بھک سے اڑ جائے گا۔ میں تو خون میں بس اتنی حدت چاہتا ہوں جو بھولی بسری باتوں کو زیادہ عزیز اور جینے کو قابل برداشت بنا دے۔ شام کو گاری خاں مجھے راہ میں ملا اور خاموشی سے میرے ساتھ ہو لیا۔ ہم نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی۔ واپسی میں کہنے لگا "مجھے پیرن نے بتا دیا تھا کہ آپ کو سردار کی بیوی ملی تھی۔ سائیں یہ تو بلا کی عورت ہے سردار اس کا چوتھا خاوند ہے۔ پچھلے خاوندوں کو اس نے کیسے ٹھکانے لگایا مجھ جیسے ہوشیار آدمی کو بھی پتہ نہیں چل سکا۔ مریم پر کتنی سختی کرتی ہے اور امرایا خان مریم کا بھائی بھی اسی کی وجہ سے رکھی پوسٹ میں رہتا ہے سردار کو بستی کے لوگوں سے

زیادہ ملنے نہیں دیتی!"

"اچھا" میں نے گوپے کے کنارے جھاڑیوں کے جھنڈ کی اوٹ میں کھڑے ہوئے کہا۔

پانچ سال پہلے کہیں سے ایک قافلہ گھومتا پھرتا آیا اور گوپے کے کنارے جم کر بیٹھ گیا۔ وہ لوگ تعداد میں زیادہ تھے انہوں نے ہماری بستی پر قبضہ کرنا چاہا لڑائی ہوئی اور اں کا سردار مارا گیا یہ اس سردار کی بیوی تھی۔

"اس کے بچے؟"

"بچوں کو قبیلے والے اپنے ساتھ لے گئے وہ اپنے خون کو غیر جگہ کیونکر چھوڑتے یہ عورت یہاں رہ گئی مریم کی ماں ان دنوں بیمار رہا کرتی تھی۔ پھر ایک دن اچانک سُنا وہ مرگئی۔ سردار نُور خاں نے کئی سال اس سے بات نہیں کی اسے مرنے والی سے بہت لگاؤ تھا مگر وقت بڑے سے بڑے گھاؤ کو بھر دیتا ہے اور پار سال اس نے اس سے نکاح کر لیا۔"

گاری خاں تھوڑی دیر چپ رہا پھر کہنے لگا "لوگ تو کہتے ہیں اس نے نُور خاں کی بیوی کو مار دیا ہوگا مگر میں اس بات کو نہیں مانتا۔ اس عورت کا گھر میں آکر بس جانا ہی اس کی موت بن گیا۔ وہ بڑی دھان پان نازک اور دھیرج سے بات کرنے والی دُلہن تھی اس نے اپنی آواز کو کبھی اتنا بلند نہیں کیا کہ گوپے سے پانی لینے جاتی تو عورتیں مڑ کر دیکھیں۔ آپ نے نہیں دیکھا مریم یوں تو ہر لحاظ سے شیرنی ہے مگر نزاکت میں اس کا جوڑا اپنی ماں سے ہے۔"

میں واپس آیا اور یہ پرواہ کئے بنا کہ نُور خاں کی بیوی نے کیا کہا تھا میں نے اسے شراب پلائی وہ دونوں گھٹنے تہہ کر کے بیٹھا تھا اور گھونٹ گھونٹ شراب کو گلاسوں کے حساب سے پی رہا تھا۔ میں ساقی بنا اُسے پلا رہا تھا اور باہر رات چاندنی کی چادر اُوڑھے مُنہ چھپائے کسی سے ملنے جاتی ماڑ کی کنواری لگ رہی تھی۔ دُور دُور تک ٹیلوں پر جانور تھے اور نُور کا غُبار تھا اور دھیرے دھیرے دبے دبے پاؤں اُٹھاتی کنواری کے جھانجھن بج اُٹھے۔ گلی میں کسی اونٹنی کے تیز چلنے کی آواز آئی پھر کسی نے زور سے نُور خاں کو پکارا۔ گاری خاں نے کہا "یہ امرایا خاں ہے۔"

امرایا خاں کے ساتھ اس کا دوست بھی تھا دونوں نکلتے قدوں کے جوان ہوتے ہوئے

لڑکے تھے اور فوج کی وردیاں پہنے اکڑ کر چل رہے تھے۔ بستی کی لڑکیاں ہماری گلی میں سے زیادہ گزرنے لگی تھیں سویرے سے کنوئیں کو پانی بھرنے جاتے وہ ہمارے احاطے کے سامنے سے رستے اور بالٹیاں لئے نکلتیں تو رک کر مریم کو آواز دیتیں اور امرایا خاں کا حال پوچھتیں۔ آنے جانے والوں کی بھیڑ سی لگی تھی۔ دوپہر میں آرام کرنے کیلئے لیٹا ہوں تو گوپے کے دروازے کے سامنے سے خوشبودار گھاس کا تختہ ہٹا کر نور خاں اندر آیا اور کہنے لگا "سائیں امرایا آپ کے سلام کو حاضر ہونا چاہتا ہے"۔

دونوں باپ بیٹے قالینوں کے فرش پر بیٹھ گئے۔ بیٹا بے چین آنکھوں سے چاروں طرف دیکھتا تھا۔ اُس کے انداز میں ایک بے پرواہی تھی جو پیرن کے بڑی محنت سے سجائے ہوئے اس رنگ محل سے بھی مرعوب نہ ہوئی۔

میں نے پوچھا "کہو امرایا خاں اچھے تو ہو۔ اپنی پوسٹ کا حال سناؤ میرا دل رکھنی دیکھنے کو چاہتا ہے مگر گرمی سے جی چھوٹ جاتا ہے"۔

اس نے بڑی بے یقینی سے میری طرف دیکھا پھر ریشمی چادروں سے ڈھکی پھونس کی دیواروں کی طرف، اور ہنس کر بولا۔

"آپ بادشاہ آدمی ہیں اس گرمی میں سفر کیونکر کر سکتے ہیں"۔

میں نے کہا "نور خاں سے پوچھ لو اس گرمی اور بادشاہی میں آیا ہوں۔ معمولی سپاہی ہوں۔ صرف ہماری پوسٹ کے افسر مجھے تمہارے باپ کے ہمسائے میں رکھ کر خوش ہیں"۔

اس نے اُٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور چہرے پر کا غبار صاف کر کے میرے برابر بیٹھ گیا۔ ہم دونوں بہت پرانے دوستوں کی طرح نسکار، فوج اور سرحد کی باتیں کرتے رہے۔ رکھنی پر کچھ دن پہلے دشمن کے سپاہیوں نے رات حملہ کیا تھا۔ معمولی جھڑپ نہ تھی، وہ مشین گنوں سے مسلح ہو کر آئے تھے۔ اتفاق کی بات ہے اس دن ٹاور پر امرایا کی ڈیوٹی تھی اور جب چاند چھپ گیا تھا تو ٹیلوں کی اوٹ میں سے ہو کر آئے۔ دشمنوں کو دیکھ کر اس نے دور سے للکار تھا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی جیسے پتہ بھی ہلے تو زمین کے ذرے بول اٹھیں گے۔ سب نے کہا تمہارا وہم ہوگا بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے اگر انہیں آنا ہوتا تو آ چکے ہوتے۔ گشت پر سپاہی باتیں کرتے اور روزمرہ کی طرح گیت گاتے پھر رہے تھے۔ وہ اپنی سرحد کیساتھ

ادھ میل تک چلتا گیا اور اچانک انہیں جا لیا۔ مگر یہ اکیلا تھا اور وہ تقریباً دس تھے اسنے اپنی اسٹین گن سنبھالی اور پوزیشن لی۔ گولیوں کی آواز سن کر پوسٹ سے سپاہی بھی اس کی مدد کو پہنچ گئے۔ اس اکیلے نے تقریباً آدھ گھنٹے دشمن کو روکے رکھا تھا۔ جب بڑے افسر گشت پر آئے تو اس کی خوب پیٹھ ٹھونکی گئی اور یہ چھٹی اُسے اسی خوشی کے سلسلے میں ملی تھی۔ ویسے اس کی سرحد پار کے کئی جوانوں کے ساتھ دوستی تھی وہ دوسرے ملک میں جا چکا تھا۔ نمک اور مکھن کے بدلے انھوں نے اُسے ایک سفید اونٹ کا بچہ دیا تھا۔ اس کے دوست کا نام رام دیا تھا وہ صحرا میں دور تک جہاں برسوں پانی کی ایک بوند نہیں مل سکتی، پہنچ جاتا تھا اور بہت بہادر تھا۔ اس کا باپ کسی زمانے میں رکن پور میں رہتا اور ڈاکے ڈالتا تھا۔ اسے سرحد کی اس پار کی زمین سے بہت محبت تھی۔

میں نے کہا "تمہارے افسر کو تمہارے اس میل جول پر اعتراض نہیں"۔

کہنے لگا "یوں سبھی لوگ سرحد پہ مل جل کر رہتے ہیں۔ آخر اس سے پہلے بھی تو سبھی ایک جگہ رہتے تھے۔ سپاہی کی زندگی بھی عجیب ہوتی ہے ابھی دوستوں کی طرح ان سے باتیں کرتے ہو ابھی حکم ہوا تو بنا سوچے ان کی جان لے لو اور اس پر لڑتے پھرو۔ میں سوال نہیں کر سکتا کچھ پوچھ نہیں سکتا مگر یہ جاننا چاہتا ہوں کیا اس نظر نہ آنے والی لکیر کیلئے گھنی اور رنہال اور ایسی پوسٹوں پہ بے کار سپاہیوں کو بٹھانا کیا ضروری ہے؟ پچھلی دفعہ جب حملہ ہوا ہے تو ہمارا ایک سپاہی مارا گیا تھا۔ اس سے اگلے دن وہ چھٹی پر جا رہا تھا اس نے اپنی بیوی کے لئے ریشمی جوڑا کسی نہ کسی طرح منگوایا تھا اور بچّی کے لئے کھلونے آپ بنائے تھے۔ کتنے ارمانوں سے اس نے گھر کے سپنے دیکھے ہوں گے اور اس رات حملے میں وہ مارا گیا"۔

میں نے کہا "تمہارے دل میں اس نوکری کے خلاف اتنی شکایت ہے اور پھر بھی تم پوسٹ پر رہتے ہو اسی بہادری کے سلسلے میں چھٹی پر آئے ہو تمہارے دل میں یہ کیسی بے یقینی ہے"۔

امرایا بیٹھے سے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا "میں نے یہاں سے بہت دور شہر کے مکتب میں جا کر قرآن کریم پڑھا تھا۔ جو مولوی ہمیں سبق پڑھاتے تھے وہ ہمارے ساتھ ہر قسم کی باتیں کیا کرتے تھے روح کی اور موت کی اور جینے کی۔ اصل میں وہ مولوی نہیں تھے عالم تھے

میں نے ان سے فلسفہ اور حدیث سب پڑھا ہے، آپ پوچھیں گے میں بھی کسی مکتب میں مُلّا کیوں نہ بن گیا مگر میں زندگی اور خشک فلسفے عمل اور علم میں فاصلے مٹانا چاہتا تھا۔ انگریزی تعلیم میرے پاس نہیں تھی جو عہدے دِلا سکتی اور میں رکھنی پوسٹ پر سپاہی بن گیا۔

میں نے کہا "سپاہی کا سب سے پہلا سبق یہ ہے کہ وہ سوال نہیں کرتا وہ صرف عمل ہے اور عمل ہے۔"

وہ کہنے لگا "یہی آگ میرے اندر جلتی رہتی ہے کہ میں کچھ بھی نہ بن سکا مکمل سپاہی تک نہ بن سکا۔ جب ہوا سیٹیوں اور گولیوں کے شور بندوقوں کی ٹھائیں ٹھائیں اور مرنے والوں کی چیخوں زخمیوں کی آہوں سے بھر جاتی ہے تو میں سوچنے لگتا ہوں"۔ باہر سے سیٹی کی آواز آئی تو امراؤ نے کہا "اچھا سائیں اب میں چلتا ہوں صبح سے ملا نہیں اور حسنی خاں مجھ سے خفا ہو جائے گا۔"

وہ کود کر باہر نکل گیا۔ اس کی چال میں ہرن کی سی پھرتی اور آسانی تھی۔ میرے سامنے دیوانِ غالب کے ورق کھلے دروازے سے اندر آنے والی ہوا کے زور سے پھڑپھڑا رہے اور کتاب پہلے صفحہ پر کھلی رہ گئی۔ "کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا۔"

مریم کا نکاح اب کے بھی نہیں ہو سکا۔ نکاح کے مقرر دن سے کئی راتیں پہلے بستی کی عورتیں نور خاں کے آنگن میں اکٹھا ہوتیں اور سہاگ کے گیت گائیں مریم ان میں گھلی ملی گاتی چلتی پھرتی رہتی جیسے یہ تقریب کسی اور کیلئے ہو رہی ہو۔ نور خاں رکھنی گیا ہوا تھا۔ وہ بھی مہمانوں کے ساتھ ہی نکاح والے دن آنے والا تھا۔ چاولوں اور گڑ کی بوریاں اندر جمع تھیں۔ میں دل میں کہتا یہ بھی قسمت کی بات ہے کہ میں مریم سے اس رات کی بے عزتی کا بدلہ نہ لے سکا اور میرے منہ میں کھانا ریت بن جاتا، جینا زہر لگنے لگتا۔ میں اپنے بابا پر تو کیا تہذیب کے ہر مرکز سے دور بنی اس بستی کی ایک گنوار لڑکی پر بھی اپنا آپ ثابت نہ کر سکا تھا۔ ان دنوں میں نے شدت سے شراب پینی شروع کر دی۔

آندھی سمندر کے طوفان کی طرح ایک بے پناہ قوت ہے،

کئی دنوں سے ہوائیں ذرا تیزی آ چلی تھی۔ گرم دوزخی ہواؤں میں تو کمی تھی مگر رات کے پچھلے پہر جھکڑ چلنا شروع ہو جاتا ٹھنڈی ریت اڑ اڑ کر منہ اور آنکھوں میں پڑتی اور نیند میں نشہ سا گھول

دیتی سورج کے نکلنے تک ہوا لوریاں دیتی رہتی۔ سورج نکلنے سے پہلے ہی میں گوپے کے اندر تخت پر لیٹ جاتا اور چاروں طرف بنے گول نشانوں کی طرح روزنوں میں سے ہوا گیت گاتی ہوئی آتی جاتی۔

اس صبح کو گاری خاں ہرن کی پچھلی رانیں لکڑی کے ٹکڑے سے لٹکائے پیرن کے ساتھ اندر چلا گیا۔ پھر گھڑی بھر بعد پیرن نے آ کر کہا "سائیں گاری خاں کہتا ہے سمنت لُو خان آنے والا ہے۔ ریت ہر شے کو ڈھانپ دے گی آپ اس سے پہلے ہی کچھ نوش فرمالیں ورنہ پھر ایک ذرّہ چبانا بھی دشوار ہوگا۔"

روزن میں سامنے وہ چبوترہ دکھائی دے رہا تھا جس پر مریم دودھ بلو رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں میں نے امرایا خاں اور علیٰسی خاں کو گلی کی طرف سے آتے دیکھا۔ امرایا اپنی ماں کے پاس گوپے کے اندر چلا گیا۔ علیٰسی خاں نے ادہر اُدھر دیکھ کر ہولے سے مریم کو پکارا۔

مریم اسے دیکھ کر مسکرائی اور پھر اپنے کام میں لگ گئی۔

علیٰسی نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا مریم نے پھر اسے دیکھا اور یوں غصّے سے دیکھا جیسے ابھی اس کے منہ پر تھپڑ مار دے گی اور تقدم تختی بھیڑوں کی طرف چلی گئی۔

اس لڑکی کی بے پناہ قوت مدافعت اور بے نیازی نے مجھے مسحور کر دیا۔ علیٰسی سے اسکی شادی ہونے والی تھی اور اس کے باوجود اس نے اپنے ہونے والے شوہر کی ذرا سی گستاخی بھی برداشت نہیں کی۔ میں چاہتا تھا علیٰسی کی جگہ میں ہوتا تو اس کے دونوں بازو پکڑ کر مروڑ دیتا میں مریم سے شادی کرنے کی تمنا رکھتا تھا۔

انگاروں پر سنکی اور شراب میں بھگوئی ہرن کی ران کھا کر میں نے کہا "گاری خاں تم نے ایک بار کہا تھا کہ مریم کسی سے ہار نہیں مان سکتی۔"

گاری خاں نے کہا "وہ علیٰسی خاں کو کچھ نہیں سمجھتی وہ کسی سے نہیں دبتی اور دیکھ لینا بیاہ کے بعد وہ شوہر کو بہت پریشان کرے گی۔ اس کی مرنے والی ماں بہت سادہ دل تھی اور تو شیرنی ہے شیرنی، میں شکاری آدمی ہوں نا، اس کی اداؤں کو سمجھتا ہوں، بستی کی اور لڑکیوں کی طرح اس کا مزاج نہیں ہے یوں ہنسنے بولنے اور ناچنے میں اس کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا۔"

میں نے کہا "کوئی راہ نہیں کہ یہ شیرنی کسی طرح رام ہو جائے۔"

گارتی خاں بڑی سادہ دلی سے مسکرایا اور سوچنے لگا۔

پھر میری بات کا جواب دیئے بنا وہ اٹھا اور بڑے بڑے قدم دھرتا گلی کی لمبان سے گوپے کے کنارے کی طرف کود گیا۔

ہوا ڈراؤنی اور تیز آوازیں گھوں گھوں کرتی ہوئی چلنے لگی پھر ریت کی لہریں دیواروں کی طرح ایک کے پیچھے ایک نہایت تیزی سے ٹیلوں کی بڑھیں اور ان سے ٹکرائیں جیسے سمندر کی لہروں بلند ہوتی جھاگ تھوکتی زور دکھاتی اور آگے بڑھتی ہیں اور یہ طوفانی لہریں ٹیلوں کے ساحل کو ننھے کھلونوں کی طرح دم کے دم میں پٹخنے اور بکھیرنے لگیں۔ حفاظتی پشتے تنکوں کی طرح ان بے رحم موجوں کے سامنے سے ہٹنے لگے ریت کے بادلوں نے سورج کو ڈھانپ لیا۔ ہم ابھی سنبھل رہے تھے چیزوں کو ایک دوسرے کے اوپر ڈھیر کر رہے تھے اور قدم جما کر بمشکل چل رہے تھے کہ فضا ٹھائیں ٹھائیں کی آوازوں سے بھر گئی۔

میں نے اپنے آپ کو بندوق پکڑتے اور طوفان میں کودتے محسوس کیا۔ آندھی مجھے اٹھا کر پٹخ رہی تھی اور ٹیلوں کے سہارے اندھوں کی طرح رینگ کر میں آگے بڑھ رہا تھا۔ ایک ناچیز ذرہ طوفان کی مخالف سمت بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"آج تمہارا امتحان ہے امیرزادے اگر جیت گئے تو جیت گئے"

آنکھوں میں ہی نہیں، میری روح تک میں ریت کی چکچاہٹ تھی۔

گولیوں کی آواز میرے آس پاس کہیں ادھر سے ہی آرہی تھی۔ آوازیں ہی آوازیں میرے چاروں طرف تھیں جیسے ان ریت کے ٹیلوں کے نیچے دفن پرانے لوگ اٹھ کر بھاگے جاتے ہوں۔ لوگ میرے دائیں اور بائیں تیزی سے گزر رہے تھے صرف میں بندوق کو مضبوطی سے پکڑے بڑھنے کی کوشش میں تھا اور مجھ سے جتنے زمانے گزر گئے۔

پھر پیرن کی آواز مجھے پکارتی ہوئی اور لوگوں کی صدائیں سنائی دیں اور ریت کو ہٹا کر مجھے باہر نکالا گیا۔

آندھی کے پردے میں دشمن رنہال پوسٹ کے دوسری طرف سے نکل آئے تھے۔ پہلے بستی والوں پر حملہ کر کے انہوں نے بہت سا نقصان کیا تھا۔ عیسیٰ خاں زخمی ہو گیا تھا۔ نور خاں کے گھر

یں بہت خاموشی تھی شاید وہ اسے رکھنی لے جا رہے تھے ۔

گاری خاں نے کہا" آپ نے اس طوفان میں ناحق تکلیف کی بھلا محلوں میں رہنے والے امیرزادوں کو کیا معلوم کہ ریت کے اس جھکڑ میں اپنے آپ کو کیسے محفوظ رکھیں "۔

میں اسے بنا جواب دیئے گوپے سے باہر نکل آیا۔ باہر تارے تھے اور نیلاہٹ تھی اور رات کسی حسین لڑکی کی طرح گھنگھرو باندھے پاتوں سے آراستہ بڑے ناز سے قدم اٹھاتی گزرتی جاتی تھی ۔

بستی میں بہت سے اور لوگ زخمی ہو گئے تھے دشمن اپنے زخمی بھی پیچھے چھوڑ گئے تھے ۔ میں اپنے آپ کو کبھی ثابت نہیں کر سکوں گا۔ میں سپاہی بننے کے نااہل تھا۔

زخمیوں کو دیکھنے میں اور بیرن گئے وہ آنکھیں بند کئے لیٹے تھے اور ہوش میں ہونے کے باوجود کراہتے تک نہ تھے ۔ دشمن اور دوست سب برابر پڑے تھے ۔ ایک کمسن لڑکا جس کی مسیں ابھی نہیں بھیگی تھیں ہنستا ہوا اٹھنے کی کوشش کرتا تھا۔ میں نے جھک کر کہا" افسوس ہے تم زخمی ہو گئے "۔

" اس میں افسوس کی کیا بات ہے، میں سب سے آگے تھا ان تینوں کو بھی میں نے نشانہ بنایا تھا"۔ اس نے بازو سے دشمن کے سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا" ایسے میں ایک آدھ خراش لگ جانا کیا ہے ۔ ہم نے بستی گویوں میں کبھی ہار نہیں مانی ۔ میں بلند خاں کا بیٹا ہوں عیسیٰ خاں کا چھوٹا بھائی مریم میری بھابی ہے "۔

میں نے کہا" تم سردار نور خاں کے گھر اپنے بھائی کے ساتھ کیوں نہیں آئے "۔

میری آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا" میں نے عیسیٰ سے بھی کہا تھا کہ جس گھر میں پرایا آدمی ہو وہاں کیوں جاتے ہو۔ وہ کہتا تھا دو چار دن کی بات ہے اور اب سنا ہے لوگ اسے رکھنی لے گئے ہیں وہ بہت زیادہ زخمی ہے "۔

میں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا اور پھر بند کر لیا ۔

مریم کو میں دیکھتا کہ گیتوں کے سہاگ راگوں کے بعد بھی وہ اسی تندہی سے کام کر رہی ہے ۔ لانے کی سوکھی جھاڑیاں گھسیٹ کر آنگن میں لاتی ۔ دودھ کے بھرے برتنوں کو بڑے سے تنور پر گرم کرتی ۔ اس کی ماں کی چیخ و پکار شور اور گھر میں اپنی جگہ کا بے پناہ احساس بھی شامل ہوتا۔ مگر وہ اس عورت کے وجود سے بے نیاز کام کئے جاتی ۔ اسکی سہیلیاں جیسے تسلی دینے کے لئے احاطے میں

جمع ہوتیں مگر وہ ان سے اپنی بھیڑوں کی اور آنے والے برسات کے دنوں کا ذکر کرنے لگتی۔ میں نے اپنے گوپے میں بیٹھے اس کے چہرے پر غم کی پرچھائیں ڈھونڈھنے کی اس کی بے حسی کا کھوج لگانے کی کوشش کی مگر وہاں تو بے پناہ مصروفیت تھی۔ جو باپ کے جانے سے اور بڑھ گئی تھی۔

کوئی دس دنوں کے بعد نور خاں واپس آیا تو بلند خاں بھی اس کے ساتھ تھا۔ پھٹے کپڑوں میں سے مضبوط جسم جھانکتا ہوا۔ تیز اور روشن بڑی بڑی آنکھیں۔ چہرے پر عام لوگوں سے زیادہ سمجھ بوجھ کی ملائم سی تہہ۔

میں نے کہا " بلند خاں میں تمہارے بیٹے کو دیکھ کر خوش ہوا ہوں وہ بہت کم عمر اور بہادر ہے"۔

کہنے لگا " مالک میں نے زندگی سے اور کچھ نہیں پایا صرف یہ دو بیٹے ہیں مرنے والی بڑی بہادر عورت تھی، نیک دل نے اپنی یہی دو نشانیاں چھوڑی ہیں۔ دونوں نے اپنے خون میں بہادری کا ورثہ پایا ہے آج میرا جینا اور ان پر محنت کرنا سپھل ہو گیا ہے۔

مریم دودھ کا برتن لئے چبوترے پر کھڑی تھی اس نے آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس نگاہ میں احسانمندی نہ تھی نرمی نہ تھی۔ وہ نگاہ تیکھی نہ تھی، میٹھی نہ تھی، اس میں روشنی نہ تھی۔ اور نہ تیزی، بلند خاں کے بیٹے کی طرح شاید وہ بھی مجھے کچھ نہ سمجھتی تھی۔

سڑک پر سے کوئی جوان گاتا ہوا گزر رہا ہے۔ گیت کے بول بوندوں کے شور میں گونجتے ہیں۔ جانے کون منچلا ایسی سرد اور تاریک رات میں اپنا دل بہلانے کیلئے گانے کا سہارا لے کر گزر تا جا رہا ہے۔ کھلی کھڑکی میں سے بادل اندر گھس آئے ہیں اور میرے چہرے پر ان کی نمی آنسوؤں کی طرح بوندیں بن رہی ہیں۔ مگر شیر دل کب کا سو چکا ہوگا اور میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنا بل نہیں کہ اٹھنے اور پھر بیٹھنے کا متحمل ہو سکے۔ اس لئے میں گیا گوزما کے بھولے ہوئے ٹکڑے اپنے دل میں دہرا تا ہوں اور اس ساون کو یاد کرنے میں لگا ہوں جو خوشیوں اور مسرتوں کا تھا۔

اس رات گھٹن تھی اور ربت کی تپش میں کمی نہیں ہوئی تھی، نور خاں اور مریم دوسرے لوگوں کے ساتھ سوکھے ہوئے گوپے کے ڈھلوان راہ کو ٹھیک کر رہے تھے۔ میں ٹیلے پر لیٹ نہیں سکتا تھا کہ زمین میں سے گرمی کا شعلہ نکل کر بدن کو جھلس دیتا تھا۔ مریم کے ماتھے پر اس کی چنری کے ستاروں کا جھرمٹ اندھیرے میں دیئے کی روشنی کی وجہ سے شعلوں کی طرح دہک اٹھتا

اس کی سیاہ آنکھیں بڑی بڑی اور روشن لگ رہی تھیں۔ پیرن بھی کام میں لگا تھا صرف میں ٹہل رہا تھا اور ایک لمحہ کے لئے ٹھہر کر ٹکٹکی باندھ کر بلند خاں کی ہونے والی بہو کو دیکھتا۔ اس نے میری نگاہوں کی گرمی کو اپنے چہرے پر محسوس کر لیا ہوگا کیونکہ عورت میں ایک چھٹی حس ہوتی ہے جو اسے نگاہوں کی چوری سے آگاہ کرتی ہے، کہ اس نے گھوم کر اندھیرے میں دیکھا جہاں میں پیرن کی طرف بیٹھ کئے کھڑا تھا۔ اس کے کرتے پر لگے موتی اور شیشے لپک کر انگارے بن گئے اور اس ایک لمحہ وہ مجھے اتنی حسین لگی اتنی حسین لگی کہ میں اس کو حاصل کرنے کے لئے ساری دنیا اس کی قیمت میں دینے کو تیار تھا مگر مریم کیلئے ایک دنیا کم تھی بہت ہی کم۔

بستی کے لوگ اب رہ رہ کر آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جہاں بادل کا ایک آوارہ ٹکڑا تک نہ تھا اور چاند کی پیلاہٹ میں ستارے دُور دُور تک آنکھیں جھپکا رہے تھے۔ رات خاموشی اور بے حسی سے دم سادھے ہوئے تھی۔ بلبلاتے بچوں کے رونے سے جینے کا اور اس بے پناہ گھٹن کا شدید احساس ہو رہا تھا۔ لوگ چپ تھے۔ پھر اس چاندنی میں ٹیلے پر سے ہرنوں کی ایک ڈار گزری چند لمحے ٹیلے کے سرے پر ان کے مہیب لمبے سائے نیچے بھٹ پر پڑے۔ لانے کی جھاڑیوں میں چڑیوں نے بے وقت بولنا شروع کر دیا۔ ہوئے ہوئے پر مارتا ایک بگلہ سفید چاندنی کا ایک ٹکڑا سا ہمارے سروں پر سے گزر گیا گیدڑوں کے چیخنے کی آواز فضا میں شور و غل بن گئی۔ دور کسی بہت پرے کے ٹیلے پر زمین سے ملتا ہوا آسمان سفید بادل کا ایک بہت چھوٹا پھریرا لے کر دوستوں کی طرح ہماری بستی کی طرف آیا اور پھر چاندنی میں گھل گیا۔ پھر ایسے پھریروں کی قطاریں ہی آنے لگیں۔ چاندنی پھریرے لئے ہوئے بادلوں سے بھر گئی اور بکھرے ہوئے ریت کے سے لہریئے بناتے بادل چتکبرے بھر بھرے ریگستان کے ٹیلے لگنے لگے۔ ہوا دم بدم ٹھنڈی ہوتی گئی۔ پھر پرے باندھے صحرا کے اوپر سے سیاہ گھٹائیں مہیب لشکروں کی طرح گذرنے لگیں۔ چاندنی بادلوں کی اوٹ میں چھپ گئی۔ دیئے بجھ گئے اور بادل گرجنے لگے۔ اور پھر بوندیں پڑنے لگیں۔

میں نے اپنا چہرہ مریم کی آنکھوں کی سی کالی رات میں اوپر اٹھا دیا اور بوندیں محبت بھرے بوسوں کی طرح میری آنکھوں کے پپوٹوں پر ہونٹوں کے کناروں پر رخساروں پر بالوں پر

اور ریت سے اَٹے بالوں پر پڑنے لگیں۔ میں نے چاہا میں سب کا سب سجدۂ شوق بن جاؤں"۔
پانی تمام رات پڑتا رہا۔ تاریک آسمان برس پڑنے کو تیار لگتا تھا۔ بجلی رہ رہ کر چمکتی اور اس کی روشنی میں ٹیلوں پر بھاگتے مرد اور بچے دکھائی دیتے۔ خوشی کی آوازیں مل کر ساون کے بادلوں کا شکریہ ادا کرنے والے لفظوں سے بنے گیت گاتے ہوئے لوگ جیسے کسی عجیب دیوتا کی پوجا کے لیے رات کے سمے جمع ہوئے ہوں بارش دھندلی چادر کی طرح ہمارے چاروں طرف بکھرتی گئی۔ ہوا فراٹے سے چل رہی تھی اور پھڑپھڑاتے ہوئے کپڑے کی طرح پانی کی تیز دھاریں آ آ کر ہم سے لپٹتیں۔ ایسی دھوم کی برسات میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ایسی رُت جس میں ترسے ہوئے پیاسے ہونٹ آبِ حیات پیتے اور زمین کشکول کی طرح پھیل کر پانی کو اپنے دامن میں بھر لیتی۔
دن کو میں نے دیکھا تھا کہ خشک بوٹی کے ڈھیروں کو عورتیں کندھوں پر اُٹھا کر لاتیں اور گوپوں کے ساتھ ساتھ باندھ کر رکھ رہی تھیں۔ چھتوں پر بوٹی کو اس طرح رکھا جا رہا تھا گاری خاں نے پیرن کو بھی ہدایت کی تھی " دیکھنا پانی سے بچنے کے لئے اس سے اچھا اور کوئی طریقہ نہیں۔ میں بھی اپنے گھر کو بچانے کیلئے یہی کچھ کرتا ہوں۔ ایک برسات میں بے پرواہ رہا تو اندر کھڑے ہونے کی جگہ نہ تھی۔ بندوق پر بھی پانی ٹپکنے لگا تھا اور میں اپنے ہمسائے نازو خاں کے گھر رات گذارنے پر مجبور ہو گیا۔ نازو خاں خود تو بڑا شریف آدمی ہے مگر اس کی عورت بس چڑیل سمجھو۔ ایسے دیدے گھما کر بات کرتی ہے اور بچوں پہ چیختی ہے تو لگتا ہے کہ ساری بستی کو گالیاں بک رہی ہے۔ کتے تک تو اس سے خوف کھاتے ہیں۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ بھیڑوں کی رکھوالی کرنے والا ٹیپر جب وہ بچوں کو ڈانٹتی ہے تو روٹی چباتے چباتے چپکے سے کھسک جاتا ہے"۔
میں زور سے ہنس پڑا۔ گاری خاں کو اپنی بندوق کے علاوہ ہر مؤنث سے چڑ ہے۔
بستی کی لڑکیاں اسے دیکھ کر اپنے ماتھے ڈھانپ لیتی ہیں اور تیز چلنے لگتی ہیں۔ اس کے گوپے کے قریب سے نکلتے ہوئے ڈرتی ہیں کہ دیوانہ ہے کسی دن بندوق سے سر نہ اُڑا دے۔ صرف مریم بے خطر اس سے باتیں کرتی اور جب وہ ہمیں ملنے آتا تو کہتی " چاچا گاری خاں سناؤ کوئی شکار مارا، کوئی شیر کوئی ہرنی"۔ شاید اسی لئے گاری خاں کہتا تھا کہ وہ شیرنی ہے۔

پیرن نے بارش سے بچنے کے لئے کوئی زیادہ بندوبست نہ کیا تھا۔ کہتا۔ سائیں کب سے ہم یہاں ہیں آسمان ڈھلے دیدے کی طرح روز صاف اور دھوپ سے تپتا ہوا ہوتا ہے۔ بھلا برسات بھی کیا ایسی لگے گی کہ یہ مضبوط دوہری چھت والا گوپا ٹپکنے لگے۔ پانی تو ویسے ہی اللہ کی رحمت ہے اور پھر بستی کے لوگ ایسے بندوبست کر رہے ہیں جیسے کوئی آفت آنے والی ہو۔ بس ریت بھیگ جائے گی اور کیا ہوگا۔"

جب عبادت کرتے لوگوں اور خوشی سے منمناتی بھیڑوں، زور زور سے بھونکتے کتوں کو سنتا اور ساون کے بادلوں میں بجلی کے پھیرے سے روشن ہوتے ٹیلوں کو دیکھتا میں پیرن سے پہلے اندر آیا تو ایک کونے میں لکڑی کے شکنجے میں جلتا دیا سن سن کی آواز سے بجھتا لگتا تھا اور پانی کے قطرے چھت میں لٹکتے تاروں والے کپڑے پر کڑھے ہوئے ستاروں کے برابر موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ چیزوں کو سمیٹتے اور رنگ محل کے در و دیوار کو ننگا کرتے کرتے فرش گیلا ہو گیا تھا۔ سامان والے گوپے پر گاری خاں نے بوٹی ڈالی تھی اور وہ پہلے ہی بھرا ہوا اور مضبوط تھا مگر اس میں دو آدمیوں کی جگہ نہیں ہو سکتی تھی، پیرن نور خاں کے گھر میرے لئے پناہ کا پوچھنے گیا۔ سردار گھر پر نہیں تھا۔ وہ میٹی کے زخمی ہونے کے بعد سے بہت کم مجھے ملا تھا۔ اکثر رکھنی میں مرشلا وہ آتا تو اپنے سو کاموں سے اسے اتنی فرصت نہ ہوتی کہ سوائے سلام دعا کے مجھ سے کوئی اور بات کر سکے۔ بلند خاں کا چھوٹا بیٹا باقی زخمیوں کے ساتھ پوسٹ پر تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں اتھاہ نفرت دیکھ کر میں نے کبھی پوسٹ پر جا کر اسے پوچھنے اس سے بات کرنے کی جراءت نہیں کی تھی۔

سردار کی بیوی نے کہا "سائیں رات یہاں ہمارے ہاں گزار لیں صبح تک اللہ کرے گا کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا۔"

جب میں پیرن کے ساتھ اپنے گوپے سے نکل کر نور خاں کے ہاں جا رہا تھا تو بجلی چمکی اور بادلوں کی مہیب گرج سنائی دی ہر یہ سا تڑپ کر بیٹا اور میلوں تک ٹیلے اور بھٹ گوپے اور جانوروں کے گلوں پر نور روشن ہوا۔ اس روشنی میں میں نے پانی کو بھاگتے اور گلیوں میں سے گذر کر ڈھلوان راہ سے گوپے کی طرف جاتے دیکھا۔ بارش کی چادر موتیوں کی دھند کی طرح بستی کے گرد لپٹی ہوئی تھی۔

میں اور پیرن دم بخود رہ گئے کیونکہ ہم میں سے کسی کا حوصلہ نہ ہوا کہ سانس بھی زور سے لے یا بول سکے۔

مریم برتنوں کے بوروں دودھ کے تھیلوں اور اناج کی بوریوں کے ڈھیر پر چھت کے قریب لیٹی ہوئی تھی۔ صرف اس کے پاؤں گھگھرے کی گوٹ میں سے دکھائی دے رہے تھے اور یہ پاؤں دیئے کی ٹمٹماتی لو میں اتنے دودھیا اور روشن لگے کہ بے اختیار میرا جی چاہا میں ان کو آنکھوں سے لگالوں۔ نور خاں کی بیوی نے اسے آواز دے کر کہا کہ "نیچے اتر کر سائیں کے لئے ایک اور کمبل بچھا دو" تو وہ ہلی تک نہیں۔

سردار کی بیوی کہنے لگی "شاید سو گئی ہوگی، عجیب لڑکی ہے ابھی پیرن کے آنے سے پہلے تک تو جاگ رہی تھی شاید اسے شرم آرہی ہوگی"۔ اور خود ہی تہہ کئے کمبل کو کھولنے لگی۔

برتنوں کے بوروں پر کروٹ بدلنے کی وجہ سے کھڑکھڑ ہوئی اور دوسرے لمحہ کو دکر اتری اور کمبل کا دوہرا پکڑ کر زمین پر پھیلا دیا۔ پھر ٹھلیا میں سے انڈیل کر مٹی کی ننھی سی ٹھلیا میں سے پانی پیا نہیں۔ گلہری کی تیزی سے اونچے بوروں پر چڑھ کر اسی طرح لیٹ گئی اس کے پاؤں اگر چھپ نہ گئے ہوتے تو میں سوچتا وہ وہاں سے ہلی تک نہیں دیئے کی کمزور جلتی ہوئی لو میں اُسکے گُرتے پر گلے اور سینے پر ٹکے موتی چمکتے اور سانس لینے معلوم دیتے تھے بجلی کا ایک کوندا تھا کہ لپکا اور میری آنکھوں کو چندھیا کر چھپ گیا۔

ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔ نامانوس جگہ میں عجیب طرح کی ملی جلی خوشبوئیں میرے گرد گھومتی رہیں۔ مجھ سے چھپی ہوئی مریم کے پاؤں سے نکلتی روشنی کی شعاعوں نے ہر شے کو رنگ دیا تھا۔ خشک دودھ کی میٹھی سی باس اناج کی سوکھی سی بو۔ میرے قریب ہی کسی تھیلے میں رکھے گڑ کی مٹھاس کا احساس سکھائے ہوئے پھوگ کے پھولوں کی ہوا باہر ریت پر پڑتی بارش اور بہتے پانی پر سے آتی ہوئی آوازوں سے بھری گوپے کے خوشبودار گھاس کے بنے پٹ کی سوگند۔ مجھے محسوس ہوا میں کسی مندر میں ہوں پردوں کے پیچھے مورتی ہے۔ مردنگم بجاتے پجاری باہر کھڑے ہیں اور بھجن کے بول کوئی بار بار دہرا رہا ہے ؎ نت جاگن میریاں اکھیاں۔

اپنے دوست سُرندر سنگھ کے گاؤں میں گذاری راتیں مجھے یاد آرہی تھیں۔ ساری رات کوئلیں کو ہو کو ہو بولتیں۔ آموں کے باغوں سے گھرے ماّن میں کھیتوں کے کنارے شہتوت کی میٹھی

خوشبو سے مدہوش مکھیاں ہوا کے جھونکوں سے درخت کے گرد جھولتی اور لہراتی ہوئی سیٹیاں بجاتی مکڑیاں فضا کو اپنے پَروں کی چمک اور رنگت سے بھر دیتیں۔ شاخوں میں پھدکتی چڑیاں ڈال ڈال شور مچاتیں اور ہوا نمناک سی سوگوار کنواری کی طرح ہولے ہولے قدم دھرتی چلتی رہتی۔

سریندر سنگھ کی بستی ہوا سے بھرے گاؤں کی یاد مجھے رنہال بستی میں اس رات آئی جب صحرا کا جادو میرے رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا۔ یہ ویرانہ صدہا صداؤں سے آباد تھا۔ آج سے پہلے جو آنکھیں ہریالی اور ٹھنڈے کنجوں اور آسانیوں کی عادی تھیں اب ریت میں جوانی خوبصورتی اور زندگی ڈھونڈ رہی تھیں۔

ایسی ہی گذری بیتی باتیں سوچتے سوچتے جانے کب مجھے نیند آگئی۔

رات کی رات میں خشک جھاڑیاں تازہ اور نکھر گئی تھیں۔ پانی سارا دن پڑتا رہا۔ بارش کبھی دُھند بن کر چھا جاتی اور کبھی موتی بن کر برسنے لگتی۔ میں اور پیرآں گھومنے کے لئے باہر نکلے تو سردار کی بیوی نے پیرآں کو پکار کر کہا۔

"ایک دم رکو میں بُسریاں پکالوں، غریبوں کا کھانا مالک نے کبھی کاہے کھایا ہوگا؟"

ہم واپس آگئے میں کھلے دروازے کے سامنے لکڑی کے ننگے تخت پر بیٹھ گیا چھپر کے نیچے مریم لکڑیوں کے انگارے بنا رہی تھی۔ دھوئیں سے اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرہ تمتمایا ہوا تھا بھیگے کپڑوں میں اس کے جسم کے دلآویز خطوط جادو سا کرتے لگتے تھے۔ کرتے کے دامن پر موتیوں کا سفیدہ سرخی کے مقابلے میں بہت گہرا تھا۔ چنری کے بھیگے ہوئے ستارے ماتھے پر چپکے ہوئے تھے۔

سُبل نے جو رنہال کی سب سے شوخ لڑکی تھی آگ دہکاتی ہوئی مریم کو کہنی سے ٹہوکا دیا اور جب سردار کی بیوی دو روٹیوں کے درمیان گڑ رکھ رہی تھی تو سُبل نے آنکھ بچا کر ایسے گوپے کی طرف اشارہ کیا میں اوٹ میں ہوگیا۔ روزن میں سے مریم کا چہرہ ہی میرے سامنے تھا اس نے بڑی نفرت سے ناک چڑھا کر دونوں ہاتھوں سے یوں اشارہ کیا گویا ہم کو دور کرنا چاہتی ہو اور پھر زور زور سے لانے کی لکڑیوں کو پھونکنے لگی۔

بُسری کا مزہ میرے منہ میں ریت کی طرح کرکرا تھا۔ میں نے آئینہ نکال کر بہت

غور سے اپنی شکل دیکھی۔ ریہال بستی میری نگاہوں کو ویران اور بے آباد سی لگی میں نے سوچا اب میں پوسٹ پر ہی رہوں گا چاہے کچھ بھی ہو۔

زخمی قیدی بڑی اداسی سے پتھروں کی قطار پر بیٹھے تھے۔ جب تک ان کے زخم بھر نہ لگیں انھیں بڑے شہر بھیجا نہیں جا سکتا تھا۔ ہمارا افسر بہت چوکس رہتا اور رات میں کئی دفعہ سپاہیوں کی ڈیوٹیاں بدلتیں۔

اس رات میں بستی کی طرف نہیں لوٹا۔ بارش تھم کر نکھری ہوئی چاندنی ڈھلے ہوئے ریت کے ٹیلوں پر پھیلی جیسے نئی بیاہی اپنے روپہلی جوڑے کو پہنے اتراتی ہوئی گھومنے نکلی ہو۔

بادِ شمال کے نرم نرم جھونکے بادلوں کو لاتے رہے کبھی کبھار سورج بھی اوٹ سے پرانے دوست کی طرح مسکراتا ہوا دکھائی دے جاتا۔ میگھ ملہار سے روہی آباد ہوگئی۔ صحرا سبزے اور گھاس پھولوں اور خوشبوؤں سے پُر رونق ہوگیا۔ لائیاں لپکنے اور چمکنے لگیں۔ پھوگ پر پھول تھے۔ پھاگ سہاگ کا موسم آگیا۔ کبھی پورب سے ٹھنڈی ہوا آتی اور بادلوں کو دھکیل کر اپنی طرف لے جاتی۔ سیاہ جھکی ہوئی گھٹائیں۔ سفید بر سے ہوئے ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اُڑتے ہوئے جھنڈے اڑاتے بادلوں کو دھکیل کر پھر شمالی ہوا اپنی طرف لے جاتی اور گھپ اندھیرے میں بجلی کے لہریئے ان لشکروں کا بندوبست کرتے تیز تیز اِدھر سے اُدھر چلتے پھرتے۔

جنڈی میں کانٹوں کے ساتھ پتے پھولوں سے بھی نرم و نازک لگ رہے تھے۔ کھپ کے سفید بوٹے پر جوبن تھا۔ ہر شے زندہ ہو رہی تھی۔ لوگ خوش خوش پھر رہے تھے۔ نہائے ہوئے جانوروں کے بدن چمک رہے تھے۔

بہت دِنوں بعد بارش تھمی اور دھنک نکل آئی۔ ساتوں رنگوں کی پینگ آسمان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لٹکی ہوئی تھی صحرا کی دلہن کے جھولنے کیلئے اس کے سسرال سے تحفہ آیا تھا۔

نور خاں کی بیوی آنگن میں ہمسایوں سے باتیں کر رہی تھی "یہ بارش ہمیں تو آباد کر گئی پر علیستی نے زخم بھرنے میں ابھی بہت دن لگ جائیں گے، میں اُسے دیکھ کر آئی ہوں ظالموں نے یوں تاک کر ٹانگ میں گولی ماری ہے۔ مریم بے چاری، اس کی منگیاں سہیلیاں

سب خوش پھریں گی اور یہ اُداس رہے گی۔ اگر اس دن آندھی نہ آتی تو اب تک اپنے گھر کی ہو گئی ہوتی میرے سر سے بوجھ اتر چکا ہوتا۔

میں نے دل کو سمجھایا تھا زندگی میں ہر عورت تمہاری طرف توجہ نہیں دے سکتی اسلئے مریم کی پرواہ کیوں کرتے ہو۔ اور اب آبادی تھی۔ اس شادمانی اور دوبارہ جی کر اُٹھنے کی خوشی میں جب بوٹا بوٹا خوش ہو رہا تھا تو میں کیوں خوش نہ ہوتا۔ پوسٹ پر سپاہی خوش تھے اور جشن منانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ میں بھی بستی لوٹ آیا۔

ساری دوپہر میں گوپے میں لیٹا باہر ہونے والی تیاریوں کو دیکھتا رہا۔ فراٹے بھرتی ہوئی بھیگی ہوئی خوشبودار ہوا کے لئے چل رہی تھی۔ زمین اور نئے سبزے اور بوٹیوں کی باس جو پانی کے گوپے پر سے آنے کی وجہ سے بھیگی ہوئی بہت خوشگوار تھی۔

بلند خاں کا چھوٹا بیٹا نئی رُت کی مبارکباد دینے سردار کے ساتھ ہی آیا تھا۔ اور اب اُسی کے ساتھ ٹیلوں پر بھاگتا پھرتا تھا۔ وہ جگہ جگہ ہونے والی خوشی کے لئے بندوبست کرتے پھرتے تھے۔ صبح سے نقارے بج رہے تھے اور عید کا سا سماں تھا۔

میلے کی شام بڑی حسین اور رنگین تھی۔ عورتوں نے اپنے گڑھے ہوئے اور پرانے زیوروں کو نکالکر دھویا تھا کبھی کبھار شادی بیاہ پر پہننے والے جوڑے پہنے تھے۔ اور ڈھلی شام سے ہی بجنے بننے میں لگی تھیں۔

نور خاں کی بیوی نے مینڈھیاں کی تھیں اور انہیں موم سے چمکایا تھا۔ آنکھوں میں کاجل کی دھار کٹاری کی طرح بنی تھی۔ ماتھے پر سُرخ بندیا سجائی، آنکھوں کے کونوں میں سُرخ ٹیکے لگائے اور دُم دار کاجل کی نوک کو سُرخی میں ڈبویا۔

گلی جہاں ختم ہوتی ہے وہاں سے آگے ٹیلہ تھا اور ٹیلے کے سرے سے گوپے کی ڈھلوان شروع ہوتی تھی جس پر پھولوں والی جھاڑیاں تھیں۔ ٹیلے کے دوسری طرف بھٹ ہے جس کا رخ بھی اندھے ہو جانے والے تختے کی طرح آہستہ آہستہ ڈھلوان سے ہوتا گوپے کی طرف جاتا ہے اور اسی ٹیلے پر سیدھی جگہ میں ریہال بستی کی برسات کا میلہ لگنے والا تھا۔

دوسری بستیوں سے آئی ہوئی عورتیں سیاہ آنکھوں کو کاجل کی دھاریں سجائے بڑے بڑے گھاگروں پر موتیوں سے بنی اور شیشوں سے مڑھی کرتیاں پہنے ستاروں والی چنریاں سر سے پشت پر پھینکے پھر رہی تھیں۔ ان کے گلے میں گٹائے اور چندن ہار سج سج ہلکورے لے رہے تھے۔ ناک میں تو لے اور پو پے سینٹ جیسوں میں گندھے بینے چاندی کی پتریوں میں پروئے ہوئے۔ جب ڈھلتی دھوپ بینے میں اپنا عکس ڈالتی تو ہر طرف چکا چوند ہو جاتی ان پر نظریں نہیں ٹکتی تھیں۔ نئی دلہنوں نے چاندی کی چوڑیاں کہنیوں تک بھری ہوئی تھیں، بازدؤں پہ بہونٹے جن کے رنگین دھاگوں کے پھندنے چولے کے دامن کو چھوتے ہوئے۔ بالیوں کے وزن سے کان لٹکتے ہوئے، نئی چاندی کی تختیوں سے گلے بھرے ہوئے، ٹخنوں میں پیر اگرے کہ چلتے میں چھن چھن کی صدا آتی، پاؤں کی انگلیوں میں چھبہ کہ اس کی زنجیر مہندی کے مقابلے میں جیسے برف اور سرخی کو ملا کر رکھ دیا جائے۔

بھٹ پر دکانیں سجی تھیں جنہیں بستی کے جوان اپنے دل کی خوشی اور نفع کے خیال سے چلا رہے تھے۔ رنگ اور مستی، چمک اور خوبصورتی کا ایک طوفان تھا کہ ٹولیاں بنا کر جوانوں اور بڈھوں کے ہوش گم کئے دیتا تھا۔ دکاندار مستی لگے ہونٹوں اور بندیا کے نیچے چمکتے رخساروں کو دیکھتے دیکھتے بھاؤ چکاتے اور خریدار سے بھی کم دام پر ایک نظر کے بدلے شے بیچ دیتے۔

ہمارے وہ سپاہی جنہیں چھٹی مل سکی تھی میلہ دیکھنے آئے تھے اور اب گھوم رہے تھے۔

کنواری لڑکیاں سادہ کپڑوں میں دلفریب لگتی تھیں۔ اور جوانوں کے ٹولوں سے پرے پرے اپنی ہنسی اور باتوں میں لگی تھیں۔ پچھلی رت کی بیاہی ہوئی سہیلیاں اپنے ننھے بچوں کو اٹھائے شرمائی شرمائی سی دولہا کی باتیں کرتیں۔ اس میلہ میں اونٹوں سے لے کر لڑکیوں تک کے سودے ہو رہے تھے۔ لڑکیاں جو باپ کی جائیداد ہوتی ہیں جنہیں خریدا جا سکتا ہے، بیویاں جنہیں بیچا جا سکتا ہے، کنواریاں جن کی بولی ہوتی ہے، بھائی جو بہن کے بدلے دلہن مانگتے ہیں۔ روہی کا سارا حسن سمٹ کر رنہال کے اس میلہ میں رنگوں کے ناٹک کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ رنہال رنگ بھوم تھی کہ اس پر لحظہ لحظہ منظر بدلتا تھا۔ اور لڑکیوں کی قسمتوں کے فیصلے ہو رہے تھے۔

میں نے سوچا میں ان سب سے بڑھ کر بولی دے سکتا ہوں کیوں نہ میں بھی مریم کے باپ سے کہوں۔ عیسیٰ بیمار تھا اس کی ٹانگ میں ناسور ہو گیا تھا۔ بلند خاں نے اپنی پونجی بیچ دی تھی۔

غریب کے پاس دولت ہی کتنی ہوتی ہے۔ مال مویشی کی دیکھ بھال کرنے کے لئے عیسیٰ کا بھائی عمر خاں ابھی کم عمر تھا۔

اس گھڑی میں نے مریم کو دیکھا وہ گلی کے سرے پر کھڑی تھی اور سنبل کے ساتھ ہنستی ہوئی آنے جانے والوں کو مذاق کرتی اور تراوِندے بیچ کھا رہی تھی۔ اس نے اپنے جہیز کی چنری سر پر رکھی تھی اس کے ساتھ اس کی پرانی سہیلیاں تھیں۔ انہوں نے گلی کا راستہ روک رکھا تھا اور جب جی چاہتا گانے لگتیں تھیں۔

نور خاں کو میں نے بتیوں کی روشنی سے اندھیرے میں آتے ہوئے پکڑ لیا۔

"مریم مجھے دیتے ہو! بولو جو کہو گے دے دوں گا۔ جو مانگو گے وہی پاؤ گے۔ تمہاری بیٹی ہر قیمت پر سستی ہے۔"

نور خاں میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے احاطے میں لے آیا۔

ہمارے سامنے اور ہم سے اونچے ٹیلے پر میلہ اور ناچ اپنی پوری رونق پر تھا۔ چاند کی روشنی بہتی ہوئی ہوا کے ساتھ ساتھ گھٹتی اور بڑھتی لگتی تھی۔ جوانوں کی ٹولیاں شراب پی کر بہک رہی تھیں کنواری لڑکیاں ڈری ڈری اپنی ساتھ والی سہیلیوں کے ساتھ کھڑی گیت گا رہی تھیں۔ نقارے زور زور سے بج رہے تھے۔

نور خاں نے کہا "سائیں کل یہ میلہ ختم ہو جائے۔ یہ ٹیلہ بے آباد ہو جائے گا۔ ہم لوگ زندگی کے پرانے راستے پر لوٹ آئیں گے۔ آپ نے آج بہت بڑھیا شراب پی ہو گی۔ اور جب آدمی شراب پیئے اور رات چاندنی ہو، ہوا ٹھنڈی ہو اور ڈھول مسلسل بج رہا ہو تو اسے خراب چیزیں بھی اچھی دکھائی دینے لگتی ہیں۔ آج تو بدصورت سے بدصورت عورت پر بھی جی پڑا ہے۔ میری مریم کو کیا آپ نے آج ہی دیکھا ہے؟ مہینوں سے آپ یہاں رہ رہے ہیں۔

میں خاموشی سے میلے کی رونق کو دیکھتا رہا۔ میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

نور خاں پھر کہنے لگا "سائیں آج امرایا یہاں ہوتا تو میرے لئے آپ کے سوال کا جواب دینا مشکل نہ ہوتا مگر وہ یہاں نہیں ہے اور اس نے اپنی بہن کے دماغ میں یہ ڈال دیا ہے کہ کوئی اسے بیچ نہیں سکتا۔ ہمارا یہ رواج نہیں کہ ہم بیٹی کا سودا کرتے ہوئے اس کی صلاح بھی

ہیں۔ پھر عیسیٰ خاں بھی بیمار ہے اور جراح کہتا ہے کہ اسکی زخمی ٹانگ اگر کاٹ دی جائے تو شاید وہ بچ جائے گا۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ ایک لنگڑے آدمی کے ساتھ میری بچی کی زندگی خراب ہو مگر سائیں آپ تو بادشاہ ہیں آپ مریم کا کیا کریں گے۔ وہ ایک گنوار بستی کی گنوار لڑکی ہے جب آپ کا دل یہاں سے بھر جائے گا اور آپ چلے جائیں گے تو محلوں کی رونقیں وہاں کی خوبصورتی آپ کے ذہن سے اس کا خیال بھی مٹا دے گی۔ وقتی طور پر آپ مریم کو چاہتے ہیں۔"

وہ چپ ہو گیا۔

میں نے کہا "نور خاں میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔ میں مریم کو چاہتا ہوں اگر تم اپنی لڑکی مجھے دے دو تو میں ساری عمر اس سے محبت کرتے رہنے کا وعدہ کرتا ہوں۔"

نور خاں نے کہا "سائیں ہمارے یہاں عورت سے محبت کرنا اور ساری عمر محبت کرنا کوئی ضروری نہیں۔ اسے آپ کو دیتے ہیں میں یہ شرط نہیں رکھتا۔ عورت تو خرید و فروخت کی ایک شے ہے۔ چاہے ہم بچیوں کو کتنے پیار سے پالیں انہیں جگر کے ٹکڑوں سے زیادہ عزیز رکھیں پر آخر تو انہیں پرائے گھر جانا ہوتا ہے وہاں اگر ان کا نصیب اچھا ہوتا ہے تو ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا ہے۔ عورتیں بھی خاموش گایوں کی طرح اس سے زیادہ کچھ نہیں مانگتیں۔

میں نے کہا "نور خاں میں مریم کو زندگی کی ہر شے سے زیادہ عزیز رکھوں گا۔ امرایا کو تم منا لینا اور جو تم چاہو گے میں اس کے بدلے میں تم کو یہی دوں گا۔ بولو منظور ہے۔"

نور خاں نے سر جھکا لیا اور کہا "سائیں آپ مانگیں اور میں کسی شے سے انکار کر سکوں آپ میرے مہمان ہی نہیں میرے مالک بھی ہیں۔"

میں نور خاں کو وہیں بیٹھا چھوڑ کر سیٹی بجاتا ہوا احاطے کی باڑ پھاند کر ٹیلے کی طرف بھاگا گلی کے نکڑ پر میں نے مریم اور اس کی ایک اور سہیلی کو عمر خاں کے ساتھ باتیں کرتے پایا۔ وہ روشنی میں تھیں اور میں چاند کے جھک جانے اور گوپیوں کی قطار کی وجہ سے اندھیرے میں تھا۔

عمر خاں کہہ رہا تھا "بھابی تم اگر بھائی کو دیکھو تو بس رو ہی پڑو وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے تمہیں یاد کرتا ہے۔ مجھ سے کہتا تھا مریم کو کہنا اگر اس صبح تم غصے سے چلی نہ جاتیں تو شاید میں زخمی نہ ہوتا۔"

مریم سسکیاں لے کر رو رہی تھی۔ اس کی سہیلی اسے سنبھال رہی تھی۔

میں اُلٹے قدموں اسی طرح اندھیرے کا سہارا لئے کرگوبوں کی اوٹ میں ہوتا ہوا دوسری طرف سے ٹیلے پر نکلا۔ میری خوشی میں گھلا ہوا زہر میری رگوں میں پھٹنے والی آگ کی طرح تھا۔ روشنی میں مجھے رونق اُجڑی اجڑی اور میلہ پھیکا پھیکا سا لگا۔

آدھی رات گئے پیچھے ناچ شروع ہوا۔ ادھیڑ عمر کی عورتیں اور مرد ناچتے اور جھومر کے چکروں میں گھومتے رہے پھر لڑکیوں اور جوان ہوتے ہوئے لڑکوں کی باری آئی۔

پیرن میں اور پوسٹ سے آئے ہوئے سپاہی دائرہ بنا کر کھڑے تھے اور ناچ دیکھ رہے تھے اور تالیاں مارتے جاتے تھے۔

ایسی رُت میں جب مستانی ہوا چل رہی ہو جوان لڑکوں کا بیکار کھڑے رہنا بدشگونی ہے۔ گاری خاں نے مجھے ناچنے والی لڑکیوں کے دائرے میں دھکیل دیا۔ دائیں بائیں گھومنے اور تال پر سر مارتے ہوئے جب ہاتھوں پر ہاتھ مارنے کی باری آئی تو میرے سامنے مریم تھی وہ اور لڑکیوں کی طرح سیدھا میری آنکھوں میں نہیں دیکھ رہی تھی اور بے حد اُداس لگتی تھی۔ لوگ زور زور سے گاتے اور ہنستے ہوئے گھوم رہے تھے، میں نے باتیں شروع کیں۔

میں نے کہا تم جی لگا کر کیوں نہیں ناچتیں؟

کہنے لگی "تمہیں خود ناچنا نہیں آتا، باتیں مت کرو تال پر ہاتھ اور پیر نہیں مار سکو گے۔"

تھوڑی دیر بعد میں نے پھر کہا "تم مجھ سے خفا کیوں ہو؟"

کہنے لگی "تم میرے کون ہوتے ہو کہ میں تم سے خفا ہوں؟"

میں نے کہا "تمہارے باپ نے تمہاری منگنی مجھ سے کر دی ہے؟"

اس نے بڑی گہری نظروں سے جن میں انتہائی بے یقینی تھی سیدھا میری آنکھوں میں دیکھا اور پھر خاموشی سے میرے ساتھ جھومر کے چکروں میں شریک ہو گئی۔

یہ مریم کی اور میری پہلی گفتگو تھی۔

اس کی شانِ دلربائی اور اس کی اداؤں نے مجھے دیوانہ بنا دیا۔ اس رات ناچ میں وہ اپنا بہترین کوڑیوں اور موتیوں سے بھرے کام کا کرتہ اور چالیس گز کا گھاگرا پہن کر آئی تھی۔

اس نے جہیز کے لئے رکھے کپڑوں میں سے بھاری ستاروں اور سونے کے رنگ کے بیلے نگوں کے کناروں والی چنری سر پر اوڑھی تھی اور موم پھیر کر بالوں کو جمایا تھا۔ اس رات اگر کوئی فرشتہ بھی ہوتا تو اس کے دیوں کی لو سے زیادہ چمکتے چہرے پر فدا ہو جاتا۔ اس کی وہ نگاہ جس میں بے یقینی تھی میرے دل کے پار اتر گئی۔ میں اسے اپنے آپ کا یقین دلانا چاہتا تھا میں اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔

پھاگ سہاگ کا موسم آگیا تھا کھمیاں اکٹھی کرنے کے لئے جب مریم اور اس کی ماں جانے لگیں تو میں نے نور خاں سے کہا میں بھی ان کے ساتھ جاؤں گا۔

ٹھنڈی ہوا کی بھیگی ریت پاؤں کے نیچے ریشم کی طرح نرم لگتی تھی دور دور تک ٹیلے سفید ہو رہے تھے لڑکیاں پچھلے سال کی کھمیاں بے جھکی ہوئی کام میں لگی تھیں۔ نرم دھوپ میں ان کے جسم کے خطوط اور ان کے لہنگوں کے کنارے بڑے خوبصورت لگتے تھے۔ میں نور خاں کی بیوی کے ساتھ ساتھ تھا پھر باتیں کرتے ہوئے وہ دوسری عورتوں کے پاس رک گئی میں ایک ٹیلے کی اوٹ میں ہو کر مریم کی طرف آگیا اس نے میری طرف گردن موڑ کر دیکھا اور کہنے لگی۔ تم ایسا کام کیوں کرتے ہو جس میں نہ تمہارا جی ہے اور نہ مرضی۔

میں نے کہا "مریم تم میرے ساتھ شادی کرنے کیلئے تیار ہو کہ نہیں۔ تمہارے چہرے سے لگتا ہے کہ تم خوش نہیں۔"

مریم نے کہا: "تمہیں ناپسند کرنے کی تو کوئی وجہ نہیں، اور تم مجھے اچھے بھی نہیں لگتے۔"

وہ پھر بڑے دھیان سے کام میں لگ گئی۔

دوپہر کو دھوپ بدن پر چیونٹیوں کی طرح رینگنے لگی تو ہم لوگ ایک ٹیلے کے سائے میں آگئے سردار کی بیوی نے رومال میں بندھی میٹھی روٹیاں نکالیں اور لسی کا دونا بھر کر مجھے بھی دیا۔ لسی میٹھی اور مٹی کے برتن میں ہونے کی وجہ سے ٹھنڈی تھی۔ سبل بھی آکر ہمارے ساتھ شامل ہو گئی دونوں لڑکیاں اب میری موجودگی میں ایک، دوسری سے بہت کم بات کرتیں۔ مریم کے چہرے سے ناخوشی کا بھی اظہار نہ ہوتا اور نہ ہی خوشی کا۔ اس کے اور میرے درمیان فاصلے کم نہیں ہو سکے تھے۔ سبل نے کہا "مریم ذرا ادھر تک چلتی ہو نوردن کو ملنے آئیں گے کئی دنوں سے

اسے نہیں دیکھا، سُنا ہے اس کا بچہ بیمار ہے۔

وہ لپک کر اُٹھی اور سنبل کے اٹھنے سے پہلے ہی تیر کی طرح اس موڑ کی طرف چلنے لگی۔ اس کا سر اُٹھا ہوا اور کندھوں پر بڑا خوبصورت لگتا تھا۔ چاندی کی بالیوں سے بھرے کان اور سیاہ بالوں کی مینڈھیاں ماتھے کو دلفریب بنا رہی تھیں۔ وہ سراپا حسن تھی اور اپنے حسن سے واقف بھی۔ جب تک وہ میرے پاس تھی میں ارد گرد سے بے نیاز تھا۔ اور جب وہ دوسرے ٹیلے کی طرف چلی گئی تو میں نے دیکھا کہ جھاڑیاں پھولوں سے بھری تھیں۔ جنڈ اور کریہہ کے سبز پتوں میں سے پانی چھلکتا لگتا تھا۔ لائی اور پھوگ پر بہار تھی۔ چھوٹی چھوٹی لالیاں پودوں کے جھنڈ میں اچھل رہی تھیں۔ کا دینیاں چہک رہی تھیں۔ لگتا تھا بوٹے بوٹے سے سینکڑوں تانیں اُٹھ رہی تھیں۔ راحت اور خوشی سے زمین تا آسمان ہر شے پر نیا رنگ تھا۔ ٹیلوں پر ذرا ذرا سی ہریالی پھوٹ رہی تھی۔ بھیڑیں طمانیت اور مسرت سے چرتے چرتے گردن اٹھا کر ممیاتیں اور پھر سر ڈال دیتیں۔ ہر شے ربِ جلیل کی بنائی اس بے پناہ خوبصورتی اور خوشی کا شکریہ ادا کرتی لگتی تھی جھاڑیوں کے جھنڈ میں کوبے میں بھرا پانی ہوا کی لہروں کے ساتھ ساتھ لہریں مار رہا تھا اور ٹیلوں کا سایہ ٹھنڈا سکون بخش تھا۔ مردہ زمین آباد ہو گئی تھی۔ ہو سکتا ہے میرا دل بھی آباد ہو جائے ــ مگر مریم کی بے حسی اور بے پروائی دیکھ کر یہ خواب بڑا کٹھن نظر آتا تھا۔

مریم اب رات دن کام میں لگی رہتی۔ گایوں نے دودھ زیادہ دینا شروع کر دیا تھا۔ اور دن ڈھلے سے وہ دودھ بلونا شروع کرتی تو شام کو جا کر فارغ ہوتی۔ رات کو دونوں مل کر آسے گرم کرتیں کبھی ماں دودھ گرم کرتی اور مریم ایندھن میں سے لانے کے ڈھیر گھسیٹ کر لاتی اور انہیں گڑھے میں ڈال کر آگ لگاتی کہ روٹی پکائے۔ نتھری اور ڈھلی ہوئی شام نیلے دھوئیں سے بھر جاتی بستی آوازوں سے اور ٹھکانوں پر آتے جانوروں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں سے نکلتے نغموں سے بھر جاتی۔ شام کو جھاڑیوں کے جھنڈ میں چڑیاں شور مچاتیں اور بسیرا کرتے ہوئے کوئے اتنے زور سے بولتے۔ پھر بھاڑوں میں سے بھیڑوں کے ممیانے کتوں کے بھونکنے اور گایوں کے ڈکرانے کی صدائیں ہوتے ہوتے خاموش ہو جاتیں۔ کنواریاں کاموں سے نمٹ کر چاندنی میں بھٹ پر اکٹھی ہوتیں۔ اور مل کر لمبی تانوں والے برہا کے گیت گاتیں جن میں کسی

فرضی محبوب سے بچھڑنے اور ملنے کا رنج اور خوشی ہوتی۔

گاڑی خاں اب سارا دن جنگلوں میں مارا مارا پھرتا۔ شام کو کبھی واپس آتا اور کبھی رات گئے شراب کے نشے میں دھت احاطے میں لڑکھڑاتا ہوا پیرن کو آوازیں دیتا گھستا۔ وہ اب مجھ سے کبھی مریم کی بات نہ کرتا۔ میں نے ایک آدھ بار اس سے بات کرنے اور اپنی خوشی میں اسے شریک کرنے کی کوشش کی تو اس نے کہا۔

"سائیں، دنیا میں سب سے مقدس شے بیوی ہے۔ آپ اس سے نکاح کرنے والے ہیں میں نہیں چاہتا میں اب اس کا نام اپنے ناپاک ہونٹوں پر لاؤں۔ وہ تو اب بڑے قیمتی راز کی طرح آپ کی ہونے والی ہے۔"

اس کے بعد کبھی میں نے اس سے مریم کی بات نہیں کی۔ میں پیرن سے بھی یہ بات نہیں کر سکتا تھا مگر اندر سے میرا دل بے یقینی کا شکار ہوتا رہتا میں چاہتا تھا کوئی ایسا ہو جس سے میں اپنی اس بے یقینی کا ذکر کر سکوں۔ کسی سے صلاح لے سکوں۔ کسی کو اپنی اس خوش قسمتی کے راز میں شریک کر سکوں مگر اس پرائی بستی میں کوئی بھی میرا نہ تھا۔ دیوانہ کرنے والے اس موسم میں جب کہ ہر شے پر بہار آئی ہوئی تھی میرا دل اندر ہی اندر دھنسنے والے ساحل کی طرح تھا بہت سوچ بچار کے بعد میں نے شبل سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

بلند خاں بہت گھبرایا ہوا رکھنی سے اپنی اونٹنی پر سوار آیا تھا۔ احاطے کے پاس اس نے نور خاں کو پکارا میری آنکھ ابھی لگی ہی تھی۔ روزنوں میں سے پھولوں کی خوشبو سے بھری ہوا سیٹیاں بجاتی آ جا رہی تھی اور میں ایک بہت سہانا خواب دیکھ رہا تھا۔ خواب جس میں مریم نے زعفرانی رنگ کا کیسری جوڑا پہنا ہوا تھا اور زیوروں سے لدی ہوئی تھی۔ پھولوں کے ہاروں سے۔ آنکھوں میں خوابوں کی پرچھائیاں ڈولتی ہوئی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس سہاگ رنگ کو دیکھنا چاہا ہی تھا کہ احاطہ آوازوں سے بھر گیا۔ گلی میں لوگ بلند خاں کی اونٹنی کے گرد اکٹھا ہونے لگے۔ نور خاں شاید کسی ٹیلے کی طرف گیا تھا۔ وہ بیمار بھیڑوں کا واحد معالج تھا اور اس کچے موسم میں جانوروں کو کئی بیماریاں ہو جایا کرتی ہیں۔ پیرن نے باہر نکل کر کہا "گھر میں کوئی بھی نہیں ہے۔"

Scanned by CamScanner

بلند خاں نے کہا "بیٹھنے کا وقت نہیں ورنہ میں ان کا انتظار کرتا۔ عیلے خاں کی ٹانگ کاٹنے کے لئے کل جراح آنے والا ہے مجھ اکیلے میں اتنی ہمت نہیں کہ یہ سارا تماشا دیکھ سکوں۔ میں کہیں جا رہا ہوں میں اس کی تکلیف نہیں دیکھ سکتا۔ نور خان سے کہنا وہ رکھنی چلا جائے امرایا خاں بھی راہ میں پہ ہے۔ آدمی اپنی خوشیوں میں دوسروں کا رنج و غم کیسے بھول جاتا ہے۔

اگلے دن نور خاں اور اس کی بیوی رکھنی چلے گئے۔ مریم سنبل کے ساتھ گھر میں اکیلی رہ گئی۔ میرا دل اتنا بجھا بجھا اور اداس تھا خدا خانے کہ عیلے خاں بچے کہ نہیں وہ ابھی زندگی سے بھرپور تھا اور جوان تھا۔ اسکے دل میں کتنی آرزوئیں کتنی امیدیں ہوں گی۔ اسنے کیسے کیسے مریم کے خواب نہ دیکھے ہوں گے۔

موسم مجھے بے رنگ اور بے کیف لگنے لگا۔ باہر ویرانے میں بہار آئی ہوئی تھی۔ پر خنکی کا گمان ہوتا تھا۔ اب دن اتنے لمبے نہ رہے تھے۔ شام جلد ہو رات میں بدل جاتی۔ راتیں ذرا ٹھنڈی ہو گئی تھیں اور ٹیلوں پر دور دور تک بستی کی عورتوں نے ناک پر دودھ سوکھنے کے لئے پھیلا رکھا تھا۔ پھوک کے پھولوں کو سکھانے کے لئے اکٹھا کر رہی تھیں۔ کریں سرخ پھولوں سے بھر گئے تھے۔ جنڈی سبز ہو گئی تھی۔

ٹوبے میں پانی تھا۔ مویشی چکنے بدن والے اور تندرست تھے اور سایوں میں سکون اور ٹھنڈک تھی۔ عورتیں ٹوبے کے کنارے جھاڑیوں کی اوٹ میں رنگ برنگ کے کپڑوں سے بچھونے بنانے میں لگی تھیں ان کی باتیں بے پناہ ہنسی میں بڑی جان تھی۔ کمبلوں کے لئے اُون کو کاٹتے ہوئے وہ بڑے پیارے گیت گاتیں اور ایک دوسری سے چہلیں کرتیں۔

شام کو میں نے پیرن سے کہا کہ "میں سنبل سے ٹوبے کے پاس ملنا چاہتا ہوں اُسے کہو کہ وہاں آ جائے۔"

چرواہے گھروں کو گیت گاتے لوٹ رہے تھے اور تازہ دودھ کی خوشبو بستی کے ہر گھر سے اٹھ رہی تھی۔ کنواری لڑکیاں چوڑا پہننے کاموں میں لگی تھیں میں ٹوبے کے پاس ٹیلے کی اوٹ میں ٹہل رہا تھا اور سنبل کا انتظار کر رہا تھا۔

"سائیں آپ نے بلایا تھا" وہ جھاڑیوں کی دیوار کو ہٹا کر آتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا ہاں میں نے بلایا تو تھا مگر اب سمجھ میں نہیں آتا تمہیں کیا کہوں۔ مریم کی اور اور میری منگنی نور خاں کی مرضی سے ہو گئی ہے مگر مجھے لگتا ہے وہ خوش نہیں ہے۔ میں اور کسی سے نہیں پوچھ سکتا۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ وہ کیوں خوش نہیں کیا اسے عیسیٰ خاں سے محبت ہے۔"

سنبل نے شام کے بڑھتے اندھیرے میں اپنی آنکھیں اوپر اٹھا کر اسی بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ جھاڑیوں میں جگنو روشن تھے اور سورج کی لالی ٹوبے کو خون کے رنگ کا سرخ کر رہی تھی۔ نیلا دھندلکا سفید پودوں ٹیلوں اور پھولوں کے جھنڈوں پہ اتر رہا تھا پھر کہیں پپیہا زور سے بولا اور کوئل کی دردناک آواز قریب ہی جال کی شاخوں میں سے سنائی دی۔ میں نے کہا سنبل جواب کیوں نہیں دیتی ہو کیا مریم کو عیسیٰ خاں سے محبت ہے۔

اس نے مڑ کر ٹوبے کی طرف دیکھتے ہوئے جہاں پانی انگاروں کے رنگ کا ہو رہا تھا کہا۔

"روہی میں لڑکیاں محبت نہیں کیا کرتیں۔ آپ اب یہ کیوں جاننا چاہتے ہیں۔"

"اچھا کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں مریم سے بات کر سکوں۔"

"ہاں آج رات آپ ہمیں اس بڑے ٹیلے کے پاس ملیں۔" اور یہ کہہ کر وہ چھلاوے کی طرح جھاڑیوں کی اس دیوار سے پرے غائب ہو گئی۔

میرا دل یقین اور بے یقینی کے درمیان شکنجے میں کسے ہوئے جسم کی طرح دکھتا اور ٹوٹتا معلوم ہو رہا تھا۔ میں رات کے ایسے وقت جب لڑکیاں بھٹ پر ناچ رہی تھیں اور جھومر گیت گا رہی تھیں اکیلا ٹیلے کے قریب دم سادھے ان کا انتظار کر رہا تھا۔

ناچنے والیوں کا شور بڑھ گیا تو میں نے ان دونوں کو دیکھا سنبل آگے آگے تھی اور مریم اس سے ایک قدم پیچھے مگر اس سے لگتے ہوئے قد کی۔ اس نے شرم سے دوہری ہو کر اپنا منہ نہیں چھپایا۔ وہ اپنی چنری کے پلو کو اپنی انگلیوں پر نہیں لپیٹ رہی تھی۔ وہ کھڑی میری طرف بیٹھ کئے نہیں بس یونہی ٹیلے پر دیکھ رہی تھی۔ سنبل نے کہا "مریم میں ابھی آتی ہوں تم یہاں کھڑی رہو۔" اور وہ ٹیلے کی چڑھائی پر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

مریم ایک دم گھومی اور سیدھا میری آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی: "کیا کہنا ہے کیا پوچھنا ہے۔"

میں نے کہا "تمہیں یہاں آنا بُرا لگا ہے تو جا سکتی ہو۔"

ذرا نرم پڑتے ہوئے کہنے لگی "بلایا تھا آ گئی۔ نہ اچھا لگا ہے نہ بُرا۔"

میں نے کہا "مریم میں تمہیں بُرا بھی نہیں لگتا اور اچھا بھی نہیں۔ کیا تم کسی سے محبت کرتی ہو؟"

وہ بڑی دلچسپی اور حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"ہم روہی کی لڑکیاں صرف بکا کرتی ہیں جو سب سے زیادہ بولی دے وہ لے جاتا ہے۔ محبت کرنا ہم شادی کے بعد سیکھتی ہیں۔"

میں نے کہا "مگر میں اپنے سوال کا جواب چاہتا ہوں۔ میں اپنے دل کی بے یقینی دور کرنا چاہتا ہوں۔"

پھر اس لمحے کی چکا چوند مجھے آج تک سمجھ میں نہیں آئی۔ نیلے آسمان سے بجلی کا کوندا لپکا اور مجھے چھو کر نکل گیا۔ ایک پل جیسے نور سے سارا جہاں منور ہوا اور ہر شے سمبرینیں گھر جائے ہونٹوں پر خون میں جسم سے پھوٹتی گرمی اور آگ کی وجہ سے میں نے جانا کہ میں موت کے کنارے سے لوٹا ہوں۔ پسینے میں نہایا کانپتا ہوا میں ٹیلے کے سائے میں بیٹھ گیا۔ میری ٹانگیں اس ایک ساعت کی خوشی اور مکمل پن کا بوجھ سہارنے سے عاجز تھیں۔ مریم مجھ سے محبت کرتی تھی۔ گنگناتی راہوں سے جب میں لوٹا ہوں تو بیرن اور نگاری خاں کسی گرما گرم بحث میں الجھے ہوئے تھے امرایا۔ احاطے میں بیٹھا مریم اور سُمبل سے باتیں کر رہا تھا۔ جراح نے کہا تھا کہ وہ ٹانگ کاٹنے سے پہلے اپنا آخری علاج عیلے خاں پر آزمانا چاہتا ہے۔ نور خاں اور اس کی بیوی رکھنی سے کل صبح لوٹنے والے تھے۔ وہ اس صبح کے بعد سے پہلی بار ایک رشتہ دار کی حیثیت سے مجھ سے ملا تھا۔ مگر اسکے انداز میں اتنی سرد مہری تھی کہ میں اس کی طرف سے مایوس ہو گیا۔ شاید اسے میں پسند نہ تھا۔ وہ اپنے دوست عیلے خاں کو مجھ پر ترجیح دیتا تھا۔ شاید وہ مجھے امیر زادہ سمجھ کر اپنے سے اونچا سمجھتا تھا اور مجھ سے خائف تھا مگر یہ یقین کہ مریم مجھے چاہتی ہے کافی تھا۔ مجھے کسی اور کے قبول کرنے اور کہنے کی ضرورت نہ تھی۔

پہلی راتوں کا چاند چھپ کر ستاروں کو زیادہ روشن چھوڑ گیا تھا۔ کہکشاں کا غبار۔ قطب تارا سات تاروں کے جھرمٹ کی سیدھ میں۔ بکھرے ہوئے آنکھیں جھپکاتے روشن اور

مدھم تیر اور بجھے بجھے سے قمقموں سے آسمان سجا ہوا تھا۔ وہ ساری رات میں نے آنکھوں میں کاٹ دی۔

عشق موت کی مانند زبردست ہے۔
دہی کی لڑکیاں بکتی ہیں۔
بستی کی لڑکیاں شادی کے بعد محبت کرتی ہیں۔

مریم ایک عام اور معمولی لڑکی نہ تھی۔ وہ حالات کے مقابلے میں ہتھیار ڈالنے والی نہیں تھی میں نے اپنے آپ کو بہت لوریاں دیں بہلایا کہ میں جب سے آیا ہوں تب ہی سے مریم مجھے چاہنے لگی تھی بھلا یہ ہو سکتا تھا کہ مریم مجھے چاہنے نہ لگے۔ اپنے لئے میرے دل میں قلبی قدر و منزلت تھی وہ ساری مریم کو بہلانے اور اسے مجھ پر فدا کرنے کو کافی تھی۔ سوچنے، کروٹیں بدلنے اور روزنوں میں سے احاطے کے اس طرف دیکھنے جہاں مریم سنبل اور امرایا خاں سوئے ہوئے تھے وقت گزر گیا یہاں تک کہ مرغ کی اذان نے رات کے ختم ہونے پر گواہی دی۔ صبح کا تارا ڈرتا کانپتا جھکتا ان کے غبار میں سے نکلا۔

مشرق کی طرف سیاہی کسی اندرونی نور سے آسمان کی باقی سیاہی کے مقابلے میں واضح ہو رہی تھی۔ ورنہ ادھر بھی ظلمت ہی تھی۔ پھر بہت آہستہ سفیدی ان کناروں سے نمودار ہوئی اور اندھیرے آسمان کا وہ ٹکڑا سفید ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ٹیلے اور کھوٹ اگ : لگ نظر آنے لگے۔ پھر وہ سفیدی کانپنے لگی اور کانپتی رہی جیسے پارہ بہنے کے لئے بے تاب ہو اور پھر بھی حدود میں قید ہو پھر جیسے بھک سے لاوا آتش فشاں کے راہ سے پھٹ جائے۔ وہ کانپتا ہوا پارہ دم کے دم میں الگ ہو گیا اور ایک ان دیکھا ان جانا اور پھر بھی صدیوں سے روشن گولا ایک نئے دن کے دامن پر طلوع ہو گیا۔ میں دروازے کے سامنے لیٹا تھا اور ابھی تک مجھ پر کپکپی طاری تھی۔ میں نے آج سے پہلے کبھی صحرا میں سورج کو نکلتے نہیں دیکھا تھا۔ عظیم پُر عظمت اور انسان کو اپنی کم مائیگی بے چارگی کا احساس دلانے کے لئے میں نے اس صبح سے بڑھ کر کسی شے کو نہیں دیکھا۔ مشرق کی سرخ دھاریاں مٹ گئیں اور تیز چمکتا ہوا اور ننگا ہوں کو خیرہ کرنے والا صحرا کا دن شروع ہو گیا۔

چاٹیوں کی گھمکار بچوں کا شور مرغوں کی اذانیں اور عام دنوں کی طرح تھیں مگر بستی میں کسی کو کیا پتہ تھا کہ میں نے قدرت کے کارخانے کا ایک گوشہ دیکھا تھا اور اس بے نقاب گوشے کو دیکھنے کے بعد مجھ میں حوصلہ باقی نہیں رہا تھا۔ آخر انسان کیا ہے؟

دوپہر کے قریب نوز خاں اور اس کی بیوی آ گئے تھے۔ وہ دونوں چپ چاپ تھے۔ مریم اور سنبل جب بھیڑوں کو لے کر چلی گئیں تو امرایا خاں میرے پاس آیا۔

میں نے کہا سناؤ ٹیلے کا کیا حال ہے۔

کہنے لگا۔ میرا خیال ہے وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ جراح قابل آدمی ہے۔" اور یہ کہہ کر اس نے اپنی بہن کی طرح میری آنکھوں میں دیکھا۔

میں نے کہا۔ "امرایا اگر تم اس رشتے سے خوش نہیں ہو تو میں کیا سمجھوں۔"

وہ کھڑا تھا بیٹھ گیا اور تخت کے کنارے سے الف لیلے اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا۔ پھر ایک صفحے کو الٹ کر تھوڑی دیر پڑھتا رہا اور پھر بولا۔

"زندگی بھی ایک کہانی ہے سائیں۔ الجھی ہوئی اور سمجھ میں نہ آنے والی۔ اگر ہر بات کو سمجھنے کی کوشش کرو تو جینا دوبھر ہو جائے۔ ذہن اتنے سوال کرتا ہے جن کا جواب کہیں سے بھی نہیں ملتا۔ کوئی ان سوالوں کو سمجھنے میں وقت نہیں لگاتا اور زندگی گذر جاتی ہے۔ جب آپ یہاں آئے تھے تو گرمی اور تپش تھی۔ اب ٹوبہ پانی سے بھرا ہے۔ ٹیلوں پر گھاس ہے۔ کھیت آباد ہیں۔ شکار وافر ہے۔ جھاڑیاں پھولوں سے لدی ہیں۔ دودھ برتنوں میں نہیں سماتا۔ جانور خوش ہیں ہر طرف نغمہ اور خوشی ہے یہ تو ظاہر میں ہے پر چاند کی روشنی کسی کو ڈستی ہے اور کسی کو آسودگی دیتی ہے۔ سردی آئے گی تو بہار ہو گی یہی اجاڑ علاقہ آباد ہو گا۔ بہار میں یہاں پر کیا کیا راگ رنگ ہوں گے۔ ہر سال یہی ہوتا ہے اور جب ہم نہ ہوں گے یہی ہو گا۔ جب ہم نہیں تھے تب بھی یہی تھا۔ دنیا کے نقشے پر انسان تو ایک ذرہ ہے جس کے ادھر ادھر ہو جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ اپنی سمجھ پر نازاں ہوتا ہے۔ سوچتا ہے۔ زمین و آسمان اور ہر شے اسکے فائدے اور خوشی کے لئے بنی ہے۔ اصل میں کچھ بھی اس کے لئے نہیں ہوتا۔ آدمی حالات کے ہاتھ میں ایک ادنیٰ سا کھلونا ہے۔ قدرت بادشاہ کی طرح ہر رات نئے آدمی

کو منظور نظر بناتی ہے اور پھر اسے ناکام نامراد پھیر دیتی ہے۔ مگر اس کے پاس یاد کا دوزخ ہے جس میں وہ سدا کڑھتا اور جلتا ہے اور اس ایک رات کو واپس لانے کی جستجو کرتا ہے۔

میں نے کہا امرایا تمہارے دل میں یہ تلخی کیوں اور کس لئے ہے۔ تم جوان آدمی ہو مایوسی کا یہ طریقہ انسان کو ناکارہ بنا دیتا ہے۔ سوچو اور اپنی پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کرو۔

وہ اسی طرح الف لیلیٰ کی ورق گردانی کرتے ہوئے میری طرف دیکھے بنا بولا۔

میں خواجہ سگ پرست ہوں۔ انسانوں سے نفرت کرنے والا۔ جب سے علیے خاں زخمی ہوا ہے میں خدا کی طرف مایوس ہو گیا ہوں۔ آدمی اپنے کسی گناہ کے بدلے نہیں بس یونہی سزا بھگتا ہے تکلیف اٹھاتا ہے اور کبھی دیئے کی لو کی طرح بھڑک کر بجھ جاتا ہے۔

میں نے کہا مجھے لے چلو میں علیے کو دیکھنے چلوں گا۔

امرایا اٹھتے اور کتاب کو تقریباً تحت پہ پٹختے ہوئے بولا "گیا اسے یہ دکھانے کی خواہش ہے کہ وہ نامراد آدمی ہے جس کی اپنی چھوٹی سے چھوٹی خواہش بھی پوری نہ ہو سکی۔ سائیں اگر وہ زخمی نہ ہوتا تو میری بہن مریم آج اس کی بیوی ہوتی۔"

میں نے کہا۔ امرایا مجھے غلط نہ سمجھو اگر اب بھی علیے تندرست ہو جائے تو میں اپنے فیصلے کو بدلنے اور مریم سے دست بردار ہونے کو تیار ہوں۔ میں زندگی میں ناکام اور نامراد رہنا پسند کروں گا بنسبت اسکے کہ میری وجہ سے تمہیں یا علیے خاں کو کوئی تکلیف ہو۔

امرایا مجھ سے آگے چل رہا تھا۔ اور راہ دکھاتا جاتا تھا۔ میں اور پیرن پیچھے پیچھے تھے اُسے شاید دوست کے پاس پہنچنے کی جلدی تھی کہ وہ کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔ خیالوں میں ڈوبا اونٹنی کی مہاریں ڈھیل چھوڑے تھا۔ اونٹنی راہوں سے آشنا آپ ہی آپ ٹیلوں پر چڑھتی اترتی خوبصورت بجرے کی طرح جا رہی تھی۔ آتے ہوئے میں نے مریم کے جھپٹے کو دیکھنے کی تمنا کی تھی مگر وہ ٹولے پر سہیلیوں کے ساتھ پانی بھرنے گئی ہوئی تھی۔ میں نے گلی کے نکڑ تک جا کر دیکھا تھا پر وہ نظر ہی نہیں آئی۔ سوار ہو کر ہم آگے بڑھے ہیں تو موڑ مڑتے ہی رہنا ال بستی اوجھل ہو گئی۔

جھاڑیاں پھولوں سے بھری ہوئی تھیں۔ بھیڑیں گھاس میں منہ چھپائے سر ہلاتی اور اپنے گلے میں پڑے گھنگروں کی ٹنٹناہٹ سے آپ ہی خوش تھیں۔ کھپ کے پھیلے ہوئے پودے ہوا میں

ہلتے کرڑ کنڈے جیسے ریشمی بور ہوں سبز اور دے۔ لال پیلے پیلوں سے جھاڑیاں جھکی پڑتی تھیں۔ لڑکیاں اور عورتیں ٹوکریاں اپنے پیچھے باندھے پیلو چن رہی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ کھاتی بھی جاتی تھیں۔ جال کے اکیلے درخت کے نیچے بچے اور پانی کی ٹھلیاں پڑی تھیں۔ مور بول رہے تھے اور چرواہے بانسری بجاتے بھیڑوں کے گلوں اور بکریوں کے ریوڑوں کو آس پاس کہیں اطمینان سے آرام کر رہے تھے۔ ہرنوں کی ڈاریں کبھی سامنے سے بھاگتی ہوئی نکل جاتیں۔ ایک ہرنی کا بچہ بھاگتے ہوئے گر گیا اور وہ اپنی جان کی پرواہ کئے بنا بھاگتے بھاگتے رک گئی۔ بچہ بھاگ گیا۔ مگر اس ہرنی کی سر بلند گردن ہوا میں اٹھی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ جہاں نشیب میں پانی جمع ہو گیا تھا خانہ بدوش قبیلے ڈیرہ ڈالے پڑے تھے۔ ان کی لڑکیاں جھانجھریں بجاتی چاندی کے زیوروں سے لدی بھیڑوں کو ہنکاتی پھر رہی تھیں۔ بستیوں اور گاؤں سے باہر یہ قافلے رہتے تھے کہ پانی کی تلاش میں پھرتے پانی پر ٹھہرتے اور پانی ختم ہونے پر دوسری جگہ چلے جاتے۔

جگہ جگہ ٹیلوں پر جھونپڑیاں آباد تھیں۔

چراغ جلے ہم رکھنی پہنچے۔

عیلے خاں خاموش رہے مجھے دیکھتا رہا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے کہا "عیلے خاں میں اتنی دور سے تمہیں دیکھنے اور یہ کہنے آیا ہوں کہ تم تندرست ہو جاؤ۔"

امرایا نے اس کے پاس بیٹھ کر بہت محبت سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "جراح نے علاج شروع کر دیا ہے نا۔ اب تم چند دنوں میں ٹھیک ہو جاؤ گے۔" عیلے خاں نے کہا "میں بھی یہی سوچتا ہوں تندرست ہو جاؤں تو اتنے سب بڑے شکار میں سے اپنا حصہ تو وصول کر لوں۔"

دونوں ہنسنے لگے۔

مگر عیلے خاں کے چہرے پر موت کی زردی کھنڈی تھی اس کی آنکھوں میں جینے کی آس کم تھی۔ وہ صرف امرایا کو تسلی دینے کی خاطر ہنستا تھا اور شکار کا ذکر کر رہا تھا۔

گاذی خاں بھی باہر سے آ کر ہماری گفتگو میں شامل ہو گیا۔ وہ تین چار دنوں سے یہیں پر تھا۔ عمر خاں بلند خاں کا چھوٹا بیٹا باہر بیٹھا ہماری پرواہ کئے بنا زور زور سے گا رہا تھا۔ مگر میں نے اسے معاف کر دیا۔

گاری خاں اپنے فوج میں گذارے دنوں کا ذکر کرنے لگا۔ جراح نے عیلے کو سلانے کے لئے کوئی خواب آور دوا دی تھی۔ اور جب امرایا نے اسے دوا پلا دی تو ہم سب باہر آ گئے۔ بستی کے گھروں میں جلتے دیوں کو دیکھنے لگے۔ رات ناقابل یقین حد تک خوبصورت اور مکمل لگ رہی تھی۔ امرایا نے کہا گاری خاں، اتنے برسوں سے تم رہنال میں رہتے آئے ہو میں نے کبھی تم سے یہ نہیں پوچھا کہ تم جو فوج کی زندگی کا اتنا ذکر کرتے ہو آخر فوج چھوڑ کر کیوں چلے آئے۔ ابھی تم اتنے بوڑھے بھی نہیں ہو اور پھر ملک کو تمہاری ضرورت بھی تھی۔ بتاؤ تو سہی۔

میں نے کہا ہاں گاری خاں، تم اتنے تندرست شکاری ہو کہ دوڑتے ہرن پر نشانہ باندھو تو کبھی نہیں چوکتا پھر تم نے فوج کیوں چھوڑ دی۔

پیرن نے کہا، سائیں کبھی کبھار آدمی کو اپنی جان بہت پیاری لگنے لگتی ہے اور وہ اسے جوکھم میں نہیں ڈالنا چاہتا۔

گاری خاں نے اس کی طرف دیکھا اور پھر زور سے "کیوں" کہا۔

امرایا نے کہا "نہیں یہ بات نہیں ہو سکتی پیرن۔ کیوں گاری خاں یہ بات نہیں ہو سکتی نا؟"
بوڑھے شکاری نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر کہا پیرن اور امرایا تم دونوں سچے ہو اور میں بھی سچا ہوں۔

وہ خاموش تھا پھر اٹھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا گوپے کے اندر گیا جہاں عیلے سو رہا تھا۔
ہم تینوں گزرتی رات کی چاندنی میں جو بڑی بھیگی اور کیف آور تھی ایک دوسرے سے کوئی بات کئے بنا بیٹھے رہے ہمیں گاری خاں کا انتظار تک نہ تھا۔ یہ ایسی رات تھی جس میں محبتیں بکواس لگنے لگتی ہیں نفرتیں اس سے بھی لایعنی لگتی ہیں۔ جنگیں اور حقوق کی حفاظتیں سب بے معنی باتیں معلوم پڑتی ہیں صرف انسانی جان قیمتی لگتی ہے۔ انسانی جان اور انسان کا خون۔ سرحدوں کے جھگڑے رکھنی اور رہنال اور رکن پور اور موہوم لکیریں سب خواب میں سنے قصے کہ آنکھ کھول کر دیکھو تو کسی شے میں وہ دلآویزی اور سحر نہیں جو آدمی کے حواس گم کرتا اور اسے لڑنے پر مجبور کرتا ہے۔

بہت دیر کے بعد جیسے صدیاں کہہ لو ہم نے گاری خاں کو بیمار آدمی کی طرح گرتے پڑتے اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ اپنی جھولے میں رکھی شراب پی کر آیا تھا۔ اسکے سر پر پگڑی نہ تھی اور سفید بال

چاندی کا جال سا معلوم ہوتے تھے۔ اس نے اپنی گھنی بھنویں اٹھائیں اور محبت غور سے ہماری طرف دیکھ کر کہا۔ "کیوں امرایا خاں کیا تم ضرور پوچھو گے کہ میں نے فوج کیوں چھوڑ دی ہے۔"

امرایا نے کوئی جواب نہ دیا۔

بیٹے یہ ان دنوں کی بات ہے جب تم شاید ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے ہو گے۔ میں سرحد پار کے ایک گاؤں میں سے کھیتی باڑی چھوڑ کر دوسری جنگ میں بھرتی ہو کر وطن سے دُور چلا گیا۔ میرا گاؤں دنیا کے کسی حصے میں اس سے زیادہ خوبصورت گاؤں تم نہیں دیکھو گے۔ درختوں کے گھنے جھنڈوں اور کھیتوں کے سبزے سے گھرا یہ دریا کے کنارے کا ایک ٹکڑا تھا جسے دیکھ کر تم کہو گے کہ جنت زمین پر اتر آئی ہے۔ لالیاں جنت ہی تھی۔ میرا چھوٹا سا گھر۔ میرے اناج کی بالیوں سے اُبلتے کھیت۔ میری بچی جو محبت سے جب گلے میں باہیں ڈالتی تو مجھے جینے اور زندگی کا مطلب سمجھ میں آنے لگتا۔ میرا بیٹا جو اگر زندہ ہوتا تو تمہاری طرح جوان ہوتا۔

ہم دونوں بنارس کے مارچ کرتے رہتے۔ جنگ میں جانے والے سپاہی کے دل میں کتنے ولولے ہوتے ہیں کتنے سہانے خواب ہوتے ہیں۔ یہ میدان میں جا کر یہ سارے خواب پرانے چیتھڑوں کی طرح گر پڑتے ہیں اور انسانی روح ننگے بدن اپنے گرد و پیش دیکھتی ہے۔

دشمن کے جہاز سروں پر اتنے نیچے جھپک آتے کہ لگتا ہمارے سر اڑ جائیں گے۔ چلتے ہوئے ابھی تم کسی سے بات کر رہے ہو۔ بات ختم نہیں کر چکے کہ دشمن کے جہازوں نے آلیا ہے۔ چھپتے ہو تو گولے قریب آ کر پھٹتے ہیں۔ جب غبار صاف ہوتا ہے تو تم اپنی آدھی بات سنانے کے لئے اپنے اس ساتھی کو تلاش کرتے ہو مگر تمہارا ساتھی اوندھے منہ لیٹا ہے اس کی پشت اڑ چکی ہے۔ اور اب بتاؤ تم کیا کر سکتے ہو۔

ما شوق ختم ہو جاتا مگر بھوکے اور پیاسے جان بچانے کے لئے آگے ہی آگے بڑھنا ہوتا تھا گاؤں کے گاؤں خالی ہوتے۔ محبت کے بول آرام اور سکون کے لئے جی ترس جاتا مگر رکنا موت تھی۔ بوٹوں میں پڑے پڑے پاؤں چمڑے کا حصہ بن چکے تھے۔ ایک بار مہینوں ہمیں اپنی حفاظت کی خاطر مسلسل رات دن کام کرنا پڑا تھا۔ ایک اجاڑ گاؤں میں ہم چند ساتھی رک گئے۔ خوفناک خاموشی میں چاروں طرف ویرانی اور ڈھیلے ہوئے مکانوں کے ڈھیر تھے۔ میں اور میرا ایک دوست کھانے کی تلاش میں

گھومتے ہوئے ایک کھنڈر میں پہنچے ایک بڑھیا جو آنکھوں سے اندھی تھی راکھ کرید رہی تھی۔ جب ہمارے بوٹوں کی آہٹ سنی تو کہنے لگی "خدا نے قیامت کا دن گزار بھی دیا مگر بچھڑے ہوئے نہیں ملے"۔ میرا جی اتنا بیزار ہوا کہ میں نے کھانے کے لئے کسی شے کی تلاش چھوڑ دی اور واپس آ گیا۔ جنگ ایسے ہی مذاق کرتی ہے۔ کون جیتا اور کون ہارا یہ تو خدا جانتا ہے مگر انسانوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ جب جنگ جیت لی گئی تو ہندوستان کی آزادی کا وعدہ پورا کرنے کا وقت آیا۔ ان دنوں میں نے فوج سے نام کٹا لیا تھا اور اپنے بال بچوں کے ساتھ لالیاں میں رہتا تھا۔ میرا ایک چھوٹا سا خوبصورت گھر تھا میرے کھیت تھے درختوں میں کوئلیں کو ہو کو ہو بولتیں۔ آم کے لدے ہوئے پھل کے بوجھ سے جھکے جاتے تھے۔ ہر شے اتنی مکمل اور خوبصورت تھی۔ مجھے جنگ کے سالوں میں سہے ہوئے غم بھول رہے تھے۔ میری بچی جوان ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سرخی نئی پھوٹتی کونپلوں کی طرح تھی اسے دیکھ کر مجھے سب مصیبتیں بھول جاتیں۔ میں اس کی شادی کی تیاریاں کر رہا تھا۔ سمجھتے ہو اگر وقت مجھے مہلت دیتا تو وہ بیاہی جا چکی ہوتی۔ اس کے ہاتھوں میں مہندی لگتی میرے گھر کے آنگن میں نیم تلے سہاگ کے گیت گائے جاتے۔ اور دالانوں میں پڑے سرخ پایوں والے پلنگ پر میرا جوان داماد شرمیلا سا لڑکا آن کر بیٹھا کرتا میرے گھر میں چھا جھریں بجاتی مہندی رنگے پاؤں سے بہو گھومتی اور چوڑے سے بھری سفید کلائیوں اور چھلوں سے بھری انگلیوں والے ہاتھوں سے چھاچھ بلوتی۔ دودھ کی چاٹی کی کھمکار سے میری گلی بھی گونجتی۔ اور میری بیوی پوتوں کو کھلاتی ہوئی پرانے دنوں کی سنی لوریاں دہرایا کرتی۔ مگر وہی ہوا جو کسی خدا کو بھی منظور نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے اس جنگ میں بیگانوں کو مرتے دیکھا تھا اس جنگ میں اپنوں کو کٹتے دیکھا اور پھر بھی زندہ ہوں امرایا خاں میں زندہ ہوں پیرن میں زندہ ہوں اور مر نہیں سکتا تم لوگ مجھے دیوانہ کہتے ہو نا۔ مگر رام دیا کبھی علیے خاں کی ٹانگ زخمی نہ کرتا۔ اگر یہ موہوم حدیں اور فاصلے نہ ہوتے۔ بولو کیا اب بھی میں فوج میں بھرتی ہو جاؤں۔ اور اپنے جگر کے ٹکڑوں کو کاٹوں اپنے ہی گھر کی چار دیواری میں گولیاں چلاتا دائیں بائیں تباہی مچاتا پھروں۔ بولو نا۔

امرایا خاں نے کہا۔ "گاری خاں تم ٹھیک ہی کہتے ہو اور غلط بھی اصل میں کوئی شے تباہ نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ روح کبھی نہیں مرتی۔

گاری خاں نے کہا۔ میں کسان آدمی ہوں۔ روح اور جسم کے رشتے کو نہیں سمجھتا۔ کتابوں میں کیا لکھا ہے میں نے نہیں پڑھا مگر اتنا جانتا ہوں کہ جب جسم تباہ ہوتا ہے تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ بچپن میں مسجد کے مُلا کہا کرتے تھے کہ ہمارے کئے کا پھل کس حصے دنیا میں ملتا ہے اور ستر حصے آخرت میں۔ مرنے کے بعد جو ہو گا اسے کون جانتا ہے مگر زندگی میں جو تباہی ہوئی کیا وہ کرموں کا پھل تھا؟

میں دل ہی دل میں گیتا کو دہرا رہا تھا جس میں ارجن اور کرشن بھارت کے لئے دشمن کی فوجوں کے سامنے اپنے یقین اور بے یقینی کو دہراتے ہوئے اپنے آپ کو سچ ثابت کرتے ہوئے بحث کرتے ہیں۔ "جسم تو بھسم ہو جانے والی شے ہے وہ جو جسم کی اساس ہے اسے دوام ہے اس کی کوئی حد نہیں وہ کبھی فنا نہیں ہو سکتی۔ سو ارجن تم لڑتے رہو۔

بھگوان کرشن نے ارجن سے کہا "ہے ارجن تو سب کرموں کا تیاگ کر کے ایک میرے شرن آ۔ تجھ کو پاپوں سے مکت کروں گا۔

ارجن نے پوچھا "تمہاری شرن پڑنا کوئی دھرم ہے۔

اور بھگوان نے کہا "یہ پرم دھرم ہے اتم دھرم ہے۔

من پرم چنچل ہے اور مست ہاتھی کی مانند بلوان ہے اس کا پکڑنا تو لوہوں سے بھی کٹھن ہے بھگوان نے کہا۔ مہان باہو ارجن اس میں سندیہہ کچھ نہیں من ایسا ہی چنچل ہے اور پکڑا بھی نہیں جاتا۔ پر اس کے پکڑنے کے دو اپاؤ ہیں۔ میرے ساتھ پریت اور سنسار کے وِگیان سے پراگ"

گاری خاں نے سنسار کے وِگیان سے بیراگ نہیں لیا تھا۔ وہ تو تلخی سے ان سارے گذرے لمحوں میں زندہ تھا۔ اس کے پاس سوائے ماضی کے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ ایک سپاہی کی طرح اپنا آپ ثابت کرتے اپنے اندر کے کھرے اور کھوٹے کو پرکھنے نکلا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا پرکھ رہا تھا اور میں جانتا ہوں کہ میں اپنے اندر چھپے خوف پر غالب ہونے کے لئے یہ سب کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ اپنی قوتِ مدافعت آزمانا چاہتا ہوں اور میرے اندر کوئی شے تھی جو ان سارے سیدھے اور سادہ لوگوں کے سامنے مگر جاتی اور حیرت انگیز طور پر مجھ پر یہ بات ظاہر ہوتی کہ میں کسی کھوٹے اور کھرے کو پرکھنے اور ثابت کرنے کی قوت نہیں رکھتا۔

ہُرایا خاں عیسےٰ خاں کو دیکھنے کے لئے اندر چلا گیا تو گاری خاں نے کہا عمر خاں ابھی ان ٹیلوں کی طرف گیا ہے۔ وہ بہت ہوشیار لڑکا ہے اس کی دوستی بھی جیسلمیر کے لوگوں سے ہے مگر سوائے ملنے ملانے اور کبھی کبھی تحفے دینے کے اس نے کسی شے کی خواہش نہیں کی۔

تمہاری ساری دنیا کی خبریں کس طرح پتہ چل جاتی ہیں۔ کون کس سے کیا لیتا ہے کس کی کس سے کتنی دوستی ہے۔ تمہیں ہر بات کی خبر رہتی ہے۔

گاری خاں ہنسا اور کہنے لگا میں ٹیلوں پر آوارہ گھومتا رہتا ہوں۔ شکاری آدمی ہوں اور جب میرا شکار بھاگ کر اُدھر چلا جائے۔ (اس نے سرحد سے پرلی طرف اشارہ کیا) تو میں اُسے ادھر ہی آپ ہنکا لاتا ہوں۔

پیرن کمبل بچھا کر سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ ہم نے ٹیلوں کے پار سے ٹھائیں ٹھائیں کی آوازیں سنیں۔ میں لیٹا ہوا تھا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ گاری خاں نے کہا "وہ ایک نہیں کئی ہیں اور عمر خاں اکیلا ہے۔" پھر وہ پیچھے مڑے بنا گوپے سے بندوق نکال کر بھاگتا ہوا سیدھا آواز کی طرف چلا گیا۔ اُرایا میں اور پیرن بھی بندوقیں اٹھائے ریت کے ٹیلوں پر سے آواز کی سیدھ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بھاگتے لگے۔

چاندنی میں جو بادلوں کی سفیدی کی وجہ سے بہت واضح نہیں تھی ہمیں سامنے والوں کی صحیح پوزیشن کا پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ ٹیلے پہاڑیوں کی طرح اونچے تھے۔ عمر خاں کا کہیں پتہ نہیں تھا البتہ گاری خاں بہت پھرتی سے گولی چلا کر ایک سے دوسرے ٹیلے کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ جھاڑیوں کی اوٹ لیتا وہ ایک چھلاوے کی طرح کبھی نظروں کے سامنے سے غائب ہو جاتا اور کبھی ہم اسے دیکھ سکتے۔

رکھنی کے قریب بستی دلنے میں یہاں سے گزرنے والے دریائے گھاگرہ کی گزرگاہ تھی جو اب خشک تھی اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں اور ٹوبوں سے پٹی پڑی تھی۔ یہ خشک دریا قدرتی حد تھی جو بستی سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ہو گی۔

میرے پاؤں ریت میں دھنستے جاتے اور جوتا پاؤں سے نکل نکل پڑتا تھا۔

بستی کے ٹوبے کی دوسری ڈھلوان کی طرف جو سرحد کے ساتھ تھی اور جھاڑیوں گھاس اور

جھنڈ کے درختوں کی وجہ سے نظر نہ آتی تھی۔ ہم نے چاروں میں دشمن سائے ابھرتے دیکھتے اور بشیر آگے کر ہمارا نشانہ ٹھیک بیٹھتا وہ سائے غائب ہو گئے۔ جانے وہ کتنے ہوں گے کہ جو لیے ہوئے بستی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ہم نے تین طرف سے ٹولے کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا اور چوتھی طرف وہ خود تھے۔ ان کے پاس بستی میں گھسنے کا راہ سوائے ٹولے میں سے ہو کر آنے کے دوسرا نہ تھا۔ اونچے ٹیلوں پر کبھی رکھی پوسٹ سے تنے ہوئے جوان پڑھے بیٹھے تھے۔ وہ ہر طرف سے ہمارے نرغے میں تھے۔ پھر میں نے دو لکڑیوں کو دیکھا جو تیرتی ہوئی ہمارے کنارے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ہوا تیزی اور تندی سے چل رہی ہوتی تو میں سوچتا شاید یہ لکڑیاں بھٹک کر ہوئے ٹولے کی تہہ میں سے نکل آئی ہیں اور حالیہ بارشوں کے بعد پانی پر تیر رہی ہیں۔ مگر ہوا بھی گم سم حیران یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی اور چاندنی بھی بادلوں کی اوٹ میں تھی۔ بادل ٹھہرے ہوئے تھے اور زرد سی روشنی جھاڑیوں اور کنجوں کے سائے میں سنسناتی لگتی تھی۔

عمر خاں نے بھی میری طرح یہ منظر دیکھا ہو گا وہ کہیں میرے قریب ہی چھپا ہوا تھا کہ اسے ٹھہرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی اور بشیر آگے کر میں اسے پکارتا اور رکنے کو کہتا وہ ٹولے میں کود گیا اور کنارے کے پاس اگے ہوئے سرکنڈوں میں طرطاپ کی آواز آئی۔

وہ اپنی بندوق سر سے بلند کئے تیزی سے دشمن کی طرف جا رہا تھا۔ اب ایک لمحہ ضائع کرنے کا وقت نہ تھا۔ اگر میں عمر کے تختے تک پہنچنے سے پہلے گولی چلا دوں تو شاید عمر بچ سکے۔ مگر دور سے نشانہ باندھنا ذرا مشکل تھا۔ میں نے نشست باندھی اور اللہ کا نام لے کر گولی چلا دی۔

عمر کا پانی سے اوپر اٹھا ہوا ہاتھ ایک دم گر گیا۔ اوہ میرے خدا۔ اوہ میرے خدا۔

تم بزدل ہو بزدل۔ کسی نے میرے اندر کہا۔ میں جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا۔

پار والے اپنے دو زخمی ساتھی اور سامان کا ایک اونٹ چھوڑ گئے تھے۔ عمر خاں کے سیدھے ہاتھ کی ہڈی سلامت تھی گولی کھال کو چھوتی ہوئی گزر رہی تھی۔ صبح بلند خاں اپنے بیٹے کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اور بستی کے سہمے ہوئے بچے اور جوان مرد اس گھر کے سامنے اکٹھا ہو رہے تھے

بیبرن نے جب زخمی دشمنوں کو پانی پلانا چاہا تو انہوں نے آنکھیں کھولے بنا سر کو ہلا کر انکار

کر دیا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار دشمن کو اپنے سامنے اور اپنے قبضے میں دیکھا تھا مگر وہ قبضے میں ہونے کے باوجود آزاد تھے۔ اور میں نے آج تک دشمن دیکھے ہی کہاں تھے انکار کے بانکپن کو نفی کے ناز اور استغنا کے حسن کو اس دن پہلی بار میں نے اپنے روبرو پایا۔

جب ہم رہنال واپس پہنچے تو بلند خاں نے مجھے ہرن کے خشک گوشت اور سوکھے دودھ کے دو تھیلے دیئے۔ کہنے لگا یہ اجاڑ دیس ہے جہاں میلوں پانی نہیں ملتا۔ ہم غریب روہیلے ہیں جانوروں کے گلوں کو لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ گھومتے ہیں گھاس کے گھروں میں رہتے ہیں جب آسمان دھوپ کے رنگ کا سفید ہو جاتا ہے اور زمین تنور کی طرح تپ جاتی ہے تو ہم لوگوں کو سر چھپانے کا ٹھکانہ بھی نہیں ملتا۔ ہم تو آپ کی کوئی خدمت نہ کر سکے۔ یہاں کی سوغات تو دھوپ اور گرمی ہے۔

میں نے بلند خاں کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنے آپ کو ایک ایسے بچے کی طرح جانا جو بڑوں میں ہو اور بڑوں کی طرح کی حرکتیں کرے۔ خود من ہی من میں اپنے پر ہنستا پیران کے ساتھ واپس آگیا۔

مریم کے آنگن میں سہاگ کے لمبی تانوں والے راگوں کا میلہ ایک بار پھر لگا۔

ایک مہینہ پہلے سے رات گئے تک عورتیں اور لڑکیاں گاتی اور ناچتی رہتیں جب شام ڈھل جاتی اور کام سے فارغ ہو جاتیں تو سنبل اور مریم کی ماں ڈھولک لے کر اپنے احاطے میں بیٹھ جاتیں۔ پھر گلی کی عورتیں بچوں سمیت آ کر ناچنے والوں میں شامل ہو جاتیں۔ رات تک یہ میلہ لگا رہتا۔ میں ٹیلوں پر گاری خاں کے ساتھ گھومتا۔ جانے کیوں اُن دنوں میرا دل جذبات کی رو میں بہہ کر جیسے خاں سے چھینی ہوئی یہ خوشی محسوس نہ کر سکتا۔ مگر میں اب نور خاں سے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا اور پھر یہاں کا دستور تھا اگر میں نہیں کوئی اور ہوتا تو تب بھی یہی کچھ ہوتا۔ کبھی ٹیلوں کے پیچھے کی وہ ساعت یاد آتی جو میرے وجود کی گرمی اور دل کی زندگی تھی۔

چاولوں کو صاف کرتے اور بیاہ کے سلسلے میں چھوٹے موٹے کام کرتے بستی کی لڑکیاں ایک نیا راگ شروع کر دیتیں۔ مگر ان گیتوں میں جیسے خوشی کا وہ بول نہیں تھا جو آواز کے سوز کو ساز اور

عورت کی بدصورتی کو حسن بخشتا ہے۔

مریم اسی طرح بھیڑوں کے گلے چرانے جاتی اور گھر کے کام کرتی۔ اگر کہیں کبھی گلی میں اس کا میرا آمنا سامنا ہو جاتا تو وہ شرمائے اور پلک جھپکائے بنا میرے پاس سے یوں گزر جاتی جیسے کبھی کی جان پہچان ہی نہ ہو۔ یہ بے حسی مجھے باوجود کہ میں شگونوں میں یقین نہیں رکھتا تھا بدشگونی لگتی۔ جوان لڑکیاں تو بیاہ کے نام سے شرما جاتی ہیں۔ سنا ہے کنواری لڑکیوں کی آنکھوں میں خواب تیرنے لگتے ہیں مگر مریم شاید ان سب سے مختلف تھی۔ میں وقت کے گزرنے کا منتظر تھا۔

آٹھ دن پہلے اونٹوں کے مہانوں سے بھٹکے کجاوے دور خال کے احاطے سے باہر بھوری ریت کے ٹیلوں اور سبز جھاڑیوں کے دامن میں آن کر اترنے لگے۔ نئے جوڑوں سے بھری تھلیاں گوپے کی چھت کے ساتھ لٹکنے لگی تھیں اور ہر آنے والے کے ساتھ ان میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ جھونپڑوں کی نئی قطاریں بوٹیں کے ڈھیروں کے فرش پر ابھرتی جاتی تھیں جیسے ایک نیا شہر آباد ہو رہا ہو۔ رات کو جوان نقارے بجاتے اور عورتیں گیت گاتیں۔ پانی کی فراوانی تھی۔ دودھ دہی کی نہریں بہہ رہی تھیں۔ سردار کی لڑکی امیر زادے سے بیاہی جانے والی تھی۔

عورتوں نے مانگ بھر کر دھڑی گوندھی تھی سرخی سہاگ سے ہونٹوں کو سجایا تھا کجے کی سیاہی آنکھوں میں دلآویزی سے کونوں تک پھیلی ہوتی۔ بالیوں سے جھکے کانوں میں پھول ہوتے۔ زیوروں سے بھرے گلے میں سے کرتے کے شیشے آنکھ مارتے اور موتیوں کی چمک سے دیکھنے والوں کی نگاہوں میں چکا چوند ہونے لگی۔ اونٹوں کے ٹخنوں پر بندھی جھانجھروں کی چھن چھن عورتوں کے پاؤں کی جھنکار کی طرح کانوں میں رس گھولتی۔ مرد ریشمی قمیض اور لنگیوں میں اکڑتے ہوئے چلتے۔ نرم نگاہوں والے لمبے تڑنگے رد چھیلے اپنے چاندی کے بٹنوں کی نمائش کرتے اور زنجیر میں لٹکتے گھنگرو عورتوں کی ناک میں پہننے والے کیل کی طرح دور سے چمکتے بازوبند باندھے وہ گلیوں میں گھومتے یا لوئی کے فرش پر پڑ کر سونے رہتے۔

رت جگے کی یہ راتیں خواب کی طرح مجھے آج بھی یاد آتی ہیں تو لگتا ہے وہ دنیا کوئی اور تھی جس میں میں کسی طلسم کے زور سے جا ابھرا تھا۔ یہ طلسم ہوشربا کی سی راتیں کہ پریوں کے جھرمٹ ہوتے روشنی ہوتی رنگ و نور ہوتا۔ میں ایک کونے میں مکھی کی طرح لگا تھا کہ اگر اس پری وش

کا جی چاہے گا تو اس سارے طوفان کے بعد مجھے اتار کر پھر آدمی کی صورت بنا لے گی۔

پیر تن اور گاری خاں دلہن کے گھر بھیجا جانے والا اسباب خرید کر لائے تھے اور اپنی علیحدہ دنیا بسانے، مجھ سے دور دور جانے کی صلاح مشورے کرتے تھے۔

سامنے والے گوپے کے سرے پر روز رنگین دھاگوں اور دھنک کے رنگوں کے کپڑوں سے سہرے اور شیشے لٹکائے جاتے تھے۔ بھاگ سہاگ کے شگون کے لئے آنے والی مہمان عورتیں بھی مٹھی میں پراتی اور دلفریب رنگوں میں رنگی دھاگوں سے انگل انگل سلی دلائیاں دیتیں پھندنے اور شیشے جڑے موتیوں سے چمکتے ہوئے یہ بچھونے مہمانوں کو بوئی پر بچھا کر دیئے جاتے۔ میں دم سادھے اکیلا ہی ٹیلوں سے پرے گھومتا رہتا۔ کبھی سنبل کا سامنا ہو جاتا تو کہتی

"سائیں مریم بری لڑکی نہیں۔ بیاہ کے بعد آپ کی زندگی کو جنت بنا دے گی آپ اداس کیوں رہتے ہیں؟"

بیلوں میں کچریاں۔ رسبھری، کھکھڑیاں لگنے لگی تھیں اور صحرا میں پھولوں کی آگ تھی پھول جو سرخ رنگ کے ہوتے اور سرِ شام چرچرانے والے سگڑوں کی آوازوں سے آباد ہوتے۔ پھول جن میں شہزادیاں قید نہ تھیں اور پیلو کے ساتوں رنگوں سے بچوں کے منہ رنگین رہتے۔ میری آنکھوں کے سامنے ناٹک ہو رہا تھا۔ اتنے سارے کھیل کھیلنے والے تھے صرف میں ہی اکیلا تماشائی تھا ایک سادھو کی سی آسودگی اور بے تعلقی سے بس یہ سب دیکھتا جانے اس کا انجام کیا ہو۔

ایک صبح جب میں طلوع ہوتے سورج کے روز ہونے مگر روز حیرت زدہ کرنے والے منظر کو دیکھتا ریشمی ریت کی بستی سے دور کے ایک ٹیلے پر لیٹا تھا اور سیال پارہ تھر تھراتا کانپتا آتش فشاں کے سامنے سے ہٹنے ہی والا تھا تو میں نے سنبل اور مریم کو دیکھا انہیں میرے وہاں ہونے کی خبر نہ تھی وہ دونوں باتیں کرتی ہوئی میرے قریب سے گزر گئیں۔ باتیں جن میں علینے کی بیماری کا ذکر تھا۔ مریم چپ تھی صرف سنبل بول رہی تھی۔

اگلا دن نکاح کا دن تھا۔ میں مریم سے ملنا چاہتا تھا۔ سارا دن میں اسے دیکھتا رہا وہ کاموں میں مگن تھی جیسے یہ بیاہ کسی اور کا ہو۔ جھٹ پٹے کے وقت جب چراغ جل رہے تھے اور نور خاں بیوی کے ساتھ بیٹھا ہر مسلمان کو گن گن کر روٹیاں اور تول کر حلوہ تقسیم کر رہا تھا۔

میں ٹوبے کی طرف گیا۔ کنڈیری کی جھاڑیوں میں جو ٹوبے کے کنارے تک جھکی ہوئی تھیں ڈیلوں
لگنے لگے تھے وقت کیسے گزرتا ہے۔

جب میں آیا تھا تو ہر طرف بے آباد بستیاں بے نور آنکھیں اور مرجھائے ہوئے چہرے
تھے۔ اور اب ہر طرف ہریالی پھول اور بہار تھی۔ یہ کنڈیری جو میرے خیال میں سوکھ چکی تھی پھولوں
سے سہاگن کی طرح سجی کھڑی تھی۔

سنبل اور مریم جب گھڑے بھر چکیں اور ٹوبے سے راہ کو لکڑی کے ڈنڈے سے بند
کر چکیں تو میں نے آگے بڑھ کر کہا سنبل۔ مجھے مریم سے کچھ پوچھنا ہے۔

سنبل ہنس کر کہنے لگی "سائیں بس کل کی بات بیچ میں ہے۔"

میں نے کہا سنبل یہ ہنسنے کی بات نہیں یہ بہت ضروری بات ہے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت
ہے۔ مریم نے سنبل سے کہا تم جاؤ اور راہ کی جھاڑیوں کے ساتھ میرا انتظار کرو۔

ہم دونوں وہ آگے اور میں پیچھے اس ٹوبے کے دروازے سے ذرا ہٹ کر جھاڑیوں کی طرف
چلنے لگے۔ اسکے ننگے پاؤں کے قدموں کی چاپ میں سن رہا تھا۔ اندھیرے کنجوں میں کرتی لالیوں کے
شور میں یہ آواز زیادہ واضح نہ ہوتی تھی۔ وہ جھنجھلا کر ٹھہر گئی میں بھی کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک جھاڑی
کی بلند ہوتی شاخ پہ ہاتھ ڈالے ٹیلے کے ڈھلوان پر ایسے ٹکی کھڑی تھی کہ لگتا تھا اگر ہوا کا ہلکا
سا جھونکا بھی آئے گا تو وہ گر جائے گی۔ اتنی خوبصورت اور ہلکی لگ رہی تھی جیسے کوئی چڑیا ہو
اس کی سیاہ آنکھوں میں گہرے ٹوبے کی طرح ٹھنڈک اور تاریکی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا میں اس
گہرائی میں ڈوب جاؤں مگر ان آنکھوں میں کچھ تھا جو میرے سوال کا ان کہا جواب تھا۔ چاہے میں
لاکھوں برس کوشش کرتا رہوں مریم مجھے قبول نہیں کرے گی۔ اس گھڑی مجھے معلوم ہو گیا کہ میری
تقدیر پر مہر لگ چکی ہے۔

وہ ہمہ تن سوال تھی رنگین دھاگے اور مہندی کے رنگ سے سرخ کلائی والے ہاتھ سے شاخ
چھوڑ دی۔ میں نے ڈھلوان کی دوسری طرف جاتے ہوئے کہا مریم مجھے تم سے کچھ نہیں کہنا تھا۔ تم
جاؤ۔ مہمان عورتیں تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی سنبل تمہاری راہ دیکھ رہی ہو گی۔ تم جاؤ۔

چیت بہار کا موسم تھا بستیاں آباد تھیں میں اور پیرن سر جھکائے تیزی سے شہر کی طرف

عادت ہے کتنے مجھے علیئے خاں کے مرنے کا غم کبھی نہیں تھا۔ مجھے مریم کے ناتے توڑ کر سر پہ خاک ڈال لینے کا بھی غم نہیں تھا۔ مجھے روپی کی گنوار لڑکی کے پاؤں تلے روندے جانے کا بھی غم نہیں تھا۔ بیاہ کے دن نکاح کی اس گھڑی جب میں گوپے میں ملگجے کپڑوں میں لپٹی مریم سے ملنے اور شادی کی رسمیں ادا کرنے گیا تھا اور باہر بلند خاں کی چیخ سنکر لوٹ آیا تھا لگا تھا جیسے کسی نے پھونک مار کر دیئے بجھا دیئے ہوں۔

حدِ نظر تک تب سے اب تک دیئے بجھتے ہی چلے گئے ہوں۔

ہمیں سامان لادتے ہوئے صرف گاری خاں نے کہا تھا سائیں زندگی میں آدمی اتنی دفعہ ٹوٹتا ہے اتنی دفعہ کہ پھر اسے ٹوٹنے کا رنج نہیں ہوتا وہ کرچیں سمیٹ کر ایک سے دوسری منزل کی طرف چلتا رہتا ہے۔ آدمی میں ٹوٹے ٹکڑوں کو جوڑنے کی ہمت آپ سے آپ آجاتی ہے۔

مجھے کسی شے کا غم نہیں تھا مگر میرے دل کے آسن پر ایک مورتی کی جگہ خالی ہو گئی تھی اور وہ مورتی میری اپنی تھی آج تک میں نے اپنے آپ کو چاہا تھا۔ اپنے آپ کو عظیم جانا تھا۔ دل کے مندر میں مورتی بھی آپ ہی تھا اور پجاری بھی میں آپ ہی۔ صرف مریم کی آنکھوں نے میرے دل کے اندر جھانکا تھا اور اسے معلوم تھا کہ وہاں اس کی کوئی جگہ نہ تھی۔

شہروں کی پرشور بارونق مصروف زندگی میں میں نے کوشش کی ہے کہ میں دوسروں سے محبت کروں۔ اپنے آپ سے لاتعلقی دراصل اپنے سے گہرے لگاؤ کی حامل رہی ہے۔ میں نے ایک بازی گر کی طرح اپنے آپ کو فن کار بنا لیا ہے یہاں تک کہ مجھ پر بھی میری شعبدہ بازیاں اثر نہیں کر سکیں۔ میں نے ٹوٹی ہوئی مورتی کی کرچیں جوڑ کر انہیں مختلف روپ دیئے ہیں پر آسن پر مندر میں وہی اکیلی مورتی رہی ہے ــــ "من پریم تپنجلی ہے"

کھڑکی میں سے روشنی آرہی ہے شاید پہاڑیوں کے پیچھے سورج بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا ہے نیچے کی وادیاں دھوپ سے روشن ہو رہی ہوں گی ابھی شیر دل آئے گا اور اسی محبت سے پوچھے گا۔

"بابا آپ نے رات خوب آرام سے گذاری"

میں صرف مسکرا دوں گا اسے یہ بتا نہ سکوں گا کہ رات میں نے کہاں گزاری ہے مگر رات جو زندگی کی باقی راتوں کی طرح گزر ہی گئی ہے۔

آتشِ رفتہ

مصنفہ :۔ جمیلہ ہاشمی

ضخامت :۔ ۱۶۷

قیمت :۔ چار روپے

ناشر :۔ اردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۲

میں نے اپنی بساط بھر اب تک جتنے بہترین ناول اور افسانے پڑھے ہیں۔ اُن میں سب سے اہم قدرِ مشترک یہ نظر آتی ہے کہ ایسی تمام تحریروں میں ایک زیریں طنز ہمیشہ اُبھرتا ہوا محسوس ہوا ہے۔ یہ طنز جس کو روحِ عصر بھی کہا جا سکتا ہے ایک ایسی قوت کی طرح کام کرتا ہے جو ہر اچھی تحریر اور ہر مصنّف کے وجود کا واحد جواز قرار دیا جا سکتا ہے۔ صرف لکھنا یا محض لکھنے کا پیشہ اختیار کرنا تو کسی تحریر کی تخلیقی ضمانت نہیں ہے۔ قلم کی مزدوری اور تخلیق میں کوئی وجہ مماثلت ممکن نہیں۔ کسی موضوع پر حقائق جمع کر دینا۔ کسی واقعہ کو بیان کر دینا۔ کسی خبر کو نقل کر دینا۔ کسی تقریر کو مرتب کر دینا۔ یا عوام کی خواہشات کے مطابق اطلاعات فراہم کر دینا تو ظاہر ہے کہ تخلیقی عمل نہیں کہلایا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ ایک تخلیقی جوہر کا اندازہ اور پرکھ تو ہمیں ہونی چاہئے۔ ایک حقیقی معنوں میں لکھنے والا اپنے بارے میں یہ احساس دلاتا ہے کہ وہ کیوں لکھ رہا ہے اور خود بھی اپنے وجود کا جواز تلاش کرتا نظر آتا ہے۔ جو ظاہر ہے کہ بیان بازی میں نظر نہیں آتا بلکہ یہ اس کا اپنا ذاتی تجربہ۔ نقطۂ نظر، طرزِ تحریر، چیزوں کو قبول یا رد کرنے کا معیار، ماضی اور روایت کو اپنے طور پر دیکھنے کا عمل اور اپنے عہد کا شعور سب مل کر ایک تخلیق اور اسلوب کا درجہ اختیار کر لیتا ہے۔ پھر اس پر مستزاد یہ کہ لکھنے والا اپنے سامنے بھی جواب دہ ہوتا ہے کہ وہ کیوں لکھ رہا ہے۔؟ یہی اس کا واحد جواز ہوتا ہے جس کی بنا پر وہ ایک نئی تخلیق کرتا ہے۔ یہ نئی تخلیق ایک نئی زندگی، ایک نئے معاشرہ، اور ایک نئے رویہ کو پیدا ہی اس لئے کرتا ہے کہ اسے زندگی کو اور

اپنے معاشرہ کو اس طرح قبول نہیں کیا ہے جس طرح اس عہد کے کروڑوں لوگوں نے کیا ہے۔ تخلیق میں یہی عمل طنز کو پیدا کرتا ہے۔ تمام اچھی تحریروں میں (جو طنز کے لئے نہیں لکھی جاتیں) زیرِ نفس یا دروںِ تحریر ایک نیا رنگ یا گہری اور دوہری کیفیت اسی لئے پیدا ہوتی ہے کہ اس میں فنکار کا اختلافی رویہ ہزار رنگوں میں جھلکتا رہتا ہے۔ اردو کے جدید ادب میں ایسی تحریریں بہت کم ہیں۔ البتہ اسکے بعد کی سطح پر چند ایسی تحریریں مل جاتی ہیں۔ جہاں طنز تو نہیں مگر ایک بے اطمینانی کی جھلک ضرور ملتی ہے۔ یہ بے اطمینانی چونکہ فنکار کا اپنا مسئلہ بھی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اپنے تجرباتی یا نفسی عمل سے خوف زدہ بھی ہوتا ہے اور حیرت زدہ بھی ــــ وہ اپنی زندگی اور معاشرہ کو اپنی خواہشات سے مختلف دیکھ کر دُکھ بھی اٹھاتا ہے۔ لہٰذا ایسی تحریروں میں ایک سوز، ایک غم کی اور المناکی کا اظہار ہوتا ہے جس میں معاشرہ۔ اقدار۔ تصورات اور فنکار کی شخصیت سب ہی بے اطمینانی اور المیہ کے تجربہ سے دوچار ہوتے ہیں۔ اردو میں ایسی بھی تحریریں بہت کم ہیں مگر پھر بھی اُن کی تعداد پہلی قسم کی تحریروں کے مقابلے پر غنیمت ہے۔

جمیلہ ہاشمی کے ناولٹ "آتشِ رفتہ" کا شمار اسی دوسری قسم کی تحریروں میں کیا جا سکتا ہے جس میں اقدار۔ قدیم روایات اور زندگی کے صدیوں پرانے اور آزمائے ہوئے آثار ایک المیہ سے دوچار ہوتے ہیں ــــ اور اس ٹکراؤ سے زندگی کا نیا شعور پیدا کرتے ہیں۔ مگر یہ نیا شعور یا نئی تبدیلی دُکھ بھوگنے کا عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمیلہ ہاشمی نے کرداروں کو سطحی بہاؤ پر نہیں چھوڑا ہے۔ بلکہ اِن کرداروں میں اسی کشمکش ٹکراؤ اور تضاد کو ارتقائی عمل کے ساتھ اپنا المیہ پورا کرتے ہوئے دکھایا ہے۔ "آتشِ رفتہ" میں پورے ناولٹ کے پس منظر میں ایک المناک فضا کا احساس اس لئے ہوتا ہے۔ کہ اس کے تمام کردار اپنے معاشرے سے الگ ہو کر زندہ ہی نہیں رہ سکتے۔ اپنی روایت سے علیحدہ اُن کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

جمیلہ ہاشمی کا اسلوب البتہ آتشِ رفتہ میں اتنا نکھرا ہوا نہیں ہے۔ جتنا ان کے بعد کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔ آتشِ رفتہ کا اسلوب غالباً ان کا پہلا تجربہ ہے۔ وہ اپنے ذہنی سفر

اور اپنی ذہنی دنیا اور تخلیق کے اس کرب میں اس طرح شریک نظر آتی ہیں کہ زبان لکنت کھانے لگتی ہے اسی لئے اُن کی آتش رفتہ کی تحریر کہیں کہیں بوجھل اور کرب کی گنگ کیفیت میں گھٹن ہو گئی ہے۔ جب کہ بعد کی تحریروں میں یہ عمل اب اُن کا ایسا شعوری عمل بن گیا ہے کہ وہ ایک نئے شعور اور فلسفہ کا اظہار کرنے میں خود اعتماد ہو گیا ہے۔

" آتش رفتہ " کا شمار یقیناً اردو کے چند اچھے مختصر ناولوں میں کیا جا سکتا ہے اور ایسی تحریروں میں وہ ہمیشہ قابلِ ذکر رہے گا جو اچھی تخلیقات کے لئے دوسرے درجہ کی خوبی شمار ہوتا رہا ہے۔ میرا مطلب دوسرے درجے کی اچھی تخلیقات سے ہے۔ اردو ادب میں وہ اپنے اسلوب اور اپنے المیہ طرزِ احساس کی بنا پر ہمیشہ تر و تازہ رہے گا۔ اور یہ کوئی معمولی بات نہیں

شمیم احمد

دشتِ امکاں

مصنف :۔ عزیز حامد مدنی
صفحات :۔ ۱۴۷
قیمت :۔ ۶ روپے
ناشر :۔ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱

مادہ کی ساخت، ارضی سطح پر بکھری ہوئی اشیا کا نظام، ان کا حجم، ان کی توانائی، تبدیلی ہیئت اور ان کی محدود مقناطیسی طاقتیں، ان کی تقسیم اور ان کی کیمیائی خصوصیت از خود زندگی کے ارتقا کی ضامن ہیں۔ یہ باتیں ہر شعبۂ فکر کے سوچنے والوں نے مان لی ہیں۔ اس پسِ منظر میں آدمی کی شخصیت کے نئے معنی پیدا ہو گئے۔ نئے آدمی کی دنیا بیم و رجا کے ایک نظام شمسی سے دست و گریباں ہے۔ ایک طرف آگہی اور اسکی ہمہ شیوہ جراتیں ہیں انسانی عقل کہاں تک آزاد ہے اور کتنی پابند ہے۔ کہاں تک صالح، کہاں تک بے راہ رو۔ اس کی کسوٹی تاریخ نے ہمیشہ کچھ اخلاقی تہذیبی اقدار کو رکھا ہے۔ سائنس اور ٹیکنولوجی کے اس

معاصر ادب
ادبی تنقیدی و فکری مضامین کا مجموعہ
ڈاکٹر جمیل جالبی

معاصر ادب

ادبی تنقیدی و فکری مضامین کا مجموعہ

ڈاکٹر جمیل جالبی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

Moasir-e-Adab

By

Jameel Jalibi

1996

Price Rs. 250/=

I S B N : 81-86232-32-X

سنہ اشاعت ______ ۱۹۹۶ء

قیمت ______ ۲۵۰/- روپے

مطبع ______ عفیف پرنٹرس لال کنواں، دہلی-۱۱۰۰۰۶

Educational Publishing House

3191 Gali Azizuddin Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan,

Delhi-110006. Tel. : 526162, 7774965,

فہرست

جمیلہ ہاشمی کے دوناول

(۱)

جمیلہ ہاشمی کا یہ ناول "چہرہ بہ چہرہ روبہ رو" ایک ایسی کتاب ہے جسے ہم سب کو پڑھنا چاہیئے۔ جمیلہ ہاشمی نے اپنے اس ناول میں ایک ایسی متنازعہ لیکن عظیم ہستی کو موضوع بنایا ہے جس کا نام آج تک خود ایک افسانہ ہے۔ ام سلمیٰ، جسے ہم قرۃ العین طاہرہ کے نام سے جانتے ہیں، ایک ایسی بے قرار روح کی مالک تھی جس کے پاس دل بھی بڑا تھا اور دماغ بھی، جو حق کی تلاش میں ساری زندگی سرگرداں رہی اور حق کی تلاش ہی میں جان دے دی۔ حق ہی اس کا محبوب تھا جس کے غمِ ہجر میں وہ ساری عمر تڑپتی رہی۔ آنکھیں جب محبوب کو دیکھنا چاہیں تو پھر کسی اور کو دیکھنے کی تمنا نہیں کرتیں۔ اُس نے رسم پرست معاشرے میں ایک عورت ہوتے ہوئے بھی وہ کام کیا جو ایرانی معاشرے میں اس وقت بہت دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ اس نے فرسودہ قدروں کو تشکیک کی نظر سے دیکھا اور انھیں سوال بنا کر معاشرے کے شعور کو بیدار کر دیا۔ جب اپنی خادمہ ہانی کو قریب بُلا کر اُس نے کہا:

"تم نے کبھی خدا کو دیکھا ہے؟" تو خادمہ کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

قرۃ العین طاہرہ نے پھر کہا — "تم یہ سوچتی ہو کہ خدا کو نہیں دیکھ سکتیں، جو ہر شے میں جاری و ساری ہے، جو سب جگہ موجود ہے۔"

اور جب ہانی نے یہ سُنا تو کہا — "آقازادی! اگر خدا ہر شے کے اندر موجود ہے تو

میرے اندر بھی موجود ہو گا۔"

قرۃ العین طاہرہ نے پھر کہا۔ "کیا تم نے اس سے پہلے محسوس نہیں کیا کہ خدا تمہارے اندر موجود ہے۔ تم خدا کا ایک حصّہ ہو۔"

ہانی نے دیوانوں کی طرح جواب دیا۔ "نہیں بخدا آقازادی نہیں۔ میں یہ سوچنے کی جرأت کیسے کر سکتی ہوں۔ میں اتنا بڑا بوجھ کیسے اٹھا سکتی ہوں۔ میں تو صرف ہانی ہوں۔ ایک خادمہ، میرے اندر بھلا خدا کیسے اُتر سکتا ہے۔"

یہ سُن کر وہ دھم سے گر پڑی اور پھر کبھی نہ اٹھی۔ سچائی کا یہی وہ تصور تھا جو قرۃ العین طاہرہ کا بنیادی مسئلہ تھا اور جسے وہ دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلا دینا چاہتی تھی۔ قرۃ العین اسی نئے شعور کی علامت تھی اور یہی نیا شعور قرۃ العین کے مہدیٔ موعود کا ظہور تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پورا ایران ہزار سال گذر چکنے کے بعد امام غائب کے ظہور میں آنے کی پیشین گوئی کا انتظار کر رہا تھا۔ قاچاری سلطنت زیروزبر تھی اور ایران کی روح خود کو دریافت کرنے کے لیے بے چین تھی۔ قرۃ العین طاہرہ نے اس روح کو علی محمد باب کے روپ میں دیکھا۔ حکم ہوا۔ "اٹھو اور جو کچھ تم نے دیکھا ہے اسے لوگوں کو دکھا دو۔" اُس نے سوچا کہ اب سیاہ رات کا سویرا ہو گیا ہے۔ باب کا مذہب ایران کا اپنا مذہب تھا۔ اپنی وحیٔ اپنے قوانین۔ اُس نے قرآن کریم کو اعراب سے آزاد کر دیا تھا۔ طاہرہ قائم آلِ محمد کی تلاش میں بہت دور نکل آئی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ وہ کسی بڑے مقصد کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ یہ خداداد ذہانت اُسے یونہی نہیں ملی ہے۔ وہ ایران کے بے عمل، جامد معاشرے کو دلائلِ عقلی کی روشنی سے متحرک کر دینا چاہتی تھی۔ وہ ساری عمر اسی نئے شعور کے ساتھ زندہ رہی اور اسی شعور کا تخم سرزمینِ ایران میں بو کر فنا ہو گئی۔

جمیلہ ہاشمی نے اسی عظیم عورت کی زندگی اور فکر و فلسفہ کو اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے جو امِ سلمٰی سے قرۃ العین بنی۔ قرۃ العین سے طاہرہ بنی۔ طاہرہ سے زرین تاج بنی اور پھر امِ العالم بن گئی۔ اس موضوع پر یہ اردو زبان میں پہلا ناول ہے۔ عزیز احمد مرحوم نے قرۃ العین طاہرہ کو موضوع بنا کر "زرین تاج" کے نام سے ایک خوب صورت افسانہ لکھا تھا جو آج بھی اردو

کے بہترین افسانوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس صدی کے اوائل میں مولانا عبدالحلیم شرر نے حسن بن صباح کی تحریک کو موضوع بنا کر اپنا ناول "فردوسِ بریں" لکھا تھا جو آج بھی اردو کے اچھے ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ "تاریخ" انسانی فکر، جدوجہد اور شعور و عمل کا وہ خزینہ ہے جس سے سینکڑوں ناولوں کے تار و پود بُنے جا سکتے ہیں۔ جس سے ہم اپنے حال کو ماضی کی روشنی سے منور کر سکتے ہیں۔ عزیز احمد نے "زرّیں تاج" اور "جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں" لکھ کر ہمارے دور میں جدید تاریخی ناول لکھنے کی بنا ڈالی تھی۔ جمیلہ ہاشمی نے اس روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ اب دیکھیں ہمارے نئے لکھنے والے تاریخ کو اپنے دور کے حوالے سے کیسے دیکھتے ہیں اور کیسے اپنے نئے ناولوں میں سموتے ہیں۔ مریضانہ ذہن کی رومانیت کا زمانہ گذر گیا۔ اب ہمارے تخلیقی فن کاروں کو چاہیئے کہ وہ بیمار ناول نویسی کی موجودہ روش کے اس جذباتی دلدل والے دائرے کو توڑ کر باہر نکلیں اور اردو میں محنت و انہماک سے تاریخی ناول لکھنے کے ایسے نئے دور کا آغاز کریں جس میں ایک طرف ماضی حال سے آملے اور دوسری طرف ہمیں زندگی کا نیا شعور بھی ملے۔ ایسا شعور جو ہمیں ذہنی سطح پر نئے سفروں پر اکساتے اور ہم اَن جانی دنیاؤں کو دریافت کرنے پر تُلے کھڑے ہوں۔ ہماری روح اس سفر کے لیے بے چین ہے۔ ہمارے ناول نگار اور ادیب و شاعر اس روح کو نئے سفر کا راستہ دکھا سکتے ہیں۔ ناول اس کام کے لیے سب اہم اور بڑا میڈیم ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ جمیلہ ہاشمی ہمارے لکھنے والوں میں وہ پہلی خاتون ہیں جنہوں نے تاریخ کے حوالے سے اس سفر کا آغاز کر کے ذہن انسانی کے نہاں خانوں میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں وہ لگن ہے جو لکھنے والے کو ہر دم نئے سفر پر آمادہ رکھتی ہے۔ سفر حرکت کی علامت ہے۔ اَن جانی دنیاؤں کو جاننے کی خواہش کا نام ہے۔ تخلیقی زندگی کا استعارہ ہے۔ مجھے یاد ہے کہ آج سے بائیس سال پہلے ان کا پہلا افسانہ جب ہفت روزہ "لیل و نہار" میں شائع ہوا تھا تو وہ افسانہ مجھے اچھا لگا تھا۔ اس کے بعد ان کے کئی افسانے لیل و نہار میں چھپے اور وہ سب کے سب مجھے اچھے لگے تھے۔ ۱۹۵۸ء میں "داستان گو" لاہور میں ان کا وہ ناولٹ چھپا جسے آج ہم "آتشِ رفتہ" کے نام سے جانتے ہیں اور جو اردو کے

چند اچھے ناولٹوں میں شمار ہوتا ہے۔ ۱۹۶۱ء میں ان کا ناول "تلاشِ بہاراں" چھپا، جس پر انھیں "آدم جی انعام" ملا۔ اس عرصے میں انھوں نے بہت سی کہانیاں لکھیں جن میں سے بیشتر "نیا دور" کراچی میں چھپیں، اور جو آج بھی پڑھنے والوں کے ذہن میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے بیشتر کہانیاں ان کے مجموعے "آپ بیتی جگ بیتی" میں شامل ہیں۔ پھر انھوں نے ایک ایسے موضوع پر ایک ناولٹ "روہی" کے نام سے لکھا جو اس سے پہلے برصغیر کی کسی زبان میں موضوع ادب نہیں بنا تھا۔ ہمارے ملکِ عزیز کے اُس لق و دق صحرا کی کہانی، جسے ہم چولستان کے نام سے جانتے ہیں اور جو جغرافیائی اعتبار سے بہاول پور کا حصّہ ہے۔ اس کے بعد جمیلہ ہاشمی نے تین اور ناولٹ لکھے جو ۱۹۷۴ء میں "اپنا اپنا جہنم" کے نام سے کتابی صورت میں شایع ہوئے۔ جمیلہ ہاشمی کے لکھنے کا اپنا انداز ہے۔ ایک اچھے فن کار کی طرح انسان اور انسانی رشتوں اور چیزوں کو دیکھنے کا اپنا ڈھنگ ہے۔ ان کے اسلوب پر "جوزف کونرڈ" کا گہرا اثر ہے۔ اب وہ "چہرہ بہ چہرہ روبرو" لے کر آئی ہیں۔ ان جانی چیزوں کو جاننا اُن کا مزاج ہے۔ آج کل وہ منصور حلاج کی زندگی اور فلسفہ و تصوّف کو اس لیے پڑھ رہی ہیں تاکہ وہ افسانۂ منصور کو ازسرِنو تازہ کر سکیں۔ جمیلہ ہاشمی کا سفر جاری ہے۔ وہ سفر جو فانی انسان کو لافانی بنا دیتا ہے۔

جمیلہ ہاشمی کا تخلیقی مزاج یہ ہے کہ وہ "اسرار" تک تو جا پہنچتی ہیں لیکن اس کا پردہ چاک نہیں کرتیں۔ ان کی روح میں شاعری ہے اسی لیے حقیقت ان کے ہاں افسانہ بن جاتی ہے۔ "چہرہ بہ چہرہ روبرو" میں داستان گو نے تاریخ اور اس کے واقعات سے انحراف نہ کرنے کے باوجود تاریخ کو افسانہ بنا دیا ہے۔ یہ کوئی ایسا رومانی معاشرتی ناول نہیں ہے جس میں موٹر سائیکل کی روانی، کار کی تیز رفتاری اور ہوائی جہازوں کا شور ہو بلکہ یہ ایران کی تاریخ کے اس دور کی کہانی ہے جب ایران کا سیاسی استحکام زوال پذیر تھا اور ایران کو ایک ایسی فکر کی ضرورت تھی جو اُسے دوبارہ متحرک کر کے فرسودہ اقدار کی شدید گرفت سے آزاد کرا سکے۔ جب مذہب محض ایک رسم بن جائے اور اس میں زندگی کو آگے بڑھانے کی قوت باقی نہ رہے۔ عدل و انصاف ختم ہو جائے، جبر و استحصال

کے بوجھ سے عوام کی کمر ٹوٹنے لگے تو ایسے میں علی محمد باب اور بہاء اللہ جیسے کردار تاریخ کے اسٹیج پر ظاہر ہوتے ہیں جو رسم پرست معاشرے کے ہاتھوں خود تو فنا ہو جاتے ہیں۔ لیکن مذہب کی رسم پرستی کا بُت پاش پاش کر جاتے ہیں۔ جمیلہ ہاشمی نے اس ناول کو محنت اور لگن سے لکھا ہے۔ یہ ایک مشکل ناول ہے جسے پڑھنے کے لیے آپ کو بھی محنت کرنی پڑے گی۔ وہ لوگ جو محنت سے بھاگتے ہیں اور چیزوں کو محنت سے دریافت کرنے اور جاننے کے عادی نہیں ہوتے انھیں اس ناول کے بجائے اُن لحیم شحیم ناولوں کو پڑھنا چاہیئے جو محض صفحے پلٹنے سے سمجھ میں آجاتے ہیں اور جو عام طور پر تاجرانِ کتب کے ہاں مل جاتے ہیں۔

"چہرہ بہ چہرہ روبرو" کی نثر کے بارے میں بھی ایک بات کہتا چلوں۔ اس ناول کے بعض حصے خوب صورت نثر کے نمونے ہیں جن میں مصنفہ کی باطنی کیفیت نے فکر و احساس کو ایسے اُجاگر کیا ہے کہ ایک جان دار تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ مثلاً یہ چند جملے سُنیے:

"سماوار کے قریب بیٹھ کر تپش سے وجود سکون پاتا ہے۔ روح غم انگیز واقعات کو بُھلا دیتی ہے۔ دل کاروبارِ حیات میں پھر خوشی تلاش کر لیتا ہے کیوں کہ وقت بڑے سے بڑا زخم مندمل کر دیتا ہے۔ ہاں زخم بھر جاتے ہیں مگر چٹان ٹوٹ جائے تو پہاڑ کا وہ حصہ اسی طرح بدنما لگتا رہتا ہے اور اُسے صدیاں اور قرنیں بھی درست نہیں کر پاتیں۔" (ص ۱۰)

اب اس سے بالکل مختلف مزاج کے یہ چند جملے سُنیے:

"قومیں صفحۂ ہستی سے ناپید ہوئیں اور خود اُن پر اُن کی بستیاں الٹائی گئیں۔ طوفان بھیجے گئے۔ زمین و آسمان میں کہیں امان نہ ملی۔ خوارزم شاہی سلطنت تباہ ہوئی اور یاجوج ماجوج کی قوم نے مشرق سے نکل کر ساری بادشاہتوں کو اُلٹ دیا۔ بغداد ایک قصہ، داستان بن گیا۔ کیا یہ عبرت کافی نہیں۔ اسپین کی مسجدیں مرثیہ خوانی کو باقی رہ گئیں۔ مگر اولادِ آدم کسی دوسرے کے قصے سے سبق نہیں سیکھتی۔ وہ تو یہ چاہتی ہے کہ سب کچھ اس پر بیتے اُس پر گذرے۔ ہر زمانے کے سبق اس کے اپنے پیدا کردہ ہونے چاہئیں۔" (ص ۶۵)

اس نثر میں ایک دوسرے سے مختلف قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ایک پر احساس حاوی ہے۔ دوسرے میں تاریخ کو ایک دائرے میں سمیٹ کر یک جا کر دیا ہے۔ لیکن جمیلہ ہاشمی کے مزاج نے ان دونوں میں اپنے اندازِ نظر سے ایک ایسی خوش گوار ہم آہنگی پیدا کر دی ہے جس سے اندازِ بیان مؤثر اور تاثر گہرا ہو گیا ہے۔

اسی طرح اس ناول میں جا بجا مناجاتیں آتی ہیں۔ یہ سب مناجاتیں خود جمیلہ ہاشمی کی تخلیق ہیں جو ایک طرف ناول کے تاثر کو اُبھارتی ہیں اور دوسری طرف آج کی زبان میں انھیں "نثری نظمیں" بھی کہا جا سکتا ہے۔

(۱۰ مئی ۱۹۷۹ء)

(۲)

آج جمیلہ ہاشمی اردو والوں کے لیے ایک ایسا نام ہے جس نے اردو فکشن میں اعتبار کا درجہ پا لیا ہے۔ وہ اعتبار جو اچھا اور مسلسل لکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ ادب جمیلہ ہاشمی کے لیے تعلقاتِ عامہ، آرائشِ محفل یا حصولِ شہرت کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ زندگی کا وہ خواب ہے جس کی تعبیر اُن کی کہانیاں ہیں۔ وہ کہانیاں جو زندگی کے باطن میں چھپی ہوئی ہیں اور صرف اُن کو نظر آتی ہیں جو زندگی کے آئینے میں اپنے تجربوں اور محسوسات کی جھلک اس طرح دیکھتے ہیں جیسے دولہا دلہن آرسی مصحف میں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ یہی جمیلہ ہاشمی کا تخلیقی عمل ہے جس میں اندھیارے اُجالوں میں اور روشنی ظلمت میں مل کر ایسے رنگ بناتے ہیں جن میں روشنی تاریکی کو اور اجالا اندھیارے کو بدل دیتے ہیں۔ اسی تخلیقی عمل سے وہ نغمہ پھوٹتا ہے جو جمیلہ ہاشمی کی نثر کو نور ظہور کے تڑکے کا سارنگ اور سماں عطا کرتا ہے۔ یہ رنگ اور سماں ان کی نثر کو ایک ایسی نغمگی دیتا ہے جو اس دور کے دوسرے لکھنے والوں میں کبھی کبھار اور کم کم نظر آتی ہے۔ جمیلہ ہاشمی کی نثر میں یہ بات مجھے

بھی ان کی نثر کا مرغِ چمن مجھے نغموں پر اکسانے لگا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ بات کو کیسے لکھوں تو میری نظر اس کتاب کے عنوان پر پڑی جس کی ذیلی سرخی "حسین بن منصور حلاج ۔۔ ایک غنائیہ" ہے اور اس کے تین حصوں کے نام ۔ صدائے ساز، نغمۂ شوق اور زمزمۂ موت ہیں۔ یہ عنوانات جمیلہ ہاشمی نے اپنے تخلیقی مزاج اور اپنے احساسات کی مناسبت سے رکھے ہیں۔ ان سب میں نغمۂ و ساز مشترک ہیں۔ اسی مزاج نے جمیلہ ہاشمی کی نثر کو ایک ایسا رنگ دیا ہے جس میں نغمہ شامل ہے اور ایک ایسا روپ دیا ہے جو ساز کی صدا سے دمک اُٹھتا ہے۔

خواتین و حضرات! ہمارے دور میں اچھی نثر لکھنے کا شوق ماند پڑ گیا ہے اور وا ماندگیِ شوق نئی نئی پناہیں تراشتی ہے۔ جمیلہ ہاشمی کی نثر اپنی مدُھر لَے اور اپنی دھیمی سُروں والی نغمگی سے مسحور کرتی ہے۔ اُن کے ہاں روکھی پھیکی حقیقت نگاری والی نثر نہیں ملتی بلکہ نغمے میں رچی ہوئی وہ نثر ملتی ہے جس میں شاعری کی روح نثر کے قالب میں اُتر کر زندگی کی نوید دیتی ہے اور عشق کا احساس اور اس احساس سے پیدا ہونے والا شعور مزرعِ گلاب بن کر اُن پگڈنڈیوں پر لے جاتا ہے جہاں منصور حلاج کی طرح عشق کی نشانیاں، توفیق اور رہبانیاں مہجوریوں کی منزل سے دور لے جا کر انا الحق سے قریب کر دیتی ہیں اور عاشقوں کے قبیلے باوضو ہو جاتے ہیں۔ منصور حلاج نے کہا تھا: "عشق ہی مزرعِ گلاب ہے اور عشق ہی مزرعِ زندگی ہے"۔ اور اسی سے جمیلہ ہاشمی کی تخلیقی قوت کا خمیر اُٹھتا ہے اور ایک ایسی نثر کو وجود بخشتا ہے جو پڑھنے والے کو سرشاری کی کیفیت میں لے جاتا ہے۔

خواتین و حضرات! میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ دونوں وقت مل چکے ہیں۔ میں تو یہ بات کہہ کر آپ کی توجہ جمیلہ ہاشمی کی نثر کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ وہ نثر جس کی کھیتی ہمارے دور میں سوکھ رہی ہے اور جس کی آبیاری پھر سے ہماری نئی نسل کو کرنی ہے۔ اس نثر کو محسوس کرنے کے لیے میں آپ کو چند جملے پڑھ کر سناتا ہوں۔ آپ اسے سنیے اور دیکھیے کہ اس نثر کی خوشبو دوسری حقیقت نگاری والی نثر کی خوشبو سے کتنی مختلف ہے۔

"مسجد کا صحن نمازیوں سے پُر تھا اور میناروں پر ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں گلرنگ روشنی سے دھندلے سفید اُجالے میں اور پھر دھواں دھواں نیلے اندھیرے میں بدل رہی تھیں۔ موذن نے اپنی جگہ سنبھالنے کے لیے پہلی سیڑھی پر قدم دھرا، وضو خانوں میں پانی رواں ہونے کی صدائیں آئیں، کاروانوں کے سالار اونٹوں کو رد کے رکھنے کا حکم دے کر ساربانوں کی معیت میں دالان در دالان اونچی چھتوں سے مزین صحنوں میں داخل ہوئے۔ لوگ درود وسلام میں منہمک اور پھر خاموش ہو گئے۔ اذان کا جلال آسمانوں اور زمینوں پر منکشف ہوا۔ اونچے ایوان سبزہ زار اور باغوں سے گھری بستی میں یہ مشکبو گونج ہوا کے ساتھ ساری پستیوں اور بلندیوں پر جاری وساری بلند ہوئی۔

درویشوں کی ایک ٹکڑی اپنے فرغلوں کو سنبھالتی ہاتھوں سے کُلاہ تھامے ایک اندازِ مستانہ سے چلتی اپنے نعروں کے خروش کو اپنے سینوں میں دبائے ملحقہ خانقاہ سے آکر نمازیوں کی صفوں میں شامل ہو گئی۔ یہ غیاب وحضور کی کیفیت سے سرشار عجیب لوگ تھے کہ جب سجدے کے لیے جُھکتے تو اُٹھیں اٹھنے کا ہوش نہ رہتا۔ جب اٹھتے تو امام کی آواز سُنائی دینے کے باوجود کھڑے رہتے۔ یہ کیسی نماز میں سرشار تھے؟

نمازی اندر ہی اندر پیچ وتاب کھا رہے تھے، جب انھیں نماز کا ہوش نہیں تھا تو یہ جماعت میں کیوں شامل ہوئے تھے؟ آج سے پہلے ایسی کسی جماعت نے نماز میں شرکت نہ کی تھی جو امام کے پیچھے اپنی الگ نماز میں مشغول ہو۔ خانقاہ میں یہ کہاں سے وارد

اس نثر میں آہستہ پن ہے نغمگی ہے اونچی لے میں نرم آواز رس گھولتی ہے۔ اس میں تخیل سے جان دار تصویریں بنانے کی قوت موجود ہے۔ یہ تخلیقی نثر ہے۔ جمیلہ ہاشمی فکشن نگاروں کی جدید نسل میں اسی لیے امتیاز رکھتی ہیں۔

(۳ر جنوری ۱۹۸۳ء)

جمیلہ ہاشمی کے آخری لمحات

۱۷ر نومبر ۱۹۲۹ء کو گوجرہ میں پیدا ہونے والی جمیلہ ہاشمی ۱۰ر جنوری ۱۹۸۸ء کو لاہور میں وفات پا گئیں۔ یہ سب کچھ یوں اچانک ہوا کہ قضا و قدر کی اس سفاکی پر یقین نہیں آتا، جیسے مرنا نہ ہو چیل جھپٹا ہو۔ چیل آئی اور زندگی کے ہاتھوں سے، جھپٹا مار کر، جمیلہ ہاشمی کو ابد کی فضاؤں میں اڑا کر لے گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

یہ ۱۹۵۷ء کی بات ہے کہ ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور میں ایک مختصر سی کہانی چھپی۔ کہانی کا نام تھا "دو خط"۔ پڑھی تو اچھی لگی۔ اس کے بعد اور کئی کہانیاں اس افسانہ نگار کی پڑھیں اور وہ بھی اچھی لگیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اردو افسانے میں نیا اور تازہ خون شامل ہو رہا ہے۔ جب بھی جمیلہ ہاشمی کی کوئی کہانی چھپتی میں شوق سے پڑھتا۔

۱۹۵۹ء کے دسمبر کی آخری تاریخیں تھیں اور نئے سال کا سورج نئی امنگوں اور ولولوں کے ساتھ طلوع ہونے کے لیے تیار تھا۔ انھیں تاریخوں میں کراچی میں رائٹرز کنونشن ہوا۔ اس وقت کراچی متحدہ پاکستان کا دارالحکومت تھا اور مشرقی پاکستان ہمارے جسمِ قومی میں دل کی طرح دھڑکتا تھا۔ ادیبوں کے اس کنونشن کے سلسلے میں میرے اور قرۃ العین حیدر کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ بعض ادیبوں کو کراچی اسٹیشن سے لا کر انھیں ان کی قیام گاہ تک پہنچایا جائے۔ اس زمانے میں ہوائی جہاز کا سفر اتنا عام نہیں ہوا تھا۔ ریل ہی وہ تیز رفتار سواری تھی جو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتی تھی۔ ہوائی جہاز کے سفر کا مزا اور اخبارات میں بیان چھپوانے کا چسکہ ابھی نہیں پڑا تھا اور

تعلقات عامہ کے دفاتر بھی نہیں کھلے تھے۔ اُس زمانے کا ادیب آج کے ادیب کے مقابلے میں یقیناً پسماندہ تھا۔ وہ زیادہ پڑھتا تھا اور زیادہ بحث کرتا تھا اور حیات و کائنات، سماج اور زندگی کے مسائل پر ایسے غور کرتا تھا جیسے یہ اُس کے اپنے مسائل ہوں اور انھیں سُلجھانا اس کی اپنی ذاتی ذمہ داری ہو۔ میں اور عینی بیگم (قرۃ العین حیدر کو ہم سب اسی نام سے پکارتے تھے) اسٹیشن گئے اور چند ادیبوں کو ان کی قیام گاہ تک پہنچادیا۔ انھیں ادیبوں میں سفید گرم چادر لپیٹے ایک صحت مند نوجوان سی لڑکی بھی تھی۔ تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ وہی خاتون ہیں جن کے افسانے میں نے "لیل و نہار" میں پڑھے تھے۔ نام جس نے آج ساری اردو دنیا میں مسلسل اور اچھا لکھنے سے اعتبار کا درجہ پالیا ہے، جمیلہ ہاشمی تھا، اسے نام کی مناسبت کہیے یا تذکیر و تانیث کی مطابقت۔ اس دن سے مرنے کے دن تک، دوستی و خلوص کا رشتہ ماہ و سال کی گردش سے بے نیاز ہو کر قائم رہا۔ آج یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ رشتہ سدا سے تھا اور سدا رہے گا۔ جمیلہ ہاشمی کا نام نیا دور کراچی کی مجلسِ ادارت کی آج تک زینت ہے۔

ابھی پچھلے دنوں جمیلہ ہاشمی ۸ر دسمبر ۱۹۸۷ء کو، میری بیٹی فرح کی شادی میں شرکت کے لیے، کراچی آئی تھیں اور ۱۷ر دسمبر ۱۹۸۷ء کو ان سے میری آخری ملاقات ہوئی تھی جب وہ شادی کی تقریبات سے نمٹ کر اپنی بیٹی عاشی کے ساتھ اپنے گاؤں خانقاہ شریف جارہی تھیں۔ ان دس دنوں میں وہ خوش و خرم رہیں۔ لڑکیوں کے ساتھ گانے بجانے میں شریک ہوئیں۔ مہندی میں آئی گئیں۔ ولیمے میں شرکت کی۔ پرہیز بھی کیا۔ بدپرہیزی بھی۔ پرہیز میری مرّوت میں اور بدپرہیزی اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر۔ میں شاید واحد آدمی تھا جس کا وہ لحاظ کرتی تھیں۔ ایسا لحاظ جیسا بہنیں بھائیوں کا کرتی ہیں۔ وہ ذیابیطس کی مریض تھیں۔ میٹھا کھارہی ہوتیں تو مجھے دیکھ کر پلیٹ دور کر دیتیں۔ جس دن بدپرہیزی کا ارادہ ہوتا اور نیت ڈانواڈول ہوتی تو میرے ساتھ کھانا نہ کھاتیں۔ جمیل صاحب! میں نے ناشتہ دیر سے کیا ہے۔ میں بعد میں ٹھہر کر کھاؤں گی۔ جب لاہور یا خانقاہ شریف سے آتیں تو میرے سب بہن بھائیوں سے ملتیں۔ میری بیوی کی تو ایسی گرویدہ تھیں کہ تعریف

کرتے کرتے زبان سُوکھ جاتی۔ اپنی بیماری کا کبھی ذکر نہ کرتیں۔ جمیلہ بی کیسی ہیں آپ۔ میں
پوچھتا۔ اچھی ہوں جمیل صاحب۔ نیا ناول شروع کر دیا ہے۔ موضوع فوراً بدل جاتا اور
مسلم اسپین کی تاریخِ پارینہ کا قصّہ چھڑ جاتا جس پر وہ اپنا نیا ناول لکھنے کی تیاری گذشتہ
دو سال سے کر رہی تھیں۔ جمیل صاحب! یہ ناول آپ کو پسند آئے گا اور اس بار آپ
مجھ سے ضرور کہیں گے: جمیلہ بی! یہ وہ تحریر ہے جس کا مجھے انتظار تھا۔ میں بھی جمیلہ
بی سے بہت توقعات رکھتا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ ایسے ناول یا افسانے لکھیں کہ زندگی
ہی میں کلاسیک بن جائیں۔ آج جب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں میں اعتماد سے
کہہ سکتا ہوں کہ جمیلہ ہاشمی نے اردو ادب کو ایسی کہانیاں، ناولٹ اور ناول دیے ہیں کہ
اُن کا نام تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ آتشِ رفتہ، روہی اور دشتِ سُوس
وہ ادب پارے ہیں جو آنے والے زمانوں میں بھی تازہ و زندہ رہیں گے۔

۱۹۷۹ء میں میری بیوی اور جمیلہ ہاشمی نے حج کا پروگرام بنایا۔ طے پایا کہ میں اور
میری بیوی کراچی سے جدّہ ہوتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچیں گے اور جمیلہ ہاشمی اور اُن کے
میاں سردار احمد اویسی لندن سے جدہ ہوتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچیں گے اور ہم سب ۱۸ر
اکتوبر کو معلم کے یہاں ملیں گے۔ ۱۸ر اکتوبر کو ہم دونوں سارے دن ان کا انتظار کرتے رہے
مگر وہ ..... نہیں آئے۔ تین چار دن بعد کسی نے کراچی کا اخبار "جنگ" لا کر دیا تو ایک
خبر پر میری نظر جمی اور میں سناٹے میں رہ گیا۔ میاں سردار احمد اویسی اُس وقت وفات پا گئے
جب اُن کا جہاز جدّہ کے ہوائی اڈے پر اُتر رہا تھا۔ ان کی میت کراچی واپس لائی گئی۔ جمیلہ
ہاشمی اور ان کی اکلوتی بیٹی عائشی ساتھ تھے۔ سردار احمد ہیرا آدمی تھے۔ سیدھے سادے،
شریف النفس اور وضع دار۔ جمیلہ ہاشمی کا ایسا خیال رکھتے جیسے مالی تازہ گلاب کا رکھتا ہے۔
ساری ذمہ داری، گھر کی، باہر کی، خود اٹھاتے اور جمیلہ کو لکھنے پڑھنے کے لیے تازہ دم
رکھتے۔ جو وہ کہتیں وہ کرتے۔ عائشی کو ہر دم اپنے ساتھ رکھتے، جو اُس کے مُنہ سے نکلتا پورا
کرتے۔ ناز و نعم میں پلی بیٹی اب بن باپ کے رہ گئی تھی اور جمیلہ بھی جائداد کے جھگڑوں اور مقدموں سے
نمٹنے کے لیے اکیلی رہ گئی تھیں۔ جس پامردی سے انھوں نے زندگی کے جھمیلوں کا مقابلہ کیا

جمیلہ کی زندگی کا وہ پیارُخ سامنے آیا جو اب تک چھپا ہوا تھا۔ انھوں نے بیٹی کے ساتھ مل کر زمینوں اور جائداد باغ کے انتظام کو ایسے سلیقے سے چلایا کہ سب دیکھتے رہ گئے۔ پہلے باپ کی لاش عاشی اپنے گاؤں لے کر گئی تھی اور ۱۱ جنوری ۱۹۸۸ء کو وہ اپنی ماں کی لاش اپنے گاؤں لے کر گئی تاکہ آبائی قبرستان میں سپردِ خاک کر دے۔ مصحفی نے کہا تھا:

کیا تماشا نظر آتا ہے انھیں، حیراں ہوں

یار کیوں خاک کے پردے میں چلے جاتے ہیں

۱۰ جنوری ۱۹۸۸ء — میں اسلام آباد میں تھا کہ کراچی سے فون آیا۔ جمیلہ ہاشمی بہت بیمار ہیں اور انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں کل رات سے داخل ہیں۔ میں نے لاہور ٹیلی فون کیا۔ عاشی نے اٹھایا۔ وہ رو رہی تھی۔ انکل میں کیا کروں۔ امّی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ انکل میں کیا کروں۔ میں نے تسلی دی۔ ڈھارس بندھائی اور کہا میں ابھی دوبارہ فون کرتا ہوں۔ کشور ناہید کو فون کیا۔ وہ نہیں ملیں۔ سائرہ ہاشمی کے گھر فون کیا۔ وہ بھی نہیں ملیں۔ انتظار حسین کو فون کیا وہ بھی نہیں ملے۔ معلوم ہوتا تھا کہ آج لاہور خالی ہوگیا ہے۔ دوبارہ عاشی کو فون کیا۔ جمیلہ ہاشمی کے بہنوئی یعقوب خان صاحب بول رہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ کل رات ساڑھے دس بجے کے قریب اچانک طبیعت خراب ہوئی، فوراً ہسپتال لے گئے۔ ڈاکٹروں نے معائنہ کیا تو بلڈ پریشر کی مشین خطِ مستقیم بنا رہی تھی۔ خون میں شکر کی سطح ۳۹۶ ہوگئی تھی اور اسی وجہ سے دماغ متاثر ہوگیا تھا۔ رات سے لے کر دوسرے دن ایک بجے تک انھیں زندہ کرنے اور زندہ رکھنے کی کوششیں مسیحائے لاہور کرتے رہے۔ جب سانس کا دھاگا ٹوٹنے لگتا تو وہ سانس بحال کرنے اور زندہ کرنے کے لیے پسلیوں اور سینے کو دباتے۔ بجلی کے جھٹکے دیتے۔ اس عمل سے پسلیاں بھی ٹوٹ گئیں۔ دس بارہ گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد وہ آس نراس کی کیفیت سے باہر نکلے اور ایک بج کر تین منٹ پر اعلان کیا کہ مریض نے دم توڑ دیا ہے اور وہاں چلا گیا ہے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میں نے پوچھا عاشی کہاں ہے؟ وہ دہاڑے مار کر رو رہی تھی۔ انکل میں کیا کروں۔ امّی مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔ میں نے مقدور بھر تسلی دینے کی کوشش کی اور کہا میں جلد پہنچتا ہوں۔ اس وقت تک جمیلہ ہاشمی کی میّت ہسپتال میں تھی۔ گھر

نہیں آئی تھی۔ میں نے اسلام آباد سے لاہور پہنچنے کے انتظامات کیے اور ساڑھے تین بجے کے قریب پھر فون کیا۔ عاشی فون پر تھی۔ اب اُس کے آنسو سوکھ چکے تھے اور سارا غم دل میں اُتر گیا تھا۔ انکل میں امی کی تدفین کہاں کروں۔" بیٹا!" میں نے کہا" اپنے گاؤں میں۔ مَیں انشاءاللہ ۴/۱-۲ بجے کے جہاز سے پہنچ رہا ہوں"۔ انکل تو پھر ہم میت کو ایک گھنٹے میں خانقاہ شریف لے جائیں گے۔ میں نے پھر تسلی تشفی کی باتیں کیں اور فون رکھ دیا۔ ابھی فون رکھا ہی تھا کہ اختر جمال کا فون آیا۔ بھائی! میں نے بہن سے بات کی ہے۔ میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ خانقاہ شریف چلوں گی۔ ۱۱ر جنوری کو ہم تینوں اسلام آباد سے لاہور، لاہور سے ملتان اور ملتان سے گاڑی میں خانقاہ شریف پہنچے تو ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ قبرستان پہنچے تو جمیلہ ہاشمی کی کچی قبر پر حافظ صاحب قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔ یہاں کی ہوا تیر کی طرح جسم میں پیوست ہو گئی۔ ہوا سرد اور تیز ہو تو آنسو بھی آجاتے ہیں۔ میں نے آنسو پونچھے اور ہوا کے رُخ کی طرف پیٹھ کرلی۔ فاتحہ پڑھی اور جمیلہ ہاشمی کے باغ میں آگیا جہاں گلاب کے بے شمار پودے دَم سادھے چُپ چاپ کھڑے تھے۔ کشور ناہید اور نثار عزیز بٹ تصویرِ غم بنی ساکت وصامت سر جھکائے بیٹھی تھیں اور مصحفی مجھ سے کہہ رہے تھے:

تھی جن سے گفتگو ہمیں، وہ یار مر گئے
جنسِ سخن کے اپنی خریدار مر گئے

(یکم فروری ۱۹۸۸ء)

اردو کی خواتین
ناول نگار
ڈاکٹر ایس۔ کے۔ جبیں

اُردو کی خواتین ناول نگار

ڈاکٹر ایس۔ کے۔ جبیں

(ڈاکٹر سلطانہ خوشنود جبیں)

صدر شعبۂ اردو و فارسی، ویر کنور سنگھ یونیورسٹی، آرا

و

ڈین، شعبہ ہیومنیٹیز، ویر کنور سنگھ یونیورسٹی، آرا

ارم پبلشنگ ہاؤس، دریاپور، پٹنہ-۴

نام کتاب : اردو کی خواتین ناول نگار

مؤلفہ : ڈاکٹر ایس۔ کے۔ جبیں (ڈاکٹر سلطانہ خوشنود جبیں)

سال اشاعت : ۲۰۰۹ء

تعداد اشاعت : ۵۰۰

کمپوزنگ : ڈی ٹی پی کمپیوٹرس، کاظمی بیگم کمپاؤنڈ
گذری، پٹنہ سیٹی-۸۰۰۰۰۸

مطبع : ارم پرنٹرس، دریاپور، پٹنہ-۴

اہتمام : ارم پبلشنگ ہاؤس، دریاپور، پٹنہ-۴

قیمت : ۲۰۰ روپے

ملنے کے پتے

- صغیر احمد، ایڈوکیٹ، محلہ دائرہ، سہسرام
- بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ-۴
- پرویز بک ہاؤس، سبزی باغ، پٹنہ-۴
- بک ہاؤس، ملکی محلہ، آرا
- مکتبہ افکار، اردو بازار، دربھنگہ-۸۴۶۰۰۴

Title: URDU Ki Khwatin Novel Nigar

Author : Dr. Sultana Khushnud Jabeen

Ph: 06184-222892, 9955495379

Year of Pub. : 2009

Price : Rs. 200/-

فہرست

اور داستان زندگی کا ایک کے بعد ایک باب لکھتے ہوئے بالآخر خود کو کشتیوں کے ایک ایسے گھاٹ پہ کھڑا محسوس کرتا ہے جہاں سے مختلف راستوں پہ جانے والی کشتیاں روانہ ہوتی ہیں۔ وہ حیران ہے کہ کدھر جائے؟ دراصل اس کی پوری زندگی کی محبت، تجارت، سیاست، علم اور دوسرے شعبہ ہائے حیات میں ایک بے یقینی سے دوچار رہی ہے۔ اس نے ایک عورت سے محبت کی (یا شاید نہیں کی؟) تو وہ اس کے دوست شجاع کی بیوی بن گئی، کوثر کو چاہا تو وہ ماں کی تیمارداری کرتے کرتے خود بھی دنیا سے گزر گئی، ملازم کی ایمانداری سے تجارت کرنے کا درس دیا تو ایک دن وہ کہنے لگا:

> ''آپ نے پہلے دن سے مجھے ایمانداری سکھائی بی بی نے ماں کی طرح میری نگرانی کی۔ لیکن ایمانداوی میں تو برکت ہونی چاہئے تھی نا؟ پھر یہ کیسے ہوا کہ ہمارے آس پاس کے لوگ سب کروڑ پتی ہوگئے جب کہ ہماری کمائی سے ہم سب کے اور کارندوں کے گھربار کا بس خرچہ ہی نکلتا ہے۔'' (دریا کے سنگ، ص۲۳۶)

تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، بس اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ معاشرے میں جو تضاد ہے وہ افراد کی ذہنی الجھاؤ اور انتشار سے ظاہر ہے۔ ''کاروان وجود'' کی کردار نگاری عمدہ ہے تو ''دریا کے سنگ'' کی معاشرہ نگاری اس اعتبار سے نثار عزیز بٹ کے ناول نئے پاکستانی معاشرے کا اشاریہ کہے جا سکتے ہیں۔

جمیلہ ہاشمی :

جمیلہ ہاشمی کی پیدائش جنوری ۱۹۲۸ء میں غیر منقسم ہندوستان میں ہوئی۔ انگریزی ادب میں ایم اے کرنے والی جمیلہ ہاشمی تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلی گئیں اور لاہور میں مقیم ہوئیں۔ ۵۵-۱۹۵۴ء کے دوران ان کا پہلا ناول ''تلاش بہاراں'' منظر عام پر آیا جسے ۱۹۶۱ء میں پاکستان کا اہم ادبی اعزاز ''آدم جی ایوارڈ'' ملا۔ اسی سال ان کی شادی صوبہ پنجاب کے ایم پی اور بھاولپور کی مشہور خانقاہ کے سجادہ نشیں سردار احمد اویسی سے ہوئی جو زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہی۔ شادی کے اٹھارہ سال بعد شوہر کا انتقال ہوگیا۔

جمیلہ ہاشمی نے ''خواتین سیریز'' کے نام سے اردو کی کلاسیکی کتابوں کی اشاعت کی۔ ''نیا دور'' کراچی میں تین سال تک ان کے ناول اور افسانے شائع ہوتے رہے۔ ان کے افسانوں کے مجموعے ''آپ بیتی جگ بیتی''، ''رنگ بھومی'' اور ''کیسا باغ کیسی بہار'' کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ ''تلاش بہاراں'' کے بعد ان کا ایک ناول ''آتش رفتہ'' اور ناولٹ ''روہی'' منظر عام پر آیا۔ موجودہ صدی کے آٹھویں دہائی میں وہ تاریخی ناول نگاری کی طرف مائل ہوئیں اور ان کے دو ناول ''چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو'' اور ''دشت ہوس'' منظر عام پر آئے۔

جمیلہ ہاشمی کے پہلے ناول ''تلاش بہاراں'' کے موضوع کے سلسلے میں ناقدین میں کبھی اتفاق نہیں رہا۔ عام طور پر اسے تقسیم ہند سے متعلق ناولوں کے زمرے میں رکھ دیا جاتا ہے۔ جب کہ بعض ناقدین اس کا موضوع عورتوں کی جدوجہد اور اصلاح نسواں کے تئیں معاشرتی رویے کو مانتے ہیں۔ ایک نقطۂ نظر یہ بھی رہا ہے کہ اس ناول کا عنوان دراصل ناول کے مرکزی کردار کی جدوجہد اور اس میں ناکامی کے پس منظر میں رکھا گیا ہے۔ ناول کا بغور مطالعہ یہ احساس دلاتا ہے کہ اس ضخیم ناول میں بیک وقت کئی موضوعات کو لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اسلم آزاد نے نہ معلوم کیوں اس نکتے کی تکرار کی ہے کہ:

> ''ایک قوم بہاروں کی تلاش میں سو برس تک سرگرم رہتی ہے اور ان عملی سرگرمیوں کا نتیجہ خونریزی اور فرقہ وارانہ فسادات کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ ملک کی تقسیم کے المناک تجربے کو قرۃ العین حیدر نے میرے بھی صنم خانے میں جس فنکارانہ ہوش مندی اور حسن و اثر کے ساتھ پیش کیا ہے، ان کے مقابلے میں یہ ناول کمزور ہے۔''

(اردو ناول آزادی کے بعد، ص ۲۷۵)

میں سمجھتی ہوں کہ ناول کا وہ موضوع ہی نہیں ہے۔ جس کی پیش کش میں ناکامی کا ڈاکٹر آزاد شکوہ کر رہے ہیں۔ یہ ناول دراصل اپنے مرکزی کردار کنول کماری ٹھاکر کی کہانی سے عبارت ہے۔ اس نے عورتوں کی مساوات اور آزادی نسواں کا ایک خواب دیکھا۔ جس کی تعبیر اسے اچھی نہیں ملی۔ حالانکہ ایک طرف تو اس نے عورتوں کو انصاف دلانے کے لیے عدالت اور

حکام کا دروازہ کھٹکھٹایا اور دوسری طرف خود عورتوں میں بیداری لانے کے لیے تعلیمی ادارے بھی کھولے۔ تقسیم ہند تو اس کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے، جس نے اس کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا۔ ایسے میں ناول کا موضوع دراصل کنول کی وہ بے سود جدوجہد ہے جسے آزادیٔ نسواں کے لیے چلائی جانے والی تحریکوں کا استعارہ کہا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پس منظر میں اکثر کنول یا دوسرے کرداروں سے وابستہ واقعات کا جائزہ لیا جائے تو کہانی میں روایتی قسم کی جدوجہد اور اس کے اسباب وعوامل کی فراوانی دکھائی دے گی۔ پلاٹ کا ڈھیلا پن بھی نمایاں ہو جائے گا اور کرداروں کی تشکیل میں ناکامی بھی۔ اس کے باوجود چونکہ ناول کی ہیروئن ایک اہم اور نیک مقصد کے لیے برسرِ پیکار رہی ہے اور اسی مقصد کے تحت مسلمان لڑکیوں کی جان بچاتے ہوئے خود اپنی جان قربان کر دیتی ہے۔ اس لیے نہ صرف قارئین کی بلکہ انعام دینے والوں کی توجہ بھی اس ناول کی طرف مبذول ہوئی ہے۔ ورنہ اس کی فنی حیثیت پر ہر دور میں اعتراضات کئے گئے ہیں۔

پچھلے پندرہ بیس برسوں کے دوران جمیلہ ہاشمی تاریخی ناول نگاری کی طرف مائل ہوئی ہیں۔ جس کا ایک ثبوت "چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو" تھا تو دوسرا "دشت ہوس" (مطبوعہ ۱۹۸۳ء) ہے۔ اس ناول میں انہوں نے ایک تاریخی کردار حسین ابن منصور حلاج کو موضوع بنا کر اس کی پراسرار شخصیت سے وابستہ مختلف واقعات کو ناول کا حصہ بنایا ہے۔ اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر نیلم فرزانہ نے بہت اہم اور مدلل باتیں لکھی ہیں۔ میں ان کی رائے جستہ جستہ نقل کرتی ہوں:

> "دشت ہوس' چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو کے سلسلے کا ضخیم ناول ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار حسین ابن منصور حلاج ہے۔ ابن منصور حلاج کا ذہنی رویہ اور اس کا انجام بھی قرۃ العین حیدر، طاہرہ سے مختلف نہیں ہے۔ وہ بھی مسلمانوں کی مذہبی تاریخ کی ایک اہم شخصیت ہے...... جمیلہ ہاشمی کا یہ کہنا ہے کہ وہ تاریخ کو اپنے عہد کے تناظر میں دیکھتی ہیں۔ دشت ہوس کے سلسلے میں ان کا یہ خیال محلِ نظر ہے...... دشت ہوس میں جمیلہ ہاشمی نے حسین بن منصور حلاج کے تاریخی کردار کی چھان بین اپنے عہد کے تناظر

میں نہیں کی بلکہ اس کردار کے بارے میں جو چند سوالات مصنفہ کے ذہن میں پیدا ہوئے اس (کذا) کا حل تلاش کیا اور ابن منصور کو خود اس کے ہی عہد میں رکھ کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے کہ ابن منصور کے کردار کا کوئی ایسا پہلو سامنے نہیں آتا جسے ہم جدید عہد کا تناظر کہہ سکیں ...... مصنفہ نے حسین بن منصور حلاج کی متصوفانہ شخصیت کو جوں کا توں قبول کیا ہے اور اس کے روحانی سفر کو تخلیقی اور تاثراتی اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جسے وہ غنائیہ کا نام دیتی ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ناول زمانی اور مکانی تسلسل رکھتے ہوئے بھی سبب وعلت کی منطق کا پابند ہے اور ایسے تجربات و محسوسات کو پیش کرتا ہے جو تمام تر مابعد الطبیعاتی ہے۔ اس طرح ابن منصور کی زندگی کا سفر روحانی ہے جو خالص مابعد الطبیعاتی ہے جس کی کائنات عقل کے دائرے اختیار میں نہیں آتی ...... وشت ہوس ایک دلچسپ ناول ہے پہلی بات تو یہ کہ حسن ابن منصور کی ذات اردو ادب اور شاعری کے لیے نئی نہیں ہے۔ لہٰذا اس شخصیت کو موضوع بنا کر لکھا گیا ناول فطری طور پر ہماری توجہ مبذول کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس ناول کی دلچسپی کی نوعیت داستانوں کی دلچسپی سے ملتی ہے۔ جس میں ہم ایک ایسی کائنات میں داخل ہو جاتے ہیں جہاں سب کچھ ممکن ہے۔ ابن منصور ابتدا تا انتہا کسی غیر معمولی طاقت کا مالک یا اسیر نظر آتا ہے۔ ابتدا سے ہی کہانی کا ایک پیٹرن بن جاتا ہے جسے بہت حد تک داستانی پیٹرن کہہ سکتے ہیں۔ اس ناول سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہمیں ابن منصور کے عشق کی ماہیت کو عمل کی کسوٹی پر پرکھے بغیر اس کے ذہنی اور روحانی اضطراب اور مابعد الطبیعات تجربات کی صداقت پر یقین کرنا پڑتا ہے۔''

(اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار، ص ۲۷۹-۲۷۳)

ڈاکٹر فرزانہ نے بالکل درست لکھا ہے کہ ابن منصور حلاج کی شخصیت اور اس ناول کے پیچ وخم سے صحیح طور پر لطف اندوز ہونے کے لیے اسے موجودہ عہد کے تناظر میں دیکھنے کے بجائے

اس کے عہد میں رکھ کر دیکھنا ہوگا۔ اگر ہم دور حاضر کے پس منظر میں اس کی شخصیت اس کے روحانی ارتقا اور اس کے مقبولیت کا جائزہ لیں گے اور اس سلسلے میں عقلی توجیہات یا دلائل فراہم کرنے کی کوشش کریں گے تو ہمیں مایوسی ہوگی کیونکہ ہمارے مادی تجربات ہمیں ابن منصور کی شخصیت کے اسرار کی عقدہ کشائی میں زیادہ دور نہیں لے جاسکیں گے۔ اس کے برخلاف اگر ہم ابن منصور کو ایک تاریخی صداقت کے طور پر تسلیم کرلیں اور اس کی شخصیت کو روحانی عناصر سے عبارت مان لیں تو ہم ناول کے واقعات سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ داستانوں میں بھی ایک ایسی ہی روحانی یا بہ الفاظ دیگر فوق الفطری فضا سے ہمارا سابقہ ہوتا ہے جسے ہم ایک خاص عہد کی صداقت سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔ اگر ہم اس صداقت کو عہد جدید کی عقلی میزان پر تولیں تو مشکل در پیش ہوگی اور جب ناول کے واقعات اور کرداروں سے ہمارا یقین ہی اٹھ جائے گا تو نہ ان کی طرف ہم متوجہ ہوں گے نہ ان سے لطف اندوز ہی ہوسکیں گے۔

بہرحال، اب ناول کو پلاٹ کی طرف آئیے ظاہر ہے کہ ابن منصور کی شخصیت کی طرح اس کی زندگی کے بیشتر واقعات بھی معلوم و معروف ہیں۔ تاریخی نوعیت کے ان واقعات کو مصنفہ نے ایک خاص تاثر پیدا کرنے کے لئے تین حصوں میں بانٹا ہے۔ ساتھ ہی تاریخی واقعات کے پہلو بہ پہلو ایک رومانی کہانی بھی بڑھائی ہے۔ تاریخی ناول نگاری کی یہ تکنیک بہت پرانی ہے اگر ابن منصور کی اہم روحانی شخصیت کے پیش نظر اس کا استحصال آسان نہ تھا۔ ناول کا آغاز ابن منصور کے بچپن کے واقعات سے ہوتا ہے۔ اس کی ابتدائی تعلیم، تربیت کے مراحل اور حضرت سہل بن عبداللہ تستری کی خانقاہ میں اس کی تعلیم سے لے کر بصرہ کے قیام تک کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ یہ روحانی ارتقاء کی پہلی منزل ہے مگر دیکھتے ہیں کہ ابتداء سے ہی وہ غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے اور اس کی شخصیت ہر جگہ نمایاں رہتی ہے۔ ناول کا دوسرا حصہ ''نغمہ شوق'' اس کے روحانی سفر کا نقطہ عروج ہے۔ یہ دارالخلافہ شہر بغداد کی کہانی ہے۔ ابن منصور یہاں اپنی تمام تر سحر سامانیوں کے ساتھ موجود ہے۔ ہر وقت اس کے چاروں طرف لوگوں کی بھیڑ رہتی ہے اور لوگ اس سے فیضیاب ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں مصنفہ یہ تاثر دینا چاہتی ہیں کہ دنیا بے حد دکھی ہے اور یہاں رہنے

والے اس قدر انتشار اور پریشانی کا شکار ہیں کہ وہ ایسی تمام بزرگ ہستیوں کے پیچھے بھاگتی ہیں جن سے انہیں تھوڑے فائدے کی امید ہو۔ بہر صورت ہر طرح کے لوگ ابن منصور کی شخصیت سے متاثر ہوکر اس کے گرد جمع ہونے لگے اور اس کی مقبولیت دو طرح کے لوگوں کے لیے لمحہ فکریہ بن گئی۔ ایک طرف تو وہ لوگ تھے جو طریقت کے اعلیٰ مرتبے پر فائز تھے۔ ان میں سہل بن عبداللہ تستری اور حضرت جنید بغدادی جیسے بزرگ بھی تھے۔ گرچہ یہ لوگ حسین ابن منصور کے ساتھ ایک نوع کی ہمدردی بھی رکھتے تھے۔ لیکن اسے گمراہ تصور کرتے تھے اور اپنی مقبولیت کے لیے خطرہ بھی مانتے تھے۔ ان کے خیال میں اس گمراہی کی سزا موت تھی۔ دوسری طرف وہ لوگ بھی ابن منصور سے ہراساں تھے جو اقتدار میں تھے اور ان میں سرفہرست خود خلیفہ وقت تھا۔ خلیفہ کی ناراضگی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس کی منظور نظر کنیز اغول جسے اس نے حرم میں شامل کر لیا تھا، حسین ابن منصور کے عشق میں نہ صرف گرفتار تھی بلکہ اس کی قربت میں اس نے جان بھی جان آفرینی کے سپرد کر دی تھی۔ ظاہر ہے کہ خلیفہ رقابت کی آگ میں جل رہا تھا اور ابن منصور کے خلاف طرح طرح کی ریشہ دوانیوں میں مبتلا تھا۔ مذہبی شخصیتوں کے اعتراضات نے اسے ایک موقع فراہم کر دیا اور اس نے اپنی سیاسی طاقت سے فائدہ اٹھا کر حسین ابن منصور کو موت کی سزا سنا دی۔ ناول کے آخری حصے ''زمزمہ موت'' میں ان تمام اسباب کی نشاندہی کی گئی ہے جو ابن منصور کی سزائے موت میں کارفرما رہے۔ لیکن جیسا کہ ڈاکٹر نیلم فرزانہ کا خیال ہے ناول کا دوسرا حصہ اپنی طوالت کے باوجود ابن منصور کی سحرانگیز شخصیت سے پردہ نہیں اٹھاتا بلکہ اس کے کشف وکرامت کے اظہار کے سبب اس کی شخصیت کا طلسم اور بھی گہرا ہوتا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر اس ناول کا پلاٹ کسی بھی طرح ''تلاش بہاراں'' کی طرح انتشار کا شکار نہیں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جمیلہ ہاشمی کی تخلیقی صلاحیتوں نے پہلے سے معلوم شدہ تاریخی صداقتوں کو بھی نیا فنکارانہ حسن عطا کیا ہے۔ انور سدید نے اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے بالکل درست لکھا ہے:

> ''جمیلہ نے اپنے دلکش، مرصع اور خوبصورت اسلوب میں ایک ایسا ناول تخلیق کیا ہے جس میں تخیل کی مناسب پرواز کے لیے فضا کشادہ نہیں

تھی لیکن وہ ہمیں منصور حلاج کے عہد میں اس طرح لا کھڑا کرتی ہیں کہ ہمارے گرد و پیش میں اس دور کے عوام و خواص سانس لینے لگتے ہیں اور اس دور کا فکر ہمارے اضطراب کو دو چند کرتا ہوا نظر آتا ہے...... یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ جمیلہ ہاشمی نے تاریخ نہیں لکھی بلکہ تاریخ کے بطون سے ناول کا مواد حاصل کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مدار سے سے ایک قدم باہر نکالنے کی کوشش نہیں کی اور اس حد امتیاز کو قائم رکھا ہے جو تاریخ اور ناول کے درمیان فنی طور پر قائم رکھنا ضروری ہے۔''

(جائزے، کتاب نما جولائی، ۱۹۸۵ء، ص ۲۰۲)

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جمیلہ ہاشمی نے ابن منصور کی طلسماتی شخصیت اور اس عہد کے مختلف حالات کو ناول کا روپ دیا ہے۔ انہوں نے ابن منصور کے فکری دھاروں پر نہ روشنی ڈالی ہے نہ ان کی تائید، تبلیغ یا تردید کی ہے۔ یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔ ناول کے اسلوب شاعرانہ اور تخلیقی صلاحیتوں کا نمونہ ہے۔

بانو قدسیہ :

بانو قدسیہ کو عام طور پر ''تازہ واردان بساط ادب'' کی صف میں جگہ دی جاتی ہے۔ حالانکہ وہ ایک عرصے سے ڈرامے اور افسانے لکھ رہی ہیں۔ ۱۹۲۸ء میں پیدا ہونے والی بانو قدسیہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کے جو مجموعے خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں دستیاب ہیں ان میں ''توجہ کی طالب'' نا قابل ذکر، چہار چمن، آتش زیر پا، امر بیل اور کچھ نہیں اور ''بازگشت'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں چونکہ ان میں موجودہ پاکستانی معاشرے کے بدلتے ہوئے مزاج کی فنکارانہ آئینہ داری ملتی ہے۔ اس کے علاوہ ''ایک دن'' شہر بے مثال' قوم کی گلیاں' دانت کا دستہ اور اک ترے آنے سے' وغیرہ ان کی مطبوعہ کتابیں ہیں۔ اشفاق احمد کی تحریک پر انہوں نے ریڈیو اور اسٹیج کے لیے ڈرامے لکھے ہیں جن کا تازہ ترین مجموعہ ''فٹ پاتھ کی گھاس'' (مطبوعہ فیروز سنز پرائیوٹ لمیٹیڈ، لاہور) کے نام سے شائع ہوا ہے۔ البتہ ان کا پہلا ناول راجہ گدھ مطبوعہ ۱۹۸۱ء (زیر اہتمام سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور)

ہند و پاک
کی
خواتین ناول نگار
مُصنّف
ڈاکٹر غلام محی الدین انصاری سالک

HIND-O-PAK KI KHAWATEEN NAVIL NIGAR

(Women Novelists of India and Pakistan)

Author : **Dr. Ghulam Mohiuddin Ansari Salik**
First Edition: **2008** Price :**Rs.550** US $15

نام کتاب : ہندو پاک کی خواتین ناول نگار
مصنف و ناشر : ڈاکٹر غلام محی الدین انصاری سالک
سن اشاعت : 2008
تعداد : 600
مطبع : شاہد پبلی کیشنز، نئی دہلی۔2 موبائل: 9868572724
قیمت : 550 روپے
ملنے کا پتہ : B-70، تیسری منزل، آشیانہ اپارٹمنٹ، دلشاد کالونی، دہلی۔ 110095
زیر اہتمام : پرویز شہریار

ISBN-13 : 978-81-906608-8-4

Mailing Address:
NTS, India CT&E,
Central Institute of Indian Languages, Mysore–6
E-mail:drgmsalik@gmail.com,drgmansari@yahoo.co.in
Mob: 09341860816

Shahid Publications
2253, Resham Street, Kucha Chelan, Darya Ganj,
New Delhi-110002 India Phone: 011-23272724
E-mail: drshahidhusain_786@yahoo.co.in

مخصوص طبقے کی تہذیبی و معاشرتی حالات نمایاں ہیں۔ انھوں نے نوابوں اور رئیس زادوں کے استحصالی نظام کو نہ صرف بے نقاب کیا ہے۔ بلکہ ان نوابوں اور رئیس زادوں کے وضع کردہ اصولوں اور روایتوں کو اپنے تیروں کا نشانہ بھی بنایا ہے۔

خدیجہ مستور کی تخلیقات میں گھریلو رنجشیں، آپس کی رقابتیں اور قرابت داری کی نوک جھونک کے علاوہ انگریزی حکومت کی مکاریاں اور سادہ لوح ہندوستانیوں کی مظلومیت واضح طور پر نمایاں ہیں۔ تقسیم ہند کے اثرات اور اس کی بحرانی صورت حال کا نقشہ، تارک الوطن کے مسائل اور ہجرت سے پیدا شدہ روح فرسا حالات کی عکاسی ذاتی کیفیت اور سیاسی محاذ آرائی کے عناصر ناآسودگی کا احساس دلاتے ہیں۔ رضیہ فصیح احمد کا ناول ''آبلہ پا'' اگرچہ براہ راست تقسیم ہند کے موضوع سے متعلق نہیں ہے لیکن فلش بیک کی تکنیک کا بہتر استعمال ہونے سے یہ کتاب نہ صرف پرکشش ہوگئی ہے بلکہ ایک قسم کی تزئین کاری سے قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ یہاں حال ماضی میں اور ماضی حال کے آئینے میں جلوہ گری کرتا ہوا واقعات کے ایسے عوامل و محرکات سے ہمیں رو برو ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ جنھیں جاننے کی خواہش کہانی کی مزید قرأت کی طرف ہمارا ذہن مبذول کراتی ہے۔ دراصل اس ناول میں جس نظامِ زندگی کی عکاسی کی گئی ہے اس میں اعلیٰ اقدار حیات کے بجائے سفلی قسم کے جذبات واحساسات جلوہ گر ہوتے ہیں۔ جہاں ظاہری چمک دمک، گمراہ کن رجحانات، آزادی کا بے جا استعمال، جھوٹی خوشیوں کی تلاش اور سطحی مقاصد کا حصول ہی زندگی کا اعلیٰ ماحصل تصور کیا جاتا ہے۔

جمیلہ ہاشمی نے اپنی تخلیقات کے ذریعے بالخصوص ''تلاش بہاراں'' میں تقسیم ہند سے قبل برصغیر کی قدیم مشترکہ تہذیب کی تصویر کشی۔ پھر اسی مشترکہ تہذیب کا خاتمہ۔

پوری قوم جو بہاروں کی تلاش میں ایک صدی تک سرگرم عمل رہتی ہے۔ بالآخر اس کا نتیجہ قتل و غارت گری اور فرقہ وارانہ فسادات کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں معاشرے کی تلخیاں، ذہنی کرب و اذیت، اخلاقی طور سے رو بہ زوال، سیاسی بحران اور معاشی بدحالی کے علاوہ بنیادی طور پہ انسانی اقدار کی پامالی کو واقعات کے پس منظر اور حقائق کی روشنی میں پیش کیا ہے۔

بانو قدسیہ کی تحریروں میں تقسیم ہند کے بعد پاکستان کا ایک جدید معاشرہ جس میں مذہبی نظام حیات سے انحراف کرتے ہوئے اس کے بھونڈے پن کی عکاسی ہوئی ہے۔ یہ وہ معاشرہ ہے جو ذہنی سماجی، نفسیاتی، اخلاقی اور تعلیمی حیثیت سے بحران کا شکار ہے۔ جس کے نتیجے میں رزق حرام کی طرف نہ صرف گامزن ہے بلکہ دیوانہ پن اور بے حسی کا شکار بھی ہوجاتا ہے۔ نفس پرستی ایسے سماج کے لوگوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ جہاں حلال و حرام میں کوئی تمیز نہیں رہتی۔ بانو قدسیہ نے انسان کے اعلیٰ اقدار کی تخریب اور جدید نسل کی بے راہ روی کا نقشہ بخوبی اتارا ہے۔

اس حیثیت سے ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک کی خواتین ناول نگاروں نے تقسیم کا حادثہ، برصغیر کی سیاسی بحران کے حالات و کیفیات اور خاص طور سے اپنے اپنے ملک کی سماجی، معاشی اور تہذیبی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلیوں کی نہ صرف نشان دہی کیا ہے۔ بلکہ اپنے اپنے ناولوں میں موضوعات و مسائل، فکر وفن، داخلی خود کلامی، شعور کی رو اور فلش بیک کی تکنیک کے تجربات اور کردار نگاری کی سطح پر نئے تقاضوں نئے رجحانات اور نئی جہتوں کو روشناس بھی کیا ہے۔ اس تحقیقی مقالے میں ہندوپاک کی مذکورہ بالا خواتین ناول نگاروں کے ان ناولوں کو ہی زیر مطالعہ لایا گیا ہے۔ جو سماجی، سیاسی، معاشی، نفسیاتی اور تہذیبی اعتبار سے نمائندہ ناول قرار دیے جاسکتے ہیں۔ اگرچہ

فہرست مضامین

باب چہارم

باب پنجم

جمیلہ ہاشمی

جمیلہ ہاشمی 17 نومبر 1929 کو لائل پور میں پیدا ہوئیں۔ جو اس وقت فیصل آباد کے نام سے مشہور ہے۔ ان کا آبائی وطن امرتسر ہے۔ ان کے گھریلو ماحول میں نہ تو افسانوی فضا تھی اور نہ ادبی چہل پہل۔ بلکہ ایک عام ماحول میں ان کی پرورش ہوئی، جہاں معمولی غلطیوں پر خوب پٹائی ہوتی تھی۔ جب وہ اسکول میں زیرِ تعلیم تھیں تو انھیں اگر کسی چیز پر مضمون لکھنے کے لیے کہا جاتا، تو وہ اس عنوان پر مضمون لکھنے کے بجائے اس پر کہانی لکھ دیا کرتی تھیں۔ ان کی اس حرکت پر ان کی استانی جی نے کئی بار ڈانٹا بھی۔ وہ ڈانٹ سنتی گئیں لیکن کہانی لکھنا نہیں چھوڑا اور اس طرح سے ان کے اندر بے شمار کہانیاں چھپی ہوئی تھیں۔ آہستہ آہستہ پھلنے پھولنے سے درخت کی شکل اختیار کرنے لگیں۔

جمیلہ ہاشمی کی شادی ایک زمین دار گھرانے میں ہوئی تھی۔ ان کے شوہر سردار احمد اویسی مرحوم ایک زمین دار ہونے کے علاوہ گدی نشیں رہبر بھی تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے روشن خیالی اور وسیع النظری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی بیگم پر لکھنے پڑھنے کے سلسلے میں کوئی قدغن نہیں لگائی۔ بلکہ ان کی بھرپور ہمت افزائی کی۔ ان کی اس رواداری پر جمیلہ ہاشمی نے بڑی سنجیدگی اور بڑے انہماک کے ساتھ اپنا تخلیقی سفر جاری رکھا۔ جب ان کے شوہر کا انتقال ہوگیا تو جمیلہ ہاشمی اپنا زیادہ تر وقت لکھنے

پڑھنے کے علاوہ زمین داری کے معاملات میں صرف کرنے لگیں۔ قلم اور کاغذ سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ تھا۔ جس کو ان کے سسرال والے بے معنی اور لا حاصل کام تصور کرتے تھے۔ لیکن ان کی اکلوتی صاحبزادی جوان کی بیٹی ہی نہیں بلکہ دوست اور غمگسار بھی تھی۔ ایسے موقع پر ان کی ہمت بندھاتی اور حوصلوں کو مہمیز کرتی تھی۔

جمیلہ ہاشمی نے جامعہ پنجاب سے 1954 میں انگریزی ادب میں ایم۔اے کیا اور اسکول میں درس و تدریس کے فریضے پر مامور ہوگئیں۔ وہ روسی ادب سے بے حد متاثر تھیں، خاص طور سے چے خوف، ٹالسٹائی، شولوخوف کے، جن کی بے حد قدر کرتی تھیں۔ ان کے علاوہ وہ اپنے تخلیقی سفر کی ابتدا میں قرۃالعین حیدر سے بھی متاثر ہوئیں۔ ایک عرصے تک انھیں پڑھ پڑھ کر ان پر مرتی رہیں اور جب قلم سنبھالا تو ایک آدھ افسانہ ان ہی کے رنگ میں لکھا۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ دنیا کا مختلف ادب خاص طور سے انگریزی ادب کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور انھیں اپنے رنگ و روغن سے سجا کر کہانیاں لکھنا شروع کر دیا۔

اپنے پہلے ناول ''تلاش بہاراں'' کے ساتھ بہ حیثیت ناول نگار منظر عام پر آئیں۔ اس ناول کو لوگوں نے قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ اس ناول پر جمیلہ ہاشمی کو آدم جی ادبی انعام سے سرفراز کیا گیا۔ پھر یکے بعد دیگرے ان کے دو ناولٹ کی اشاعت ہوئی۔ ''آتش رفتہ'' اور دوسرا ''روہی'' ان کے افسانوی مجموعوں میں ''آپ بیتی جگ بیتی'' اور ''اپنا اپنا جہنم'' شامل ہیں۔ جمیلہ ہاشمی کے افسانوں میں موضوع اور کہانی کی فضا بھی تبدیل ہوئی ہے۔ انھوں نے عصر حاضر کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ خاص طور سے نئی نسل کے ذہنی اور جذباتی مسائل کی عکاسی کی ہے۔ ان کے تاریخی ناولوں میں ''چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو'' اور ''دشت سوس'' شامل ہیں۔ ○

حد تک مطابقت پائی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے زمین کو ''آنگن'' کا دوسرا جزو کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

جمیلہ ہاشمی کا ناول ''تلاش بہاراں'' میں بھی تقسیم ہند کا حادثہ ایک المیہ کی شکل میں ابھرتا ہے۔ انھوں نے تقسیم کے سانحہ کو نہ صرف غیر فطری جانا ہے بلکہ غیر انسانی عمل بھی قرار دیا ہے۔ ساتھ ہی ہندوستانی عوام کے باہمی نفاق اور نفرت و حقارت کی تمام ذمہ داریاں انگریزوں کے سر ڈالا ہے۔ چوں کہ تقسیم ہند کی سازش میں انگریز مبہم طور پر اپنی دلچسپی دکھا رہے تھے، ان کی پالیسی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' نے صدیوں سے چلی آرہی تہذیبی، لسانی اور سماجی اتفاق کو نہ صرف مجروح کیا بلکہ ہندوستانی عوام کے دلوں میں بغض و عناد اور نفرت و رقابت کی زہر آلود باتوں کو بھر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کی پھیلائی ہوئی زہریلی آندھی نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ملک گیر پیمانے پر خاک و خون کا ایک سمندر بہہ نکلا۔ ''تلاش بہاراں'' فسادات کے المناک حادثے پر ختم ہوتا ہے اور جمیلہ ہاشمی کا مثالی معاشرہ تہس نہس ہو کر خاکستر ہو جاتا ہے۔ فسادات کی ہولناکیوں کے مناظر جس طرح سے انھوں نے پیش کیے ہیں اس سے انسان کی روح تڑپ اٹھتی ہے۔ فسادات کے وحشت ناک منظر کا نقشہ انھوں نے اس طرح سے پیش کیا ہے۔

> ''آگ کے شعلے بارش کے باوجود بلند ہو رہے تھے۔ لوگ بھاگ رہے تھے عورتیں چھتوں سے چھلانگیں لگا رہی تھیں۔ عورتیں ننگے پیر بھاگ رہی تھیں مرد روتے ہوئے آگ کے شعلوں میں دھکیلے جا رہے تھے۔ گولیاں چلنے کی آواز آتی، کواڑ دھڑ دھڑائے جاتے۔ دستی بم پھینکے جا رہے تھے۔ چیختے اور چلاتے بچوں کو نیزوں پر لٹکایا جا رہا تھا۔ ان کو زندہ ہی آگ میں بھونا جا رہا تھا، تیل کے بڑے بڑے کھولتے کڑھاؤ تھے جن میں لڑکیوں کو برہنہ کر کے دھکا دے دیا جاتا۔ عورتیں بال بکھرائے وحشت سے آنکھیں

کھولے بھاگ رہی تھیں، نازک اندام سفید لڑکیاں ننگی پتھرائی ہوئی شکلوں سے برستی بارش میں قطاروں میں کھڑی کر دی گئی تھیں۔ مرد انھیں دیکھ کر ہنستے اور شراب سے مدہوش ہو کر جس کو جی چاہتا، کھینچ لیتے۔ ان لڑکیوں کے آنسو کہاں تھے۔ خدا کہاں تھا؟ بھگوان کہاں تھا۔ وہ مقدس نام کہاں تھے، جن کے سہارے انسان زندہ تھا؟ رحم دل ملائم پاکباز مرد کہاں تھے؟ اور یہ سب وحشیانہ ہنستے، وحشیانہ قہقہے لگاتے۔ چیختے چلاتے کون تھے۔ کیا پرانے زمانے کی روحیں تھیں جن کو ابلیس نے دفعتاً آزاد کر کے دنیا میں دھکیل دیا تھا۔" (51)

فسادات اور فرقہ وارانہ تشدد کو بھڑکانے میں بھی جمیلہ ہاشمی نے انگریزوں کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ ہندو مسلم تو ایک دوسرے کے بھائی تھے۔ ایک دوسرے کے خوشی و غم میں برابر کے شریک تھے۔ لیکن انگریزوں نے ہندو مسلم کی رگوں میں ایسا زہریلا خون بھر دیا تھا کہ ہندو مسلم خود ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ فرقہ وارانہ تشدد اور فسادات کے متعلق ایک غیر ملکی کردار ڈان وارٹن کو راوی بتاتا ہے۔

"ہمارے یہاں مذہب کے نام پر ایک دو آدمیوں کا خون تو بہایا گیا ہے پر یوں کبھی نہیں ہوا بھائی، میں سچ کہتا ہوں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ ہم تو ہندو مسلمان سے زیادہ انسان تھے۔ ہم نے صدیوں اس گہوارے میں ایک دوسرے کے دوش بدوش آزادی کی جنگوں میں حصہ لیا ہے۔ ہم نے یہاں اپنی تمناؤں کو پھلتے پھولتے دیکھا ہے اور جب تم نے ہمیں دیکھا ہمارے پاؤں میں رچا تھا۔ کاش تم ایک صدی چند سال پہلے آئے ہوتے... ہمارا مقصد آخری لمحے تک یہ نہ تھا۔ ہم جدا ہونا نہیں چاہتے تھے۔ سمجھے۔ ہم شکار کیے گئے ہیں۔ یہ گھات میں چھپے شکاری کی گولی تھی جس نے ہمیں خاک و خون میں تڑپایا ہے۔" (52)

جمیلہ ہاشمی نے آزادی کی جد وجہد سے لے کر حصول آزادی تک، پھر تقسیم وطن کے نتیجے میں فسادات اور قتل وخون کو پس منظر بناتے ہوئے جس چیز پر زیادہ توجہ صرف کیا ہے، وہ ہندوستانی سماج میں عورت کی مظلومیت اور استحصال زدہ رویہ ہے۔ معاشرے میں عورتوں کے مختلف طبقات کے علاوہ ان کے سماجی اور معاشی مسائل کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔ ''تلاش بہاراں'' کا جوان کردار کنول کماری ٹھاکر کے توسط سے جمیلہ ہاشمی نے عورت کے آئیڈیل روپ کا تصور پیش کیا ہے۔ جو عورتوں کو مساوی حقوق دلانے کا بھر پور جذبہ رکھتی ہے اور عورتوں کی فلاح و بہبود ان کے حقوق کی حفاظت اور ان کی ذہنی صورت حال کو یکسر بدلنے کی بھی کوشش کرتی ہے۔ اس ناول میں جتنے بھی کردار پیش کیے گئے ہیں، ان سبھی کی طرز زندگی سے ہندوستانی عورت کے المناک پہلوؤں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے اگر ناول کا موضوع ہندوستانی عورت کا نصیبہ قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

جمیلہ ہاشمی مشرقی تہذیب وتمدن اور اقدار ومعیار کی برتری کی قائل ہونے کے باوجود مکمل طور پر اس کو من وعن قبول نہیں کرتیں۔ بلکہ وہ ان تمام روایات و اقدار کی بھر پور مخالفت کرتی ہیں جو عدل و انصاف پر مبنی نہیں ہیں۔ یا جو عورتوں کے حقوق اور ان کی اہمیت وحیثیت کو مسخ کر دیتی ہیں، لیکن خاص طور پر مردوں کے تشکیل کردہ سماج اور خود ساختہ اصولوں کے خلاف، جن میں عورتوں کی حیثیت ثانوی بھی نہیں رہ پاتی، جمیلہ ہاشمی نے صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ چوں کہ اس طرح کے ایک طرفہ سماج میں معصوم عورتوں کی زندگیاں عذاب جان بن جاتی ہیں۔ بلکہ ہندوستان کے غلط رسم و رواج نے نہ معلوم کتنی زندگیوں کو تباہ و برباد کیا اور دکھوں اور آنسوؤں کے سمندر میں نہ جانے کتنے وجود فنا ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ جمیلہ ہاشمی نے مغرب کی بعض اچھائیوں کو سراہا ہے۔ وہ کہتی ہیں۔

''یہ یورپ کی زندہ قوموں کا طریق ہے۔ میری ششما بھابی اگر ودھوا

ہوجاتی ہے تو اسے دھتکار دیا جاتا ہے۔ روتھ کی ممی اگر بیوہ ہوجاتی ہے تو مسیح کا پیغام لے کر دنیا کے کناروں پر گھومنے لگتی ہے۔ بتاؤ عورت کا ایمان کون کرتا ہے۔ دھتکار کرنے والا یا اسے روشنیوں سے آشنا کرنے والا۔'' (53)

رضیہ فصیح احمد کا ناول ''آبلہ پا'' ادبی انعام یافتہ ہے۔ جس میں ایک ترقی پذیر اور مغرب زدہ معاشرے کی ازدواجی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس ناول میں رومانی فضا کی شدت اور حسن و عشق کے معاملات بھر پور طریقے پر بیان کیے گئے ہیں۔ پاکستان کے تبدیل شدہ نئے معاشرے میں مغربی طرز رہائش اور انگریزی تہذیب وتمدن کا گہرا اثر ہے۔ اسد اور صبا دونوں کو ناول میں مرکزی کردار کی حیثیت حاصل ہے۔ اسد کا کردار صبا کے بالکل برعکس یا ضد کہا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ صبا مشرقی قدروں کی امین اور ہندوستانی عورت کی علامت ہے۔ جب کہ اسد مغربی تعلیم اور تہذیب کا شیدائی اور دیوانہ ہے۔ اس طرح سے دونوں کے کردار کو جدید و قدیم نظریات کے مابین تصادم کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ جو ناول کا موضوع بھی ہے۔ ''آبلہ پا'' میں چمنستان ہوٹل معاشرے کی علامت کے طور پر بیان ہوا ہے۔ یہاں ہر طبقے کے کردار موجود ہیں۔ جن کی تمام کیفیات کو رضیہ فصیح احمد نے فنی ژرف نگاہی سے پیش کیا ہے۔ ان کرداروں میں کروڑ پتی، لکھ پتی، نو دولتے، متوسط اور غریب گھرانوں کے افراد، بڑے طبقے کو خوں خوار نظروں دیکھنے والی گندی روایات کی اسیر دھوبنیں، مہترانیاں، بیرے، محنت کش لوگ اور دیگر افراد، سب کے سب اپنے حال میں مست دکھائی دیتے ہیں اور ناول کے پلاٹ کے اہم دائرے کے اندر چھوٹے چھوٹے دائرے بنا کر ناول کے منظر نامے سے غائب ہوجاتے ہیں۔

''آبلہ پا'' اور ''انتظار موسم گل'' دونوں ناولوں میں رضیہ فصیح احمد نے عورتوں کے سماجی اور معاشی مسائل اور ان کے حقوق کو بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

برصغیر میں اردو ناول
ڈاکٹر خالد اشرف

URDU NOVEL IN THE SUB-CONTINENT

برصغیر میں اردو ناول

ناشر : خالد اشرف (فون : ۳۲۸۷۶۸۲)

۲۲۱ ، غالب اپارٹمنٹس ، پتیم پورہ ، دہلی -۱۱۰۰۳۴

*

خوشنویس : امتیاز احمد

قیمت : ۲۲۰ روپئے

اشاعت : ۱۹۹۵

۲۶۵ ای گلشن راوی - لاہور فون : ۷۲۸۵۷۵۲

تقسیم کار : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی -۲۵

نصرت پبلشرز - حیدری مارکیٹ - امین آباد - لکھنؤ - ۲۲۶۰۱۸

ترتیب

مہم تیز کر دی۔ امام حسین کمزور اور کچلے ہوئے مسلمانوں کے علاوہ عیسائیوں اور یہودیوں سے بھی ہمدردی رکھتے تھے، اسی ہمدردی وانسانیت کے جذبے کو امیر معاویہ نے سازش اور اسلام دشمنی کا رنگ دے کر خوب تشہیر کی۔ مگر امام حسینؓ خاموش رہے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ بڑے بھائی کے قتل کے بعد اب امیر معاویہ اُن کے گرد اپنا شکنجہ کس رہا ہے۔ وہ اپنی شرافت اور نیک نفسی سے مجبور تھے چنانچہ گوشہ نشین ہو کر زیادہ تر وقت مطالعے میں صرف کرتے اور اپنے خاندان کو اتحاد اور توکّل کی تعلیم دیتے۔ وہ روز سب کو جمع کر کے حالاتِ زمانہ پر مباحثے کرتے تنگی وافلاس کی بنا پر اکثر فاقے بھی کرنے پڑتے مگر پیشانی پر بل نہ آتے۔

یہ سب دراصل امیر معاویہ کے پھیلائے ہوئے سیاسی جبر اور فاشزم کی ابتدا تھی کہ ہر طرح کے اختلافِ رائے اور حق گوئی کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیا جائے۔ دوسری طرف تمام معاشی قوت خلیفہ اور اس کے حاشیہ برداروں کے ہاتھوں میں جمع ہو گئی تھی۔

امیر معاویہ نے مرتے وقت خلافت یزید کو سونپ دی تھی اور یزید نے خلافت سنبھالتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ حضرت امام حسن پر دباؤ ڈلوایا کہ وہ اور ان کے افرادِ خانہ یزید کے ہاتھ پر بیعت کریں ورنہ اپنی موت کے لئے تیار ہو جائیں۔ امام حسین اہلِ کوفہ کے اصرار پر مدینہ سے ہجرت کر کے اپنے خاندان کے ساتھ کوفہ میں پناہ لینے کے لئے روانہ ہو گئے لیکن ۶۱ھ ہجری کے یکم محرم کو کربلا کے میدان میں یزید کے بھیجے ہوئے ہزاروں کے نرغے میں امام حسین اپنے بہتّر جاں نثاروں کے ہمراہ گھیر لئے گئے۔ یزید کے لشکر نے اس دستے کی عورتوں، بچوں اور نوجوان و بزرگوں، سبھی کا پانی بند کر دیا اور ایک ایک کر کے ان بے گناہوں کو شہید کر دیا۔ عصمت چغتائی نے اس ناول کو تاریخی ناول کے بطور تصنیف کیا ہے لیکن یہ قصہ فنی ضوابط کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔

جمیلہ ہاشمی نے دو تاریخی ناول ’چہرہ بہ چہرہ رو برو‘ (1977) اور ’دشتِ سوس‘ (1983) تخلیق کئے۔ ’چہرہ بہ چہرہ رو برو‘ میں مصنفہ نے ایران کے متوسط طبقے کی پابندیوں اور محدود اخلاقی اقدار کو موضوع بنایا ہے۔ ناول کی ہیروئن اُم سلمیٰ ایک مضطرب روح ہے جس پر قدغن لگانے کی تمام کوشش ناکام رہتی ہیں۔ وہ ایک گھریلو عورت کے دائرے سے نکل کر بابی عقیدے کے زیرِ اثر قرۃ العین طاہرہ بن جاتی ہے۔ ’چہرہ بہ چہرہ رو برو‘ اس کی روحانی بیقراری کی داستان ہے۔ یہاں ایران کی اسلامی تاریخ کی تہذیبی شکل کو پیش کیا گیا ہے۔

'چہرہ بہ چہرہ رو برو' قرۃ العین طاہرہ کے غیر روایتی طرز فکر اور آزادانہ زندگی کی داستان ہے۔ انیسویں صدی کے وسط کے ایران میں قاچاری خاندان برسرِ اقتدار تھا لیکن عالمِ اسلام میں نت نئے فرقوں اور نو بہ نو ابھرتی ہوئی علاقائی طاقتوں کے فتنے اس طرح سر اٹھا رہے تھے کہ کوئی بھی بادشاہت اپنے اقتدار کو محفوظ نہیں سمجھتی تھی۔ شاہِ وقت بیرونی طاقتوں کے ساتھ نبرد آزمائی میں اپنی ساری قوت خرچ کر رہا تھا۔ مگر اس کو روز ذلّت ناک معاہدوں پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ مقامی سطح پر عالموں اور مجتہدوں کا سیاسی رسوخ اس قدر زیادہ تھا کہ بادشاہ ان کی مرضی کا تابع ہو گیا تھا۔

صفوی بادشاہوں نے چونکہ پورے ایران کو اپنا عقیدہ اختیار کرنے کی طرف مائل کر لیا تھا اس لئے دربار کی تقلید کرنا رعایا کے لئے مستحسن ٹھہرا۔ اسی رسمی مذہبیت سے عوام کی عقیدت کی بنا پر آزادیٔ افکار اور شعر و ادب کا مقام نہایت غیر پسندیدہ ہو گیا تھا۔ مدرسوں اور خانقاہوں میں مذہبی تعلیم کے وہی فرسودہ اصول حفظ کرائے جاتے تھے جن کی راہیں کہیں نہیں پہنچاتیں۔ قاچار خاندان والوں نے بھی اس نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی۔

ایسے پابند معاشرے میں عورت کا مقام ذرا بھی اہم نہیں تھا خواتین کو عموماً بچوں کی پرورش اور دیگر خانگی امور تک ہی محدود رکھا جاتا تھا۔ گھروں سے باہر بے پردہ نکلنے، درگاہوں و خانقاہوں میں حاضر ہونے، کتابوں سے فیض یاب ہونے اور شاعری کا ذوق رکھنے کی بالکل اجازت نہ تھی۔

لیکن اُمِ سلمیٰ جو ابتدا ہی سے غیر پابند و لا محدود ذہن و فکر کی مالکہ تھی، ایران کے دستور کے خلاف اپنے باپ کے کتب خانے کا آزادانہ استعمال کرتی تھی اور ایسی حقیقتوں سے بھی آگاہ تھی جنہیں جاننا عورتوں کے لئے معیوب سمجھا جاتا تھا۔ وہ شعر کہتی تھی اور رُویا پر یقین رکھتی تھی۔ اس کو کلام حافظ از بر تھا اور سرود پر اسے گاتی بھی تھی۔ مروّجہ معاشرتی ضوابط کے لحاظ سے وہ فسق و فجور میں مبتلا تھی اور پہروں اس پر سُکرات کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ اس کے اشعار ائمہ اور معصومین کی توصیف میں نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ ایک بھرپور عشق کا افسانہ رقم کرتی تھی۔ رشتۂ ازدواج اُس کو راس نہیں آیا یہاں تک کہ اُس کی پیدا کردہ اولاد بھی اس کے پاؤں کی زنجیر نہ بن سکی۔

اُمِّ سلمیٰ کی آزاد روی اُس وقت اس کے معاشرے کے لئے بالخصوص ناقابلِ قبول ہو جاتی

ہے جب وہ شیخ کاظم رشتی کے دروس میں شرکت کے لئے نجف اشرف جانے کا تہیہ کر لیتی ہے۔
اُس کا خسر مُلا محمد تقی اسے اس سفر سے باز رکھنا چاہتا ہے لیکن ام سلمٰی خانگی اور دنیاوی ضوابط کے دائروں سے بہت دور اپنے رویا میں ڈوب کر اس قدر آگے نکل چکی تھی کہ اس کو روک پانا اب خدا کے سوا کسی کے بھی بس میں نہیں تھا۔

لیکن ام سلمٰی کے نجف اشرف پہنچنے سے قبل سید کاظم کی موت واقع ہو چکی تھی چنانچہ ام سلمٰی نے، جسے کاظم رشتی نے 'قرۃ العین' کے خطاب سے نوازا تھا، یہاں آکر خود درس دینا شروع کر دیا۔ لیکن 'باب' سے ملاقات کا جنون ہمہ وقت اس کے ذہن و دل پر طاری رہتا تھا۔ کربلا میں اس کے دروس میں شرکت کے لئے دُور دُور سے لوگ آنے لگے اور اِس کے پہلو بہ پہلو اُس کی مخالفت بھی شدید تر ہوتی گئی۔ مُلا اور مُجتہد ایک عورت کی یہ شہرت اور بلندی کس طرح برداشت کر سکتے تھے؟ وہ شاعرہ جو اپنے اشعار سے مشرق و مغرب کے ایوانوں میں آگ لگا سکتی تھی، اُس نے اپنی سُخن گوئی، حُسنِ بیان اور حُسنِ احساس کو ایک نئے پیکر میں ڈھالا تھا۔ معراج میں رسولِ پاکؐ افلاک کی سیر کر آئے تھے لیکن وہ اپنے محبوب کو اُس سے بھی پرے دیکھنے کی خواہشمند تھی۔ اس کا محبوب علی محمد باب بھی اُس کی طرح قادر الکلام شاعر تھا ______ وہ گویا رب تھا اور خداؤں کا ایک گروہ اس کے گرد یکجا ہو رہا تھا ______ باب الباب قدوس۔ جناب قائم اور قرۃ العین طاہرہ جو حرفِ حیّ تھی۔ وہ سب اس شجرِ حقیقت کی شاخیں تھیں۔

جب بابیوں کی تنظیم و تبلیغ کی نے خطرناک حد سے تجاوز کر گئی تو اُن کو بغداد سے ترکِ وطن کرنے کا حکم دیا گیا کیونکہ وہ نہایت سُرعت کے ساتھ ایک نئے مرکز کی شکل میں ابھر رہے تھے۔ حکومت نے 'باب' کو ماکو کے بعد چہریق کے قلعے میں قید کر دیا تھا۔ اور اُس کے پیرو کار عرب و عجم کی سرزمینوں پر بغاوتیں کرتے پھر رہے تھے۔ اس لئے بابیوں پر ہر قریے اور ہر خطّے میں زمین تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ علما اور مجتہدین بالخصوص قرۃ العین کے عورت ہونے کی بنا پر اُس کی جان کے گاہک بنے ہوئے تھے:

"کرمان شاہ میں عُلما بگڑ گئے تھے۔ مُلا اس سے روا داری کا سلوک کرتے رہے تھے۔ اُنھوں نے اب اُس کے باپ کو ایک برق رو قاصد کے ھاتھ پیغام بھجوایا کہ وہ علمی صلاحیت نہیں

صرف دیوانگی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ یہ کوئی مذہب نہیں، قرآن پاک کی آیتوں کی تاویلیں ہیں۔ ماکو میں 'باب' کے پاس جانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں، آپ اسے آکر لے جائیں۔ گھر کی زندگی کے لئے ضروری ہے کہ اسے بابی مذہب کی تبلیغ کرنے کی بجائے قزوین میں رکھا جائے۔ عورتوں کو آزادی دینے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ کسی کام کی نہ رہیں اور جہاں پر جی چاہے پھریں۔ آزادیٔ افکار تو خوب ہے مگر یہ آزادی جس کا مظاہرہ ہو رہا ہے قابلِ قبول نہیں۔" (چہرہ بہ چہرہ رو برو: ص ۴۶)

لیکن قرۃ العین اس قسم کے دباؤوں کے آگے سرِ مُو بھی نہیں جھکتی بلکہ علی الاعلان 'باب الباب' سے اپنے عشق کا اعلان کر دیتی ہے۔ اسے قزوین ہی میں گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ لیکن رہائی پاکر وہ اپنے تمام سابقہ رشتے منقطع کرکے پھر گھر سے فرار ہو جاتی ہے۔ محمد شاہ قاچار کی وفات کے بعد بابیوں کے دلوں میں اقتدار اور منصب کی طلب بھی جاگزیں ہو گئی تھی چنانچہ بابیوں کو جگہ جگہ قید و بند اور موت کی صعوبتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ شاہ ناصرالدین پر بابیوں کے ذریعے کئے گئے قاتلانہ حملے کے بعد سے بابیوں پر ریاستی ظلم اور جبر مزید بڑھ جاتا ہے۔ مُلّا محمد سے رشتۂ ازدواج منقطع ہونے کے بعد قرۃ العین محمد علی بارفروش سے باقاعدہ سلسلۂ مناکحت قائم کر لیتی ہے اور ایک عام عورت کی طرح اس کو ایک مضبوط سہارا مل جاتا ہے۔ اُدھر ناصرالدین جو عورتوں کا شیدائی تھا، اُس کو ملکہ بنانے کا پیغام بھیجتا ہے جسے وہ مسترد کر دیتی ہے۔

بادشاہ کی انا کو اس انکار سے مزید ذلت اور تکلیف پہنچتی ہے اور قرۃ العین کو اس کے حکم پر گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ پھر اس کی لاش کو کنویں میں پھینک کر سنگسار کیا جاتا ہے۔

'چہرہ بہ چہرہ رو برو' تاریخ زیادہ ناول کم نظر آتا ہے کیونکہ اس میں اطلاعاتی مواد کا بوجھل پن قصے کو مجروح کرتا ہے۔ اقبال کے اشعار اور عزیز احمد کے افسانے 'زریں تاج' سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ناولٹ میں مصنفہ کی ذاتی ترجیحات و تعصبات کے نقوش بھی جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ قرۃ العین طاہرہ کا کردار تاریخ کے دھندلکوں میں اسیر

ہونے کی بنا پر غیر واضح ہے۔

جمیلہ ہاشمی کا دوسرا تاریخی ناول 'دشتِ سُوس' بغداد کے درویش وصوفی حسین بن منصور حلاج سے متعلق ہے۔ منصور 858 عیسوی میں ایران کے شہر طُوس میں پیدا ہوا تھا۔ ابتدا ہی سے اس کے خیالات غیر روایتی اور شاعری باغیانہ تھی اسی لئے قرآن شریف کی نئی تفسیر کی۔ کچھ لوگ اس پر شعبدہ گری کا الزام بھی لگاتے تھے۔ شریعت کے معاملات میں وہ حضرت سُہیل تستری کا شاگرد تھا۔ پھر المکّی کے حلقۂ ارادات میں شامل ہوا۔ بعدازاں جُنید بغدادی کے مدرسے میں گیا لیکن انہوں نے اسے دیوانہ قرار دے کر اپنے حلقے میں شامل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بصرہ میں شادی کی اور وہیں کچھ عرصہ شیعت کے زیر اثر بھی رہا۔ تصوّف کے عقیدے کے لحاظ سے منصور وحدت الشہودی تھا اور انسان کی ذات کے اندر ہی خُدا کے وجود کو تسلیم کرتا تھا، اسی لئے اس کے نظامِ فکر میں انسان کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ بغداد میں جب اُس پر برسرِ اقتدار معتزلہ فرقے اور اہل تشیّع نے رعایا کو گمراہ کرنے اور حکومت کے خلاف بھڑکانے کے الزامات لگائے تو منصور خراسان چلا گیا۔ پھر دوسرا حج کرنے کے بعد ہندوستان آیا جہاں ہندو فلسفہ کا مطالعہ کیا۔ علاوہ ازیں ترکستان میں بُدھ مذہب کا مطالعہ بھی کیا۔ 902 عیسوی میں مکّہ میں تیسرا حج کرنے کے بعد بغداد واپس آکر اپنے گھر میں منصور نے خانۂ کعبہ کا ایک ماڈل بنایا تھا۔ وہ رات کو عبادت کرتا اور دن میں تبلیغ'

سیاسی طور پر یہ وہ دور تھا جب تمام عرب میں بغاوتیں بپا ہو رہی تھیں اور نئے نئے فرقے عباسی حکومت کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ منصور کے غیر روایتی افکار اور اس کے پیروکاروں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے حکومت خوفزدہ تھی۔ ایسے میں اس نے 'انا الحق' کا نعرہ بلند کر دیا۔ عوام اُس کو قطب سمجھنے لگے تھے۔ منصور کو نو سال تک قید میں رکھا گیا، پھر اس پر زندیق اور مشرک ہونے کا الزام لگا کر 922ء میں دجلہ کے کنارے مصلوب کر دیا گیا۔ حُسین کا باپ منصور ایمان لایا تھا جبکہ اس کا دادا محمّی آتش پرست تھا۔ ایک عرصے تک منصور اپنی غیر معمولی صلاحیتوں اور مخفی قوتوں کے بدولت عباسی خلیفہ معتضد کا معتمدِ خاص بھی رہا۔ لیکن دربار کی سازشوں اور بغداد کے باہر پھیلے ہوئے ہزارہا فتنوں سے اکتا کر منصور مکّہ معظمہ میں تحصیلِ علم اور ریاضت کے لئے ہجرت کر جاتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب اسلامی خلافت کے طول وعرض میں بغاوتیں پھیلی ہوئی تھیں قرمطی اپنے عقائد اور اپنی دعوت کو اتنی سُرعت کے ساتھ پھیلا رہے

تھے کہ گمان ہوتا تھا کہ ایک نیا دین وجود میں آیا ہے جو اسلام کو صرف بغداد کے نواح میں محدود کر دے گا۔ معزول شدہ حاکم، مغرور ملزم اور مختلف عقائد کے پیرو، حاجیوں کے قافلوں پر حملے کرتے اور ان کے مال و اسباب کو لوٹ کر لے جاتے تھے۔ اُدھر قحطائیت، عدنانیت علوئیت، بکریت، ہاشمیت، اموئیت، عربیت اور قومیت کی آگ مسلمانوں میں لاوے کی طرح اندر ہی اندر سُلگ رہی تھی جو حکام کی سیاست اور نظامِ حکومت کے لحاظ سے ہلکی اور تیز ہوتی رہتی تھی اور اس ساری تگ و دو کا مقصد قیادت اور امامت کی طلب تھی۔ جو شخص زمانۂ جاہلیت میں سردار تھا وہ اسلام میں بھی سردار بننا چاہتا تھا۔

دسویں صدی کا بغداد تصوّف اور درسِ نظامی کا بہت بڑا مرکز بھی تھا۔ بغداد میں صوفیا اور اذکیا کا یہ نہایت معمور دور تھا۔ مسجدیں اور خانقاہیں، مدرسے اور زاویے ان سے آباد تھے۔ استادانِ فن اور فلسفی اپنے اپنے شاگردوں کی بھیڑ میں شاموں کو دجلہ کے کنارے باغوں میں فروکش ہوتے اور بحث و مباحثے کی نشستیں جمتیں، اعتقادات و مذاہب کا ایک ایک مسئلہ زیرِ بحث لایا جاتا۔ انسان اور اس کی حدود، ممکنات اور کائنات، خدا اور اُس کی ذات سب پر مدلل اور طویل مباحث کی مجالس ہوتیں جن میں یہودی اور نصرانی بھی حصّہ لے سکتے تھے اور اپنے بڑے بڑے مدارس سے محض ان میں حصہ لینے آتے تھے۔ مقابلہ اور مکالمہ سب کی اجازت تھی۔ یہ ایک ایسی آزاد دنیا تھی جس کے دروازے کسی پر بند نہ تھے۔

مکّہ معظمہ سے بغداد واپس پہنچنے پر حُسین بن منصور عشقِ خداوندی میں اس قدر ڈوب چکا تھا کہ خود کو 'انا الحق' کہتا تھا۔ اہلِ شریعت اور اہلِ طریقت کے چند حلقوں میں اس کی مخالفت زور پکڑ گئی۔ اس کے مخالفین نے اس پر تکفیر کے علاوہ فریب کاری اور شعبدہ گری کے الزامات بھی لگائے۔ بالآخر ۹۱۹ء میں اسے وزیرِ مملکت حامد بن عباس کی ذاتی رنجش کی بنا پر قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ حلاّج پر جو الزامات عائد کئے گئے تھے ان میں سب سے دلچسپ الزام خطاّطی کے وہ نمونے تھے جن پر چین کے نایاب کاغذوں پر پُراسرار انداز میں اسمائے الٰہی مرقوم تھے اور جو اُس کے مُریدوں کے گھروں پر چھاپے مار کر برآمد کئے گئے تھے۔ چونکہ دربار میں حلاّج کے حامی اور عقیدت مند موجود تھے اور جہاں اس کا دشمن حامد بن عباس برسرِاقتدار تھا، وہیں اُس کا مداح وزیر ابن عیسیٰ بھی موجود تھا۔ اسی لئے برسہا برس تک

اُس کے مقدمے کا فیصلہ نہ ہو سکا۔

عباسی دورِ خلافت میں تمام ترقی علوم و فنون اور ظاہری آرائش اور ہیبت و سطوت کے باوجود شخصی آمریت کے تمام عیوب اور تاریک پہلو موجود تھے۔ جن کو پوشیدہ رکھنے کے لئے خلیفہ اور رعایا کے درمیان ترسیل تقریباً ناممکن بنادی گئی تھی کیونکہ دربار کے متوسلین کے مفادات کی تکمیل اسی طرح ہو سکتی تھی :۔

"بنو امیہ کے زمانوں کی بدویت آلِ عباس کے وقتوں میں جمی جمائی شہری زندگی میں بدلی، مزاج بدلے، سادگی کی جگہ پُرکاری نے لی، عمارتوں میں جاہ و جلال، شان و شوکت اپنے انتہائے کمال کو پہنچے۔ علم و فضل کے بحرِ ذخّار یونان اور روما کے علوم سے لولوئے لالہ سے پُر ہوئے۔ ہیبت و سطوت میں، شرافت و نجابت میں، سخاوت و دولت میں ساری دنیا کمتر تھی اور بغداد اپنے مدرسوں، خانقاہوں، مسجدوں میں پھیلی ہوئی بھول بھلیّوں جیسی گلیوں بازاروں اور شاہراہوں کے سبب دنیا کو سمیٹے ہوئے تھا۔ ـــــــــــ
دربار زندگی کا محور تھا اور اُس تک رسائی مُشکل نہ ہونے کے باوجود تقریباً ناممکن تھی۔ جیسے حجاب اندر حجاب دیوار در دیوار احاطے ہوں۔ سیاست کے اپنے اصول ہیں اور انہی کا کھیل تھا کہ عام لوگوں کی پہنچ سے حاکم اور حاکم کی رسائی عام لوگوں تک محال ہو۔ تاکہ اصل واقعات کی ناخوشگواریوں کا علم نہ حاکم کو ہو سکے اور نہ ہی عوام اپنی داد رسی تک پہنچیں۔ اگر عام آدمی اپنے حاکم کی محفل میں جا پہنچے اور یا شیخ کہہ کر اُسے مخاطب کر سکے تو پھر وہ لوگ جو واسطہ بننے سے ہی زندہ رہتے ہیں اُن کی جگہ زیرِ آسمان کہاں ہو۔"

(دشتِ سوس: لاہور، ۱۹۸۳ء ص ۱۳۲)

مُقتدر باللہ کے دورِ خلافت تک آتے آتے بغداد کے حالات نہایت مخدوش ہو گئے تھے۔ مقتدر کو تختِ خلافت پر رونق افروز کرنے کا صلہ بیعت عباس بن حسن نے ایک

بڑی رقم خزانے سے نکال کر حاصل کیا تھا۔ دربار کے معاملات میں نوجوان خلیفہ کی ماں شغب کا عمل دخل بہت زیادہ تھا۔ ترک دربار میں اور بغداد سے باہر قرامطہ پھیلے ہوئے تھے۔ زندگی درہم برہم تھی اور ایسے میں ہر وزیر اور امیر اپنی گردن بچانے کی فکر میں تھا۔ بغداد کی حکومت کی مخالف مغرب میں فاطمی حکومت مستحکم طور پر قائم ہو چکی تھی جس کا خلیفہ عبداللہ المہدی حضرت جعفر صادق کے بیٹے امام اسمٰعیل کی امامت کا قائل تھا۔ مغرب میں اس سلطنت کے قیام کے ساتھ ہی یمن، بحرین، عراق اور خراسان میں مدتوں سے معروف مختلف عقائد کے مبلغین نے بھی اس آزادی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کھلی فضا میں پروازیں شروع کر دی تھیں۔

نوجوان خلیفہ مقتدر باللہ کے نزدیکی حلقے میں وزیر مملکت حامد بن عباس کو دوسروں پر فوقیت حاصل تھی۔ حالانکہ خلیفہ کی ماں حامد کی سخت گیری اور کینہ پروری کے باعث اُس کو ناپسند کرتی تھی لیکن حامد کی تنہائی پسندی اور لامحدود وفاداری نوجوان خلیفہ کو اس کے بہت سے جائز و ناجائز اقدامات کا احتساب کرنے سے باز رکھتی تھی۔

لیکن اس کامیابی اور کامرانی کے باوجود حامد کی زندگی پرسکون نہ تھی۔ بنانے اور بگاڑنے، دربار کی سیاستوں میں دوستوں اور دشمنوں کی تعداد کا حساب رکھنے اور ترقی کی جدوجہد کرتے رہنے میں ایک زمانہ گزر گیا تھا۔ اُس کے بالوں کی سیاہی میں راکھ نے اپنے دامن جھاڑے تھے اور دجلہ کے کنارے اپنے محل میں جہاں وہ ہر وقت محافظوں، سالاروں، خوشامدیوں، غلاموں اور خوبصورت کنیزوں سے گھرا رہتا تھا، وہ بالکل اکیلا تھا۔ کیوں کہ کوئی اس بھیڑ میں اس کا غمخوار و ہمدرد نہ تھا۔ اُس کا بیٹا حسین اسے چھوڑ کر مغرب میں عبداللہ المہدی کے پاس جا چکا تھا، اُس کی تربیت کے لئے حامد کی ساری کوششیں رائیگاں گئی تھیں۔ راہِ محبت میں اُس کی مایوسیاں المناک تھیں۔ اس کی بیوی اغول وفات پا چکی تھی اور آج اُس پر یہ راز کھلا تھا کہ اغول، حسین بن منصور حلاج پر فریفتہ تھی اور اس فریفتگی کے مظہر کے طور پر اس نے اپنے بیٹے کا نام حسین رکھا تھا۔

حامد بن عباس دشتِ تنہائی میں کھڑا تھا اور ریگِ رواں کے بھنور میں نہایت آہستہ آہستہ ڈوب رہا تھا۔ اُس کی ساری زندگی لایعنی اور لاحاصل ہو چکی تھی۔ عبداللہ المہدی کے ہاتھوں اٹھائی ہوئی فوجی شکست اور ذلت نے اُس کو مزید دل برداشتہ اور پریشان

کر دیا تھا۔ عبداللہ المہدی نہایت درویش صفت، پہاڑوں کا سا حوصلہ رکھنے والا حاکم اُس کی فوجوں کے لئے ایک آتشیں دیوار ثابت ہوا جس سے ٹکرا کر ساری فوج خاک ہو گئی۔ خود حامد نہایت مشکل سے جان بچا کر بغداد کی طرف پلٹا تھا۔ ان ہزیمتوں اور مایوسیوں نے حامد بن عباس کو نہایت چڑچڑا اور غصیل بنا دیا تھا۔ ایسی بے بسی اور نامرادی کے عالم میں صرف حسین بن منصور سامنے تھا جس سے حامد اپنی ذاتی زندگی کی ناکامیوں کا انتقام لے سکتا تھا جس کے لئے اُس نے کفر اور شرک کے الزامات تراشے۔ ادھر منصور کا 'انا الحق' پکارنا اور دین کو برقرار رکھنے کے لئے شریعتی شیطان کے وجود کو لازم قرار دینا اکثر مذہبی حلقوں میں منصور کے لئے مصائب و آلام کی تحریک کی ابتدا کا باعث بن گیا تھا۔ دوسری طرف اس کے عقیدت مندوں کی کثیر تعداد اُس سے دعا اور شفا کی طالب ہوتی تھی۔ اس کی ذکر کی محفلوں میں شرکت کرنے والوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی اور ایک اژدھام اس کی ذات سے مستفیض ہونے کے لئے اُس کی خوشنودی کا منتظر رہتا تھا۔ لوگ اُس کے 'انا الحق' کو شک کی نظروں سے دیکھتے اور پھر اُس کے معتقد ہو جاتے تھے۔ وہ تماشا بن گیا تھا۔ اسرارِ جہاں اور اسرارِ حال کی فہم نہ رکھنے والی بدعقیدہ خلقت اس کے چاروں طرف امنڈ رہی تھی اور اس نے لباسِ ظاہری کو تار تار کر دیا تھا اور خودی کا پیرہن چاک کر ڈالا تھا۔

حامد بن عباس نے اپنی شکست کی جھنجھلاہٹ اور ذاتی زندگی کی مایوسیوں کا انتقام حسین بن منصور سے لینے کے لئے اسے گرفتار کر کے نم و تاریک تہہ خانوں میں قید کرایا اور اُس کو آرام دہ زندگی و تعیشات کا لالچ بھی دیا لیکن حسین بن منصور ان حدود سے گزر چکا تھا:۔

"وزیرِ اعلیٰ حامد بن عباس۔ کیا اِس دارو گیر کے زمانے میں یہ مسلک اتنا اہم مسئلہ ہے کہ اس کے لئے میں نصف شب کو بلایا جاؤں؟"

حُسین کی آواز خالی کمرے میں گونج گئی۔

"تمہاری جگہ صرف اور صرف جہنم ہے"۔ حامد نے زور سے کہا۔

"میں تو یہاں بُلایا ہوا آیا ہوں" حُسین نے نہایت آہستگی سے کہا حامد نے حلق سے عجیب آوازیں نکالیں مگر اُس نے کچھ

کہا نہیں۔

"تمہیں معلوم ہے ابلیس کی پرستش کی کیا سزا ہے؟" کافی دیر کے بعد وزیر اعلیٰ نے کہا۔

"میں ابلیس کا پرستار نہیں ہوں اُس کی ہمّت کا قائل ہوں۔ مگر سزا اگر مقدّر میں ہے تو اس کے لئے بھی تیار ہوں۔"

"تم سزا کا مفہوم اگر جانتے تو اس سے پناہ چاہنے کی استدعا کرتے عمیق ترین جہنّموں سے بھی زیادہ تکلیف دہ۔ بخدا تمہارا ایک ایک جوڑ کاٹا جائے گا۔ پارچہ پارچہ گوشت علیحدہ کیا جائے گا۔ روئیں روئیں سے الگ الگ جان نکلے گی۔ کیا اس اذیّت کی برداشت ہوگی؟"

حُسین کا چہرہ کِھل اٹھا مگر اس نے سر اٹھا کر نہیں دیکھا۔"

(دشتِ سوس: ص ۲۷۷)

حامد نے حسین بن منصور کو اپنے محل کے اُن تاریک و تنگ تہہ خانوں میں ڈال دیا جہاں ہوا کا گزر تک ممکن نہ تھا لیکن ایک گدڑی پوش فقیر کے ہاتھوں شکست اٹھانے کا احساس اُس کے ذہن پر آسیب کی طرح مسلط تھا۔ بیٹے کی موت جس کی اطلاع بھی اُس تک سالوں میں پہنچی تھی اور جس کی لاش تک اس کو دستیاب نہ ہوئی تھی، حامد کے لئے مزید دل برداشتگی اور جھنجھلاہٹ کا سبب بن گئی تھی۔ رہ رہ کر حامد بن عباس، حسین بن منصور سے اپنی شکست اور مایوسی کا انتقام لینے کے طریقے سوچتا مگر منصور ایسا دیوانہ تھا کہ جو دنیاوی سزا و جزا کے دائرے ہی سے نکل چکا تھا۔

حامد مغرب کی شکست سے کے داغ کو مٹانے کے لئے کفر اور الحاد کے نام نہاد فتنے کا قلع قمع کرنے پر بضد تھا تاکہ خلیفہ مقتدر کی نظروں میں سرخروئی حاصل کر سکے۔ اسی لئے اس کی آنکھ چہار سو کفر اور شرک دیکھ رہی تھی یہاں تک کہ اس کے نزدیک بغداد کا مدرسۂ نظامیہ بھی مُشرکوں، زندیقوں اور آواگون میں یقین رکھنے والوں کا مسکن بن گیا تھا۔ وہ اس کام میں قاضی ابو عمر سے مدد کا طلب گار تھا اور قاضی ابو عمر اس کے اقتدار سے خوفزدہ ہو کر اس کی اطاعت کرنے پر مجبور تھا۔ چنانچہ عدالت میں حامد بن عباس کے خریدے ہوئے اور خوفزدہ

علماء و مشائخ حسین بن منصور کے خلاف کفر کا فتویٰ دیتے ہیں :۔

" حامد نے قلم پھر قاضی ابو عمر کے ہاتھ میں دے کر کاغذ سامنے کر دیا۔" آپ اس پر لکھ دیجئے "

" مجھے سوچنے غور کرنے کا موقع دیجئے وزیر مملکت "۔ قاضی ابو عمر نے جھنجھلا کر کہا۔ قاضی ابو الحسین الا شنائی نے کہا۔" جب آپ ایک بات کہہ چکے ہیں تو اس کو لکھ دینے میں کیا حرج ہے ؟ "

شحنہ نے ذرا سختی سے کہا۔" قاضی ابو عمر ۔ جو بات ایک بار آپ کی زبان سے نکل گئی سو نکل گئی ۔ وہ ٹھیک ہے ۔ جائز ہے ۔ سوچ کر کہی گئی ہے ۔ آپ قضات کے نہایت اعلیٰ منصب پر ہیں۔ کیا کوئی بات سہواً کہہ سکتے ہیں؟ "

حسین کہتا رہا " میرے معاملے میں اللہ سے ڈرو۔ میری پشت مضبوط ہے ۔ میرا خون بہانا حرام ہے "

زرد رو آقائے رازی اپنا راستہ بناتا ہوا بھیڑ کو دائیں بائیں سے ہٹاتا ایک ایک بالشت آگے بڑھتا اس کے قریب آرہا تھا ۔ لوگ یونہی شور مچا رہے تھے :" حلال الدم ۔ حلال الدم " ایک طرف سے آواز آرہی تھی " ناجائز' ناجائز"۔ محض سنی ہوئی باتوں اور مفروضوں پر کوئی قابلِ گردن زدنی نہیں ہوتا "

" خاموش ـــــــ بغداد کا شحنہ دھاڑا۔ سوائے قاضی ابو عمر کے کسی کو کوئی بات کہنے کا اختیار نہیں اور نہ ہی کوئی بات در خور اعتنا ہے "

" جو آپ نے کہا ہے' جو آپ نے سوچا تھا۔ جو فتویٰ آپ نے دیا تھا اُسے لکھ دینے میں کیا قباحت ہے ۔ یہ روز روز کا فتنہ ہے ۔ یہ کفر اور الحاد کا داعی ۔ یہ معتزلی ۔ زندیق ۔ قرمطی ۔ فاجر ۔ گمراہ کرنے والا شخص زمین کے سینہ پر بوجھ ہے ۔ قاضی ابو عمر ـــــــ ' انا الحق ' کہنے والا جاہے وہ دیوانگی میں ہی کیوں نہ کہے قابلِ تعزیر ہے ۔ آپ کس

طاقت سے خوف زدہ ہیں؟ اور کیوں؟ لکھئے۔" اس نے قلم اُن کے ہاتھ میں تھما دیا اور دوات خود پکڑے رہا۔ "لیجئے۔ قلم کو روشنائی میں ڈبو کر لکھئے۔"

قاضی ابوالحسین نے کہا۔ "قاضی ابو عمر۔ اگر وزیرِ مملکت مجھے کہتے تو میں لکھ چکا ہوتا۔ جب آپ ایک فتویٰ دے چکے ہیں تو لکھنے سے کیسا گریز؟" (دشتِ سوس، ص ۴۶۱)

ایسے دباؤ اور سازش کے ماحول میں وہی انجام ہوا جو ہونا تھا۔ قاضی ابو عمر نے حسین بن منصور کی موت کے پروانے پر دستخط کرنے پر خود کو مجبور پایا۔ کیونکہ حامد اتنا طاقتور اور کینہ پرور تھا کہ کوئی بھی اُس سے دشمنی مول لینے کا حوصلہ نہ رکھتا تھا۔ مادرِ خلیفہ شغب اور آقائے رازی حسین بن منصور کو بندی خانے سے فرار کرانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ عشق کے کاروبار میں موت کا گھاٹا اٹھانے کے لئے خود کو مجبور پاتا ہے اور فرار سے انکار کر دیتا ہے۔

بالآخر 922ء میں حسین بن منصور حلاج کو دریائے دجلہ کے کنارے بغداد کے 'باب خراساں' میں لایا گیا۔ جہاں اس کے ایک مدّاح نے پوچھا تھا کہ 'عشق کیا ہے'، تو اس نے جواب دیا تھا کہ 'یہ بات تمہیں آج کل اور پرسوں معلوم ہو جائے گی'۔ چنانچہ اُس روز اس کے بے جان و گوشت سے عاری جسم پر حامد بن عباس کے حکم کے مطابق ایک ہزار کوڑے لگائے گئے، دوسرے دن کُند چھری سے اُس کے ہاتھ اور پاؤں ریشہ ریشہ کاٹے گئے، پھر اُس کی گردن ماری گئی اور تیسرے دن اس کے سر بُریدہ لاشے کو دجلہ کے کنارے پُل پر لٹکا دیا گیا۔ اس کے قتل کے باعث تمام جہان اس خونِ ناحق میں ڈوبا ہوا لگتا تھا۔ حسین کے جسم کا ہر بُنِ مو 'انا الحق' پکار رہا تھا۔ فضا 'انا الحق' کی صداؤں سے یوں گونج رہی تھی جیسے ہر ذرّے کو دار پر کھینچا گیا ہو اور اس کے حلق سے گھُٹی گھُٹی 'انا الحق' کی آواز آرہی ہو۔ جیسے یہ ایک لفظ طبلِ جنگ کی طرح، نوبت کی طرح، نقارے کی طرح بجایا جا رہا ہو، اعلان کیا جا رہا ہو کہ سب طرف وہی ہے جو منصور کا محبوب ہے اور جس سے منصور کا وصال آج مکمل ہوا ہے۔

"حامد نے چیخ کر کہا۔ "جاؤ اور اُس کے جسدِ خاکی کو جلا دو۔ خاک اُڑا دو۔ اُس کی انا کو میں نے قتل کر دیا ہے۔ اب وہ کیسے حق کو پکارے گی۔" وہ پھر رقص کرنے لگا۔

عمّار نے سوچا، حامد بن عباس وزیرِ مملکت دیوانہ ہو گیا ہے۔
پھر وہ بھاگا اور اس نے خلقت کے ہجوم کو چیر کر راستہ بنایا۔
پُل کے ایک حصّہ کو توڑ کر جمع کیا اور اس کٹے ہوئے سر بریدہ
لاشے کو ان مثلہ کئے ہوئے بازوؤں اور پاؤوں کو اس ڈھیر پر
رکھ کر آگ لگا دی۔ ہجوم برابر نعرے لگا رہا تھا اور واویلا
کر رہا تھا اور ہوا میں شعلے اور چنگاریاں اور ذرّے 'انا الحق'
پکار رہے تھے۔ اتنی بہت سی آنکھیں اُس پر نگراں تھیں اور معتمی
کا پوتا حُسین خود آتشکدہ بن گیا تھا۔ تاکہ اس آگ کو فروزاں رکھ
سکے جو اسے خون کی امانتوں کے طور پر ملی تھی۔ وہ ایک شعلے میں تبدیل
ہو رہا تھا کہ خود شعلہ تھا۔ 'انا الحق' کہہ رہا تھا کہ وہ حق تھا۔
انا الحق۔ انا الحق۔ انا الحق۔" (دشتِ سوس: ص ۳۹۲)

یہ اُس شخص کا انجام ہے جس کی کتاب 'الطواسین' کے لفظ لفظ سے رسولِ خدا سے والہانہ محبت اور عشقِ خداوندی جھلکتا نظر آتا ہے۔ موت کے بعد بھی منصور حلّاج اور اُس کی تعلیمات کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ شاعر معرّی کے مطابق لوگ دجلہ کے کنارے اس انتظار میں کھڑے رہتے تھے کہ ابھی دجلہ کی لہریں منصور کے جسم کی راکھ کو واپس اُن کے سپرد کر دیں گی۔ جمیلہ ہاشمی نے اس ناول میں کہیں کہیں تاریخی حقائق سے چشم پوشی کی ہے تاہم ان کا یہ آخری ناول اردو کے اہم تاریخی ناولوں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے۔ دسویں صدی کے عباسی خلافت کے دور کو انہوں نے خوبصورت زبان و بیان کے سہارے دوبارہ زندہ کر دکھایا ہے۔

فیض احمد فیض کے مداح ڈاکٹر ایوب مرزا کا تاریخی سوانحی ناول 'دامِ موج' (1986) برصغیر ہند و پاک میں اشتراکی تحریک کے بانی امیر حیدر خاں کی حیات پر مشتمل ہے۔
ناول کا ہیرو راولپنڈی کے آس پاس کے سنگلاخ و بنجر علاقہ پوٹھوہار کے ایک غیر معروف گاؤں کا ایک غریب و یتیم بچہ ہے جو گزشتہ اٹھائیس برس سے ظلم کے خلاف ایک غیر استحصالی سوشلسٹ نظام لانے کے لئے جد و جہد کر رہا ہے۔ عمر رسیدہ ہونے کے باوجود
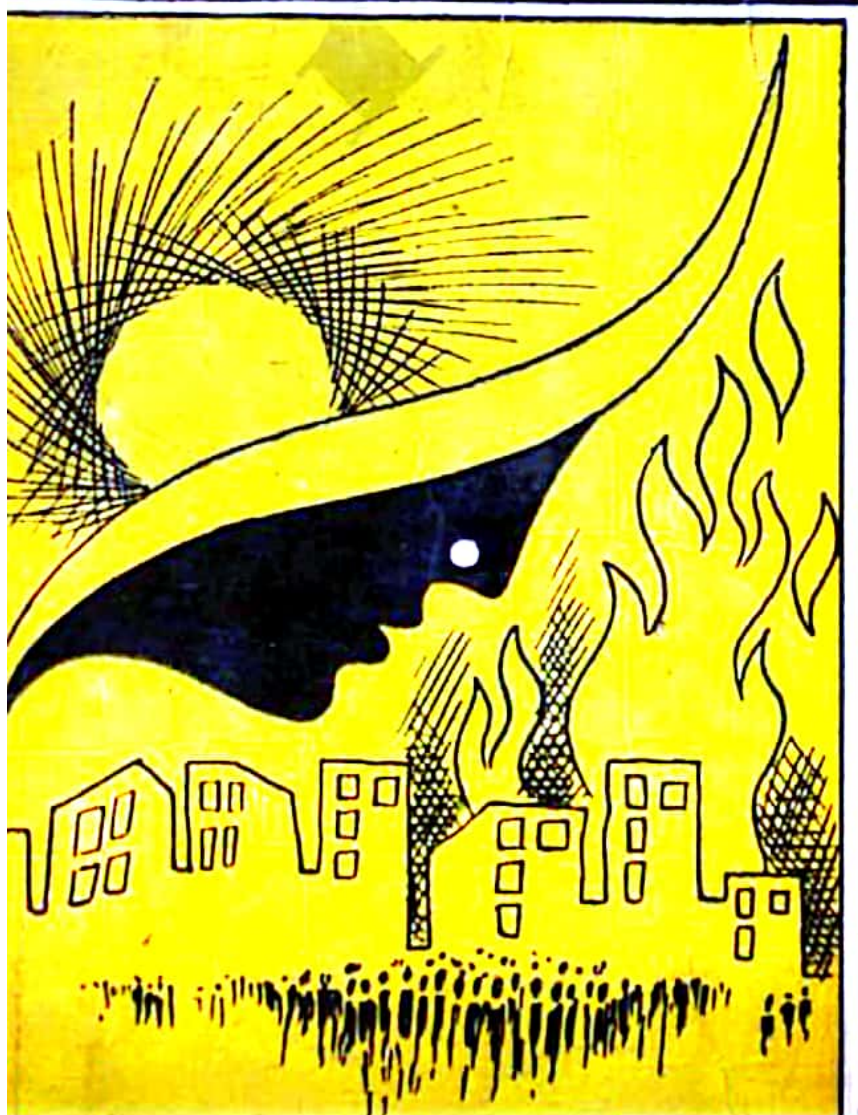
ڈاکٹر اسلم آزاد

اردو ناول آزادی کے بعد

ڈاکٹر اسلم آزاد

یونیورسٹی پروفیسر شعبہ اردو

پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ ۸۰۰۰۰۵

سیمانت پرکاشن

دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

جمیلہ ہاشمی

۱۹۴۷ء کے بعد اردو ادب میں کئی اہم ناولوں کا اضافہ ہوا۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو ناول کا سرمایہ تقسیم کے بعد ہی کئی تخلیقی کاوشوں سے وقیع اور قابلِ قدر ہوا ہے۔ فن ناول نگاری نے ماضی قریب میں خاصی ترقی کی ہے۔ کیونکہ ناول نگاروں نے انہماک اور تخلیقی سنجیدگی کے ساتھ قیمتی تجربات کئے، عصری حقائق اور ان کی پیچیدگیوں، سماجی آویزشوں اور حیات انسانی کی صداقتوں کو فن کارانہ حسن کے ساتھ اپنے ناولوں میں پیش کیا۔ میں ڈاکٹر خورشید الاسلام کے اس خیال سے اتفاق کرتا ہوں کہ [1]

"آزادی کے بعد ہندوستان میں افسانے اور ناول کے میدان میں بھی نئے تجربے ہوئے ہیں، ناول کی حد تک ہمارا ادب پاکستان کے مقابلے میں تہی دامن ہے۔"

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو کے بیشتر اہم ناول پاکستان میں لکھے گئے۔ خواہ اس کے جو بھی اسباب ہوں۔ چونکہ اس دور میں صنف ناول نگاری کو مقبولیت ملی اور اسے اہمیت اور امتیازی وقعت حاصل ہوئی۔ نتیجتاً کثرت سے ناول لکھے جانے لگے۔ ناول کی فنی وضع اور تکنیک میں ندرت اور نیرنگی پیدا کرنے کی کوششیں کی گئیں اور ناول کے موضوعات کو وسعتیں حاصل ہوئیں۔ اس دور میں بعض ایسے ناول بھی منظرِ عام پر آئے جنھیں قدر کی نگاہوں سے دیکھا تو گیا۔ مگر ان کی فنی حیثیت کوئی امتیاز نہیں رکھتی۔ جمیلہ ہاشمی کا ناول "تلاش بہاراں" ایسے ناولوں میں ایک ہے ۴۴۴ صفحات کے اس ناول میں فن کارانہ تجربات نے اظہار کی کوئی غیر معمولی کامیابی حاصل نہیں کی۔ ایک قوم بہاروں کی تلاش میں سو برس تک سرگرم عمل رہتی ہے اور ان عملی سرگرمیوں کا نتیجہ خونریزی اور فرقہ وارانہ فسادات کی شکل میں آتا ہے۔ ملک کی تقسیم کے المناک تجربے کو قرۃ العین حیدر نے "میرے بھی صنم خانے" میں جس فن کارانہ ہوش مندی اور حسن دانش کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے مقابلے میں یہ ناول کمزور ہے۔

جمیلہ ہاشمی نے کوشش تو کی ہے کہ "تلاش بہاراں" ایک مکمل فنی نمونہ بن کر سامنے آئے۔ ماحول

---

[1] اردو ادب آزادی کے بعد ص ۳۳

عکاسی میں تفصیل پسندی اور معاشرتی جزئیات کی وضاحت میں باریک بینی سے انھوں نے مصرف بھی لیا ہے۔ لیکن تکنیک میں سادگی کے باوجود واقعات میں فطری بہاؤ اور کرداروں میں جانداری نہ آسکی۔ قصے کی ابتدار رویندر کمار اور کرشنا بوس کے تنازعے سے ہوتی ہے۔ رویندر برہمن زادہ ہے اور کرشنا دش جذبہ محبت سے مغلوب ہوکر دونوں شادی تو کر لیتے ہیں مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد رویندر کمار کے والدین کی برہمنیت جاگتی ہے اور کرشنا بوس کو رویندر سے الگ کرنے کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے۔ اسی عدالتی کارروائی کے دوران کنول کمار ٹھاکر کا کردار منظر عام پر آجاتا ہے۔ کنول کرشنا بوس کی حمایت میں سرگرم ہوتی ہے خود برہمن خاندان سے تعلق رکھتی ہے مگر ذات پات کی تفریق سے بہت بلند ہے کرشنا کی بے عزتی اور توہین کو وہ عورتوں کے سماج کی توہین تصور کرتی ہے۔ یہیں سے ناول میں اس نے اپنے سفر کا آغاز کیا ہے۔ عورتوں کی بیداری کے لیے زندگی بھر لڑتی رہتی ہے اور ان کے مناسب حقوق کے لیے پر خلوص جدوجہد کرتی ہے۔ ناول مرحلۂ انجام میں داخل ہوتا ہے تو اس وقت بھی کنول کماری ٹھاکر اپنے کالج کی لڑکیوں بالخصوص مسلمان لڑکیوں کی حفاظت کرتی نظر آتی ہے اور خونریز فرقہ وارانہ فسادات کے دوران بھی سماج دشمن عناصر کا چیلنج قبول کرتی ہے اور آخر کار ان مسلمان لڑکیوں کی جان اور آبرو بچاتے ہوئے اسے اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ جس ہوسٹل میں یہ مسلمان لڑکیاں رکھی گئی تھیں ان کی حفاظت کے لیے خود کنول کماری پہرا دیا کرتی تھی۔ چندر شیکھر کے ساتھیوں نے ہوسٹل پر بموں سے حملہ کر دیا اور اسے آگ لگا دی۔

"میں" ناول کا اہم کردار ہے اسی کے ذریعے واقعات کی کڑیاں ملائی گئی ہیں اور اسی کے وسیلے سے ناول کے واقعات آگے بڑھتے ہیں۔ ناول چونکہ بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے اس لیے اس میں کہیں کہیں خطابت اور طوالت کے باعث بے کیفی کا احساس ہوتا ہے۔

کردار نگاری

"تلاش بہاراں" میں کرداروں کی بہتات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی کردار نگاری بے جان، بے اثر اور بے کیف ہے۔ کرداروں کی تشکیل و تعمیر میں فنی سلیقہ نظر نہیں آتا۔ ان کے اندر تنوع نہیں ہے اور نہ ذہن و احساس میں وسعت ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی طرح جمیلہ ہاشمی کے کردار بھی یک رخے ہیں اور "یک پن" میں زندگی بھر مبتلا رہتے ہیں۔ اس ناول کا مرکزی کردار کنول کماری ٹھاکر ہے۔ یہ مثالیت پسندی کا بہترین نمونہ ہے۔ دنیا کی تمام ممکن خوبیاں اس کے اندر موجود ہیں۔ خوبصورتی، ذہانت، لیاقت، ذہنی بیداری، خدمت خلق کا جذبہ، حریت پسندی، صحافیانہ صلاحیت انتظامی طاقت، سنجیدگی، متانت، پاکبازی، حق گوئی، بے خوفی، قوم پرستی، ملک دوستی، انسان پسندی، ایثار و خلوص وغیرہ خصوصیتوں پر مشتمل وہ ایک مثالی پیکر ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے اسے ایک آسمانی عورت بنا دیا ہے۔ ناول کی یہ ہیروئن اوصاف کا ایک مجسم ہے۔ مگر اس کے اندر زندگی کی حرارت نہیں ملتی۔ یہ پتھر کی ایک دیوی ہے۔ واقعات آگے بڑھتے ہیں وقت گذرتا جاتا ہے مگر اس کی جوانی، ذہانت اور حسن پر وقت کی رفتار کا

کچھ اثر نہیں ہوتا اسے مردوں سے کوئی جذباتی دلچسپی نہیں ہے اور شادی کو وہ ایک بیکار شے تصور کرتی ہے۔ ناول میں اس کے مرتبے کا کوئی دوسرا کردار نہیں ہے کنول کماری کے ارد گرد چلنے کردار نظر آتے ہیں۔ سب کے سب اس کا احترام کرتے ہیں مقدس سمجھتے ہیں اور اس سے محبت نہیں عقیدت رکھتے ہیں۔ ناول کے اخیر میں راوی کے خیالات پیش کئے گئے ہیں۔

[1] ''کنول کو کتنے لوگوں نے چاہا ہے۔ کنول کی شخصیت سے کتنے لوگ متاثر ہوئے ہیں کتنوں نے اس سے جل کر اس کی مخالفت کی ہے۔ کتنے اس کے دوستوں کی فہرست میں اس کے قریب رہنے کے لیے بیتاب رہے ہیں۔ کتنوں نے اس کی گذرگاہوں کی خاک کو ماتھے پر چڑھایا ہے۔ کتنے لوگ اس کے ہاتھ کے ایک لمس کے لیے بیقرار تڑپتے رہے ہوں گے۔ نہ جانے کتنے ہیں جو اپنے مرضوں سے شفا پا گئے۔ کتنوں نے اس کی نگاہوں سے سکون اور ٹھہر کر دھیرج سے انتظار کرنے کا سبق سیکھا ہوگا۔ وہ تو ایک درس تھی۔ درس عبرت نہیں اور پھر بھی ہم میں سے سب وہ سبق نہیں سیکھ سکتے۔ صرف اس پر ایک نظر کر سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ آسان نہ تھی، مشکل نہ تھی، وہ پردوں میں پوشیدہ نہ تھی۔ اس کی ساری زندگی ہمارے سامنے تھی، ہماری ساری نسلیں اس کا احسان مانتی رہیں گی۔ وہ جمنا کے کنارے ایک دوسرا تاج ہے محبتوں کا مقبرہ''

گویا کنول کا کردار ایک عجیب و غریب معمہ ہے وہ نہ آسان ہے نہ مشکل پھر آخر ہے کیا؟ ناول کے پہلے ہی حصے میں کرشنا بوس کی وکالت اور حمایت کرتی ہے تو اس کے خلاف اس کے دشمن سرگرم کار ہوتے ہیں اور اسے قتل کرنے کی اسکیم بناتے ہیں اس اسکیم کی خبر راوی کو ہو جاتی ہے اور وہ بڑی مشکلوں سے کنول کے گھر تک پہونچتا ہے تاکہ اس سازش کی اطلاع اسے مل جائے یہاں پہونچنے سے قبل ہی کنول کے گھر میں رات کی تاریکی میں چار آدمی داخل ہوتے ہیں کہ کنول کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔ راوی کنول کی زبانی اس حملے کی خبر سن کر سخت مضطرب ہوتا ہے لیکن کنول نہایت سکون کے ساتھ کہتی ہے۔

[2] ''کنول پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ آپ ناحق پریشان ہو جاتے ہیں۔ مجھے چار آدمیوں کا گھر میں گھسنا بالکل ایسا ہی لگا جیسے چار شریر اور گستاخ بچے رات کو اپنی بہادری کا مظاہرہ کرنے کی خاطر مارے مارے پھرتے میرے گھر میں پناہ لینے آ گئے ہوں''

کنول کماری کے ذریعے اس طرح کی کراماتی بہادری مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے ''تلاش بہاراں'' کا ہیرو ناول کا راوی یا ''میں'' ہے یہ کھل کر کبھی سامنے نہیں آتا۔ کنول کی پرستش کرتا ہے اور جذباتی گھٹن کا شکار بھی ہے۔ اس کا احترام کرتا ہے اور عقیدت کے جذبات سے سرشار بھی ہے۔ اس کے نزدیک کنول ایک ایسی دیوی ہے جس کا حسن و شباب دائمی ہے۔ ناول کی ابتدا ہوتی ہے تو راوی سے کنول کی

---

[1] تلاش بہاراں ص ۵۸۲

[2] تلاش بہاراں ص ۴۲

ملاقات پندرہ برسوں کے بعد ہوتی ہے اور اس ملاقات سے تقسیم ملک کے سانحہ تک کے اب بھی کنول ویسی ہے جیسی پندرہ برس پہلے تھی اور متعدد آزمائشات اور آلام سے گذرنے کے باوجود ناول کے اختتام تک ایسی ہی رہی۔ جمیلہ ہاشمی نے کنول کا ایسا آئیڈیل کردار تخلیق کیا ہے جس کا وجود اس جہاں آب وگل میں شاید ہی ہو۔[1]

"میں نے دیس دیس گھوم کر جتنی عورتیں دیکھی ہیں وہ ان سب سے بلند اور افضل ہے۔ اس کے پاس سچائی اور گہرائی ہے۔ وہ ہماری ماں، بہن اور بیٹی کی طرح قابلِ احترام ہے اور پھی ان سب سے الگ ہے۔ کوئی بات تو ہے کہ اس کے سامنے جاکر گناہ گار سے میری طرح سیاہ کار انسان نیکی کی شکتی کو ماننے لگتا ہے!"

"تلاش بہاراں" میں کمل کماری ٹھاکر اور راوی کے علاوہ کرشنا، شوبھا، میرا، دنیا رادھے کرشن، ڈون وارٹن، راجیندر، نروپما، بنیا من موہن، ہیرا بائی، چندر شیکھر اور گنگا دھر کے کردار قابل ذکر ہیں۔

رادھے کرشن شہر کا ایک با اثر اور معزز شخص ہونے کے باعث ہر جلسے اور پارٹی میں مدعو کیا جاتا ہے۔ دل کھول کر چندہ دیتا ہے۔ اور جلسوں کی صدارت کرتا ہے۔ کسی پارٹی میں کنول سے ملاقات ہوتی ہے تو اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کو منہ کی کھانی پڑتی ہے۔ رنگین مزاجی اور عیاشی کی وجہ سے وہ شہر میں بدنام بھی ہے۔ ایک دن بڑے پجاری کی منہ بولی بیٹی سندری اس کی ہوس کا شکار ہو جاتی ہے۔ بظاہر وہ خودکشی کر لیتی ہے لیکن اس کے دل میں انتقام کی آگ سلگتی رہتی ہے اور کچھ دنوں بعد رادھے کرشن کی بیٹی میرا کی گورنس بن جاتی ہے۔ میرا سندری سے گانا سیکھتی ہے اور اس کے ساتھ جو خوبرو طبلچی آتا ہے اس کے دام عشق میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ طبلچی دراصل سندری کا بیٹا ہے۔ رادھے کرشن ایک دن میرا اور طبلچی کو محبت آمیز باتیں کرتے دیکھ کر رات کی خاموشی میں میرا کو قتل کر دیتا ہے۔ سندری اس طرح رادھے اپنا انتقام رادھے کرشن سے لے لیتی ہے۔ رادھے کرشن سندری کو نہیں پہچاننا، اس کے گھر آکر رہنا اور میرا کو گانا سکھانا غیر فطری معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ سندری ایک زمانہ میں رادھے کرشن کے بہت قریب رہ چکی تھی۔ بہرحال رادھے کرشن جیسا شخص بھی کنول کے عقیدت مندوں میں شامل ہو جاتا۔ وہ جس تہذیب، معاشرے اور مزاج کی نمائندگی کرتا ہے اس کے پیش نظر میرا کا قتل بالکل فطری ہے۔

شوبھا نبرجی ایک فیشن پرست، آزاد خیال، عیش پسند اور آوارہ مزاج لڑکی ہے۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ اپنی انا کی تسکین کے لیے وہ ہر قدم پر کنول کماری ٹھاکر کی مخالفت کرتی ہے۔ اس کی راہوں میں

---

[1] تلاش بہاراں ص ۳۵۶

رکاوٹیں ڈالتی ہیں۔ اس کے ترقی پسند خیالات کا مذاق اڑاتی ہے۔ بہتان تراشی اور الزام طرازی سے بھی باز نہیں آتی۔ مغربی تہذیب و تمدن کی دلدادہ ہونے کے باعث غیر مردوں کے ساتھ آزادانہ گھومنا اور شراب پینا اس کے لیے معیوب نہیں تھا۔ لیکن شوبھا ایک حساس اور جذباتی کردار کی حامل ہے۔ لہٰذا وہ بعد میں کنول کی مداح اور پرستار بن جاتی ہے۔

انسان خود کو فریب دینے کے لیے نہیں کرتا سکون اور مسرت کی تلاش میں شہروں شہروں بھٹکتا ہے۔ شراب اور شباب کا سہارا لیتا ہے لیکن اسے کہیں قرار نصیب نہیں ہوتا اور یہ رشتے کچے دھاگے کے ثابت ہوتے ہیں۔

شوبھا اپنی دوست نورا اور اس کے بھائی ڈانیل کے ساتھ جب کشتی میں سوار ہوتی ہے تو ماجھی بابا چپکے سے اس کو کہتا ہے۔

ل "بیٹا یہ جینا نہیں مرنا ہے"۔

اس سے زیادہ ایک لفظ نہیں۔ اس سے کم ایک لفظ نہیں۔ ماجھی بابا نے مجھے گذرے زمانوں کے ویرانوں میں دوبارہ لا کھڑا کیا تھا۔ جہاں میں اکیلی تھی"۔

ڈون وارٹن ایک بے فکر، لاابالی اور صاف گو غیر ملکی ہے۔ سیٹی بجانا، گیت گنگنانا اور انگلیوں سے میز پر دھنیں بجانا اس کی عادتیں ہیں، جو دراصل اس کی فطرت، امزاج اور مغربی ذہن کی غمازی کرتی ہیں۔ لیکن بظاہر اتنا خوش رہنے والا انسان اندر سے کتنا ٹوٹا اور بکھرا ہوا ہے ٢ے

ڈون وارٹن چپ ہوگیا اور انگلیوں سے گیت بجا کر کوئی پرانا نغمہ الاپنے لگا۔ وہ بہت آہستہ سروں سے گا رہا تھا۔ مگر مجھے معلوم تھا اس نغمے میں درد تھا جیسے بلبل کے نغمے میں ہوتا ہے۔ جیسا ستار کے تاروں میں ہوتا ہے۔ جیسا دنیا میں رہتا ہے۔ دکھ کی زبان ساری دنیا میں ایک بالکل ایک"۔

چندر شیکھر اور گنگا دھر جیسے فرقہ پرست، رجعت پسند اور مسلم دشمن کردار ہر دور میں رہے ہیں۔ جنہیں مسلمانوں کے وجود ہی سے نفرت ہوتی ہے۔ ایسے لوگ کس طرح ترقی پسند، روشن خیال اور معصوم ہندؤں میں مسلمانوں کے لیے نفرت اور تعصب کا بیج بوتے اور ان کو گمراہ کرکے مسلمانوں کے خلاف مشتعل کرتے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی باک نہیں ہے کہ مسلمان دودھ کے دھلے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی فرقہ پرستی مختلف ہوتی ہے۔ ان کے یہاں ردِ عمل ہے برسوں کی ناانصافیوں کا۔ جمیلہ ہاشمی کو یہ چاہیے تھا کہ وہ مسلمانوں کے ایسے کرداروں کو بھی پیش کرتیں۔ ورنہ میں ان کو یک طرفہ ہندؤں کو مورد الزام ٹھہرانے کا قصور وار نہیں سمجھتا۔ کیونکہ چندر شیکھر اور گنگا دھر جیسے کردار مسلمانوں میں بھی ہیں اور انھوں نے مغربی پنجاب

لے تلاشِ بہاراں ص ۲۳۳   ٢ے تلاشِ بہاراں ص ۲۸۷

اور مشرقی بنگال میں جو کارنامے انجام دیئے وہ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔

"تلاشِ بہاراں" کے مرکزی کے علاوہ ضمنی کردار بھی حرکت و عمل کے اعتبار سے یکسانیت اور بے کیف یک رنگی میں اسیر ہیں۔ یہ سب تخیلی اور تصوراتی کردار ہیں اور زندگی کی گرمی اور توانائی سے محروم۔ رومان پرستی نے ناول کے حسن و اثر کو بے حد مندمل کر دیا ہے۔ تمام کردار خیالی پیکر معلوم ہوتے ہیں اس لیے ان کے اندر دلکشی اور حسن معدوم ہے۔ کردار نگاری کے لحاظ سے یہ ناول کمزور ہے۔

واقعہ نگاری

"تلاشِ بہاراں" کے واقعات ۷۴۴ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں اس میں ناول نگار نے دکھایا ہے کہ سو برس تک ایک قوم بہاروں کی تلاش اور خوبصورت مستقبل کی جستجو میں منہمک رہتی ہے اور اس کا انجام فرقہ وارانہ فسادات اور قتل و غارت گری کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ ناول کا انداز تحریر بیانیہ ہے اس لیے روایتی واقعات و تجربات کو قصے کے رنگ میں بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ رویندر کمار اور کرشنا بوس کے مقدمے سے ناول کا آغاز ہوتا ہے۔ رویندر اعلیٰ ذات سے تعلق رکھتا ہے اور کرشنا بوس ویش ہے۔ دونوں جذبۂ محبت سے مجبور ہو کر شادی کرتے ہیں مگر رویندر کے والدین کے لیے یہ شادی توہین کے مترادف ہے۔ چنانچہ رویندر کو کرشنا سے الگ کرانے کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے۔ اس موقع پر کنول کماری کرشنا کی مظلومی و مجبوری اور معصومیت کے دفاع کے لیے سامنے آتی ہے۔ کنول خود اونچی ذات سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر وہ ذات پات کی تفریق اور تعصب سے بہت اونچی ہے کرشنا سے رویندر کی علیحدگی کو کرشنا کی بے عزتی اور تمام عورتوں کی توہین تصور کرتی ہے۔ چنانچہ کرشنا کی حمایت میں پرزور بیان دیتی ہے۔ پھر اس کا تعلق مختلف قسم کی سماجی تحریکوں سے ہو جاتا ہے۔ وہ عورتوں کی بیداری اور عورتوں کے حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد کرتی ہے اور ہر ہر قدم پر آزمائشات سے گزرتی ہے۔ تعلیم نسواں کے فروغ کی جان توڑ کوششیں کرتی ہے اور سماج میں عورتوں کے مناسب منصب کے لیے انقلاب برپا کرنے کی کاوشیں کرتی ہے وہ اس خیال کے ساتھ تحریک چلاتی ہے کہ "عورتیں اگر دیوی نہیں تو وہ رہ گزاروں کی خاک بھی نہیں۔ اسے پرانے زمانے کے ہاتھ میں تھما کر چلنا سکھایئے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ وہ آپ سے آگے نکل جائے گی مگر وہ آپ کے دوش بدوش ضرور چلے گی۔ مغرب میں عورت نے آزادی حاصل کر لی ہے۔ وہاں زندگی کا مجموعی شیرازہ پریشان ہو گیا ہے۔ اس لیے کہ وہاں اندھیرا ہے۔ وہاں مذہب کے سوتے کب کے خشک ہو گئے ہیں۔ وہاں اعتدال نہیں ہے۔ آپ آزما کر تو دیکھئے آپ کو پچھتانا نہیں پڑے گا۔ نیک کام کر کے اگر کبھی کبھار انسان کو تیزی سے کامیابی کی روشنیاں افق پر چمکتی نظر نہ بھی آ سکیں تو اسے ناامید نہیں ہونا چاہیے۔" چنانچہ ان مقاصد تک پہنچنے کے لیے کنول کماری ہی کے لفظوں میں "یہ کام ایک دن کا نہیں۔ اس میں ہم سب کو مزدوروں کی طرح لگنا اور رات دن کا کرنا ہوگا۔" کنول جلسوں اور جلوسوں کی قیادت کرتی ہے اور حقوق نسواں کے سلسلے میں پیدا شدہ کمزوریوں کا مقابلہ کرتی

ہے۔ ملک کی آزادی کی جنگ لڑی جاتی ہے تو کنول کماری بھی عورتوں کو اپنے نقطۂ نظر کے تحت منظم کرتی ہے۔ سیاسی لڑائی میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں رہتی ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو جگا کر فرقہ وارانہ بنیاد پر ملک کے حصے بخرے کرنے کی سیاسی سازشیں ہوتی ہیں تو کنول کماری اپنے پرستاروں کے ساتھ اس تحریک کی پرزور مخالفت کرتی ہے۔ اس کی تمام کوششیں ناکام ہوتی ہیں اور ملک کی تقسیم کا عمل جراحی سامنے آتا ہے تو فرقہ وارانہ فسادات کے شعلے بھڑکتے ہیں۔ کنول کماری کالج میں زیرِ تعلیم مسلمان لڑکیوں کی جان بچاتے ہوئے اپنی جان کی قربانی دے دیتی ہے۔ یہی ہے ناول کے واقعات کا نچوڑ۔ کنول پر عاشق ہونے والوں کی تعداد کم نہیں ہے۔ ڈان وارٹن سے لے کر راوی تک کنول کے عاشق ہیں۔ مگر ان کا عشق یک طرفہ ہے۔ کنول کو کسی سے جذباتی وابستگی نہیں اسی لیے وہ پتھر کی مورت معلوم ہوتی ہے۔ یوں تو کنول کماری ناول کی پوری فضا پر حاوی ہے لیکن خود کنول کماری کے افعال و حرکات محدود ہیں۔ دوسرے تمام کردار کنول سے مرعوب اور مغلوب دکھائی پڑتے ہیں۔

راوی کے بیانات میں اندرونی سطح پر کنول کے سلسلے میں احترام و عقیدت کا جذبہ کارفرما ہے۔ چونکہ ناول کے واقعات راوی کے بیان پر منحصر ہیں اور اسی کے ذریعے آگے بڑھتے ہیں اس لیے لازمی طور پر کرداروں کے ذریعے واقعات کے فطری بہاؤ کے آثار نظر آتے ہیں۔ واقعہ نگاری کے مرحلوں میں کہیں کہیں جذباتیت اور رومانیت کا غلبہ اس حد تک ہوگیا ہے کہ حقیقت پسندی سے یہ واقعات بہت دور چلے گئے ہیں۔ ان میں عضویاتی تنظیم برائے نام ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ناول کے پلاٹ میں تمام واقعات سمو دیئے گئے ہیں مگر ان واقعوں کی وابستگی بالکل کمزور اور بے ضابطہ ہے۔ واقعہ کے ذریعے جذبات و احساسات اور ان کی تفصیلات کو واضح کرنے کی سعی تو کی گئی ہے لیکن ان کے اندر صحیح معنوں میں حسن و اثر پیدا نہ ہو سکا۔ جذبہ و احساس کو جگانے والی کیفیتیں ان میں نہیں ملتیں۔ یہ بظاہر واقعات اونچے آدرشوں سے متعلق ہیں لیکن ناول نگار کے جذبے کے خلوص اور گرمی کی کمی وجہ سے ان واقعات میں کھوکھلا پن پیدا ہوگیا ہے۔ ناول کی تکمیل کے لیے تاریخی حقائق کا سہارا تو لیا گیا ہے مگر ان تاریخی حقیقتوں کے استعمال کا طریقہ بے جان ہے۔ ناول کے تمام واقعے خارجی سطح پر رینگتے محسوس ہوتے ہیں۔ ان واقعوں کے پس منظر میں معاشرتی کرب اور سماجی اضطراب کی لہریں موجزن نہیں ہیں۔ یہی ان کی بے اثری کا سبب ہے۔

فضا آفرینی

"تلاشِ بہاراں" تاریخی واقعات کے پس منظر میں تہذیبی حقائق کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔ مگر مجموعی طور پر اس کا مزاج رومانی ہے۔ ناول کی فضا پر رومانی احساسات غالب ہیں۔ معاشرتی حقیقتوں اور سماجی زندگی کی تلخیوں کا جہاں سیاسی حالات کے آئینہ میں جائزہ لیا گیا ہے وہاں تقریر کا رنگ پیدا ہوگیا ہے۔ مثلاً تقسیم ملک کے سلسلے میں راوی کا یہ بیان ہے[1]

---

[1] تلاشِ بہاراں ص ۱۷۴

"غیر ملکیوں نے اپنا داؤ چلا لیا تھا۔ اس کا وار خالی نہیں گیا۔ صدیوں سے رہنے والے بھوٹ کی وجہ سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ مسلمان اور ہندو کا سوال، نگ تمدن کا سوال، الگ ملک کا سوال درپیش تھا۔ اور جذباتی عوام ایک مذہبی رنگ دے رہے تھے۔ راجپوتانے کے شیر بیروں نے اکبر اور اورنگ زیب کے درباروں میں ہندو اور مسلمان سر جوڑ کر حکومت کے مسائل پر غور کرتے رہے تھے۔ پھر غلامی کا ایک دور آیا انگریزوں نے ملک کو تباہی کے بیج بو کر کاٹنے کے لیے تیار کر لیا تھا۔ ہر روز جلسے ہوتے جلوس نکالے جاتے اور مادرِ ہند کے حصے بخرے کے لیے تیاری ہونے لگی ...... فسادات ہو رہے تھے۔ جگہ جگہ سے لوگ ایک دوسرے کے گلے کاٹتے، گھروں کو آگ لگاتے اور ہجوم کی صورت میں بڑھ رہے تھے۔"

یہ تقریری انداز بھی ہے اور کہیں کہیں رپورٹنگ کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ ناول نگار نے مالک کی تقسیم کے مسئلے کو ایک مورخ کے ذہن سے دیکھا اور لکھا ہے۔ یہاں تخلیقی زبان استعمال کی گئی ہے اور نہ تخلیقی طرزِ تحریر ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جمیلہ ہاشمی نے نثر میں شاعری کی ہے۔ یہی اس ناول کی خوبی بھی ہے اور خامی بھی۔ اکثر جگہوں پر تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کا خوبصورت استعمال ملتا ہے۔

۱؎ "اور آج تو ذرا سی بھی یاد کا عصا لگتے ہیں اور اژدہا کی طرح پھنکارنے لگے۔ میں موسیٰ کی طرح صحراؤں میں سفر کر رہا ہوں۔"

۲؎ "دھوپ کا سنہرا پن پھولوں کے رنگوں اور پودوں کی نرم ڈالیوں پر چمک بن کر سمٹ آیا تھا۔ ہوا سبز درختوں کو جھکاتی سایوں کے زاویوں کی گھٹاتی بڑھاتی سبک روی سے ہریالی پر لہرا رہی تھی۔ بیلوں سے لٹکے ہوئے پھول چاندی کی گھنٹیوں کی طرح آہستہ آہستہ ڈول رہے تھے۔ برآمدے کے ستون سے لپٹی عشق پیچاں کی بیل میں ناگن کی سی دل آویزی اور سحر تھا۔ سرخ بجری میں گہرا رنگ اور غبار میں ایک خوشبو تھی اور ان سب چیزوں کے اوپر جھکا ہوا نیلا آسمان اور نیچے جھک آیا تھا۔ جیسے اُفق کہیں نزدیک ہو۔ آسمان زمین سے مل رہا تھا۔"

جمیلہ ہاشمی کا مزاج مشرقی اور ذہن ہندوستانی ہے۔ ہندوستانی عورت کے نزدیک کسی غیر مرد کا تصور بھی حرام سمجھا جاتا ہے۔ شوہر پرستی اور وفا شعاری جس کا دین اور ایمان سمجھا جاتا ہے ۳؎

۱؎ تلاشِ بہاراں ص ۳۴۸، ۲؎ تلاشِ بہاراں ص ۸۱ ۳؎ تلاشِ بہاراں ص ۱۲۹

"جانتے ہو عورت کی عزت کتنی نازک ہوتی ہے۔ وہ مرد سے بات کرتے سمے غیر مرد کی بے باک آنکھ کا اس کی تیز نگاہ کا سامنا کرتے ہی جاتی رہتی ہے۔"

۱ " عورت کو جب مردوں سے جا و بے جا تعریف کروانے کی خواہش ہونے لگے تب اس کے پردے میں سوجاتی ہے اور طوائف جاگتی ہے۔"

جمیلہ ہاشمی کو مشرقی اقتدار عزیز تو ہیں لیکن بعض ہندوستانی روایات کی وہ سخت مخالف ہیں۔ یہاں کے غلط رسوم نے نہ معلوم کتنی زندگیوں کو جہنم رسید کردیا دکھوں اور آنسوؤں کے سمندر میں نہ جانے کتنے وجود فنا ہو گئے۔ ناول نگار نے مغرب کی اچھائیوں اور خوبیوں کو سراہا بھی ہے۔

۲ " یہ یورپ کی زندہ قوموں کا طریق ہے۔ میری ششما بھابی اگر ودھوا ہو جاتی ہے تو اسے دھتکار دیا جاتا ہے۔ روتھ کی ممی اگر بیوہ ہو جاتی ہے تو مسیح کا پیغام لے کر دنیا کے کناروں پر گھومنے لگتی ہے۔ بتاؤ عورت کا ایمان کون کرتا ہے۔ دھتکارنے والا یا اسے روشنیوں سے آشنا کرنے والا۔"

عورتوں کی اہمیت اور ان کے حسن کی قصیدہ خوانی تو مردوں نے ہمیشہ کی ہے لیکن جمیلہ ہاشمی کو بھی اس احساس ہے کہ کائنات کی رنگینیاں اور رعنائیاں عورت کے وجود سے عبارت ہیں۔ ۳

"کائنات کا رنگ یقیناً عورت کا مرہون منت ہے اور زندگی میں پہلی بار مجھے ان کہانیوں کی سچائی معلوم ہوئی جو مذہب کا پس منظر ہیں جس میں شعر کی عظمت پاربتی کے ذریعہ اور آدم کی بڑائی حوا کی وساطت سے ظاہر کی گئی ہے۔ بے شک عورت نہ ہو تو رنگ پھیکے اور چاندنی بے کیف لگے۔ دنیا میں کوئی جاذبیت باقی نہ رہے۔"

چاند کو ہر دور ہر عہد میں مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا رہا ہے۔ آج بھی کوئی اسے اپنے محبوب کا ایک روپ سمجھتا ہے تو کوئی آوارہ مزاج عاشق، کسی کو دودھ کا ایک چھلکتا ہوا پیالہ نظر آتا ہے تو کسی کو روٹی کا ایک ٹکڑا، کسی کو چاند میں چرخا کاتتی ہوئی بڑھیا کا عکس نظر آتا ہے تو کسی کو وہ پتھروں کی چٹان معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جمیلہ ہاشمی چاند کو ایک ایسا مسافر سمجھتی ہیں جو ساحل کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ ۴

"چاند ایک ملاح کی طرح تاریک رات کے سمندر کو عبور کر رہا تھا چاندنی کے بادبان بوجھ کے نیچے کراہ رہے تھے۔ نہ جانے کون سے ساحل کی تلاش میں کون سے دیس کی کھوج میں یہ مسافر چل رہا تھا۔ کسی ایسی محبوبہ کی تلاش میں جو دیوں کی دھیمی روشنی میں خاک پر بیٹھی اس کی منتظر ہوگی۔ چاندنی بادبانوں کی طرح پھڑ پھڑا رہی تھی۔ چاند کی محبوبہ کے گھر میں دیئے

---

۱ تلاش بہاراں صفحہ ۱۷۰، ۲ تلاش بہاراں صفحہ ۲۲۱، ۳ صفحہ ۱۴۹، ۴ صفحہ ۱۵۴

کی لو بجھنے والی ہوگی اور اس کے کانپتے ہوئے طویل سائے کچی دیواروں پر پڑ رہے ہوں گے"۔

بچپن کی یادیں اس وقت اور اہم اور خواب گوں ہو جاتی ہیں جب زندگی دکھوں کی آماجگاہ بن جائے۔ فرصت کے لمحوں میں انسان بیتی باتوں کو یاد کر کے حال کے غموں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی شعوری کوشش کرتا ہے۔ بھوتوں اور جنوں سے ڈرنے کے باوجود بچے ان کی کہانیاں بڑے شوق اور دلچسپی سے سنتے ہیں۔ جمیلہ ہاشمی نے بچوں کی نفسیات اور فطری خواہشات کا تجزیہ بڑے فن کارانہ انداز میں کیا ہے۔ رام داداکو خوش کرنے کے لیے دنیا کہتی ہے [۱]

"رام دادا اتنے بڑے جن سے تمہیں ڈر نہیں لگا؟"

اور رام دادا جھک کر کہتا " دنیا دیدی میں تو جن سے بھی بڑا ہوں۔ میں تو مہا جن ہوں"۔

"تمہارے سینگ کہاں ہیں۔ تمہارے تو دانت بھی بڑے نہیں ہیں۔ تم جن نہیں ہو سکتے"۔

"ارے دنیا دیدی میں نے سینگ اتار کر رکھے ہوئے ہیں اور دانت بھی، جب تم بڑی ہو جاؤ گی تم کو جن بن کر بتاؤں گا"۔

سچ مچ وہ اپنے ننھے ہاتھوں کو مارے خوشی کے ملنے لگتی۔ بڑا مزا آئے گا نا رام دادا۔ جب تم جن بنو گے پھر میں، تو تم سے ذرا بھی ڈروں گی۔ کیوں؟ رام دادا اسے کندھے سے اتارنے لگتا کیوں نہیں ڈرو گی۔ میں جن کاہے بنوں گا۔ اگر تم نہیں ڈرو گی"۔

"اچھا اچھا" وہ چیخ کر کہتی۔ ڈروں گی۔ ضرور ڈروں گی"۔

جن بچوں کو پیار نہیں ملتا، چھوٹی موٹی خواہشوں کی تکمیل نہیں ہوتی، کھیلوں اور کھلونوں کی ضد پوری نہیں ہوتی ان کے احساسات اور جذبات کا خیال نہیں رکھا جاتا ایسے بچوں کی تخلیق کئی جہتوں سے نامکمل رہ جاتی ہے اور اس کی کمی تا دم حیات باقی رہتی ہے۔ بچے کہانیوں میں خود کو ہیرو سمجھتے ہیں۔ ہیرو کی خوشیوں اور غموں کا ساجھے دار ہوتے ہیں اور ان کی یہ خواہش بڑھاپے تک ختم نہیں ہوتی۔

[۲] " پھر ہم رام دلارے کو یاد کرتے جاتے رام دادا سادھو بن گیا ہے گنگا کے کنارے بیٹھا دھونی رمائے رام دادا آج بھی کہانیاں سناتا ہوگا۔ اسے کہانیاں کہنے کا بہت شوق تھا۔ ایسی کہانیاں جو اس کے اپنے دماغ کی اختراع تھیں۔ جن میں وہ خود ہیرو تھا۔ اور خود ہی ہیرو کی تیز تلوار کا شکار"۔

بچپن کے معصوم دنوں کو یاد کرنے کے علاوہ گھروندے بنانا اور خواب دیکھنا انسانی فطرت میں داخل ہے۔ بچپن کی ناآسودہ خواہشیں کئی صورتوں میں متشکل ہوتی ہیں اور شخصیت کی ناتکمیلیت انسانی وجود کو

۱۔ تلاش بہاراں ص ۹۵ ، ۲۔ ص ۱۱۵

ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔[۱]

"بچپن میں ریت کے گھروندے بناتا ہوا انسان بڑھاپے تک ریت کے گھروندوں میں دلچسپی لیتا رہتا ہے۔ مٹی سے کھیلتا رہتا ہے۔"

معاشرتی پس منظر میں دیکھا جائے تو "تلاش بہاراں" کی فضا آفرینی میں توانائی مفقود ہے۔ تہذیبی اور ثقافتی بیانات کی بے جا طوالت قارئین پر گراں گذرتی ہے۔

پلاٹ "تلاش بہاراں" کے پلاٹ میں حسن و اثر کی کمی ہے۔ ماجرا نگاری بھی ڈھیلی ڈھالی ہے۔ واقعات گٹھے ہوئے نہیں ہیں۔ کرداروں میں زندگی کی حرارت اور تنوع نظر نہیں آتا۔ لیکن جمیلہ ہاشمی کے نسوانی کرداروں کے جذبات اور کیفیات کی بڑی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ عورت ہونے کے باعث وہ ان کے مزاج، نفسیات، مسائل اور احساسات کو بخوبی سمجھتی ہیں۔ اکثر مفکرین نے عورتوں کے بارے میں مختلف اور متضاد رایوں کا اظہار کیا ہے۔ چونکہ جمیلہ ہاشمی کو عورتوں کے مزاج اور نفسیات کو سمجھنے کا بہت قریب سے موقع ملا ہے لہٰذا وہ یہ بھی کہنے پر مجبور ہیں کہ[۲]

"عورت ایک معمہ ہے۔ جس کو کوئی حل نہیں کر سکتا اور ہم لوگ جو عورتوں کے تعاقب میں زندگیاں گذارتے ہیں بے وقوف ہیں۔ آدم کے بیٹوں سے آدم کی بیٹیاں زیادہ چالاک ہیں۔"

عورتوں کی طرح مردوں کے مزاج سے بھی ناول نگار اس لیے بھی بخوبی واقف ہیں کہ عورت ہونے کی وجہ سے جمیلہ ہاشمی نے مردوں کے عادات و خصائل کو بڑی باریک بینی سے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ ناول نگار بہت حد تک یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ[۳]

"عورت کی موجودگی میں مرد ایک خونخوار بھیڑیا بن جاتا ہے اور ایک بھوکے کتے کی طرح حق برتری جتانے کی خاطر اپنے تیز دانتوں سے دوسرے کی کھال ادھیڑنے کے لیے بھی تیار ہوتا ہے اور عورت کی عدم موجودگی میں ایک دم مہذب اور با اخلاق انسان بن جاتا ہے۔"

"تلاش بہاراں" کی زبان سلیس، رواں اور سادہ ہے۔ ناول چونکہ واحد متکلم کے انداز میں لکھا گیا ہے اس لیے مکالموں کی گنجائش کم ہے۔ راوی کے بیانات نے کرداروں کے انداز گفتگو کو مصنوعی بنا دیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناول کے کردار خواہ بولتے چلے جانے کے خوگر ہیں۔ نظریات اور تصورات کے اعتبار سے ان کی گفتگو میں گہرائی اور فکری بصیرت ہوتی تو ہے مگر اس میں جذبہ و احساس کی آنچ اور صداقت مفقود ہے۔

"تلاش بہاراں" میں ہندوستانی معاشرہ اور بڑے لوگوں کی خود غرضی، مفاد پرستی اور ابن الوقتی پر جا بجا طنز کئے گئے ہیں۔ اونچے گھرانوں میں بوڑھے لوگوں کو کس طرح عضو معطل سمجھ کر نظر انداز ہی نہیں کیا

۱۔ تلاش بہاراں ص ۹۷ ۔ ۲۔ ص ۱۵۶ ، ۳۔ ص ۱۵۷

جاتا بلکہ ان سے نفرت بھی جاتی ہے۔[۱]

[۱] " اسپتال میں اِدھر اُدھر کی کوٹھیوں کو فون کیے گئے۔ شاید اس لاوارث بڑھیا کا کسی کو پتہ ہو کہ وہ کون تھی اور تمہیں سن کر حیرت ہوگی کہ فون کے جواب میں ڈائرکٹر جنرل کی بیگم نے کہا کہ ان کی ساس کی تھی اور میاں کے آنے تک لاش کو بالکل نہ چھیڑا جائے۔ وہ خود آ تیں مگر مصروف ہونے کے باعث آ نہ سکیں گی۔"

سیاست پر حسن اور دولت کس طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ اس پر جمیلہ ہاشمی کا طنز ملاحظہ ہو۔[۲]

" وہ خطرناک طور پر حسین ۔ اسے حسن کا احساس تھا۔ جسم کے دل آویز خطوط میں ایک جاذبیت تھی اور اس لیے وہ ہندوستان کی بہت سی تحریکوں کی رہنما تھی۔ رہنما کے لیے حسین ہونا اور دولت مند ہونا ضروری ہے۔"

"تلاش بہاراں" میں جگہ جگہ منظر نگاری کے نہایت ہی دلکش اور اثر انگیز نمونے ملتے ہیں، رومانی تصورات اور جذباتیت سے یہ ناول مغلوب ہے اسی لیے محبت کے لطیف جذبے کی تعریف جمیلہ ہاشمی نے بڑے جذباتی انداز میں کیا ہے۔[۳]

" محبت صرف ہوسناکی نہیں۔ محبت مرد اور عورت کے تعلق سے ہی ارقم نہیں۔ محبت تو ارفع و اعلیٰ بلندی اور رفعت کا نام ہے۔ جس کو انسانیت کہتے ہیں جو انسان میں نیکی، پھولوں میں خوشبو، چاند میں کرن اور سنگ میں شرر بن کر رہتی ہے۔"

"تلاش بہاراں" کی ہیروئن کمل کماری ٹھاکر خوابوں کی دیوانی ہی نہیں حرکت و عمل کا پیکر بھی کہی جاسکتی ہے۔ لیکن خواب کی کرچیوں نے اس کے تلووں کو لہو لہان کر دیا۔

ناول کا اختتام قنوطی لیکن موثر انداز میں ہوا ہے۔[۴]

" بہار جو اس کے لیے کبھی نہ آسکی۔ بہار جو ہم سب کے لیے کبھی نہ آسکے گی۔ بہار جس کی تلاش میں قافلے سرگرداں نکلیں گے۔ مگر اسے نہ پاسکیں گے۔ نہ جانے کب تک ہماری خلوتوں میں اندھیرا رہے گا ہماری آنکھیں بند ہی رہیں گی۔"

بعض کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود جمیلہ ہاشمی کا یہ ناول اُردو کے اہم ناولوں میں شمار کیا جاسکتا جاسکتا ہے۔

---

[۱] تلاش بہاراں ص ۱۷۳، [۲] ص ۱۴۵، [۳] ص ۵۷۲، [۴] ص ۶۴۴
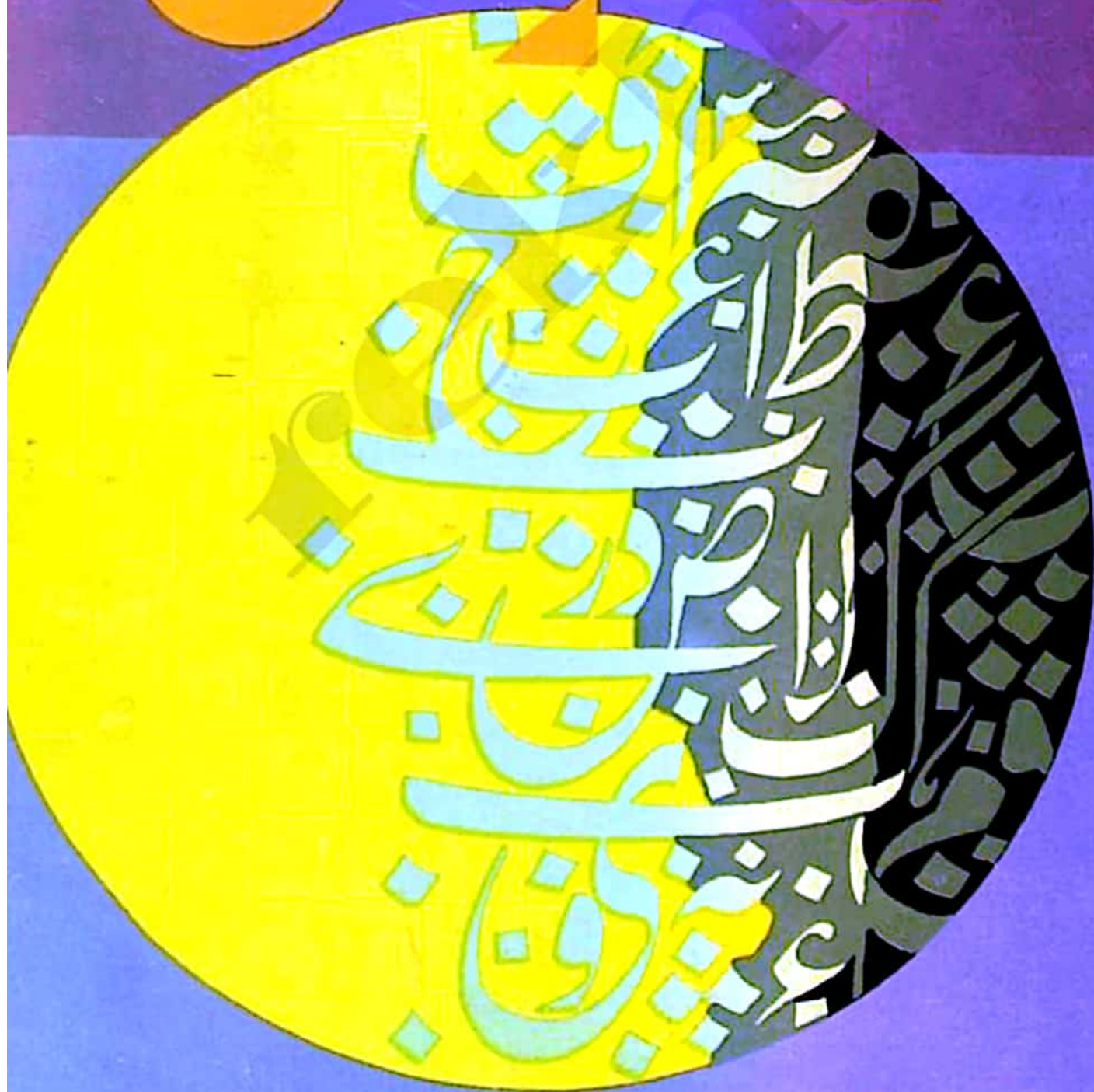
زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

شمارہ نمبر ۱۴۰

بانی : محمد طفیل مدیر : جاوید طفیل

○ ٹائیٹل — اسلم کمال ○ پروف ریڈنگ — محیط اسمٰعیل

خط و کتابت کے لیے پتا

نقوش : اردو بازار - لاہور فون : ۲۵۳۵۲۵-۲۲۹۳۸۹

قیمت ۱۵۰/- روپے

جاوید طفیل نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغ اُردو لاہور سے شائع کیا۔

افسانے

انشائیہ

جمیلہ ہاشمی
فن کے آئینہ میں

مُحمّدعلی صدیقی

جمیلہ ہاشمی کے فن کی دُنیا بڑی دلچسپ ہے۔ اس میں وہ سب کچھ ہے جو بچپن اور نوجوانی کی یادداشتوں نے محفوظ کیا، اور وہ بھی محفوظ ہے جو اُنہوں نے اپنی مضبوط قوتِ متخیلہ کے باعث تخلیق کیا۔ اول الذکر "یادداشت" ـــــ ہی کا دوسرا نام ہے اور یادداشت خواہ انتظار حسین کی ہو یا قرۃ العین حیدر یا جمیلہ ہاشمی کی بہر حال اکثر و بیشتر احساسِ زیاں ہی سے عبارت ہو جاتی ہے — ایک ایسا حزنیہ ـــــ احساس کو جنم دیتی ہے جسے بڑے فنکار فن بنا دیتے ہیں اور بڑے فنکار بننے کے پروگرام بنانے والے چھوٹے فنکار اپنے احساسِ کرب کے اظہار کے لیے محض ریاضت کا مظاہرہ۔

یادداشت نے فکشن کی دُنیا کو بہت کچھ دیا ہے۔ کھوئے ہوئے زمانہ یا کرداروں کی جستجو نے احساسِ طمانیت بھی بخشا ہے اور پچھتاوا بھی۔ بڑا فن ۔ ایک بڑے ادیب کے خیال میں پچھتاوا نہیں ہوتا ، دوبارہ دیکھ سکنے ، اُس میں تخلیقی جوہر بھر سکنے اور اس تگ ودو میں "آج" کو شامل کر سکنے کا نام ہے اور یہ ہی غالباً وہ تخلیقی عدم طمانیت (Creative Dissatisfaction) ہے جو ادب کا بنیادی وظیفہ ہے۔ ایک ایسے دور میں جب فلسفہ "بصیرت" کا نعم البدل ہونے کے بجائے محض ٹیکنیک (Technique) بنتا جا رہا ہو ، دوبارہ لیبار ٹریز میں "الفاظ" کے حوالہ جاتی معنی کی تلاش کا نام بن گیا ہو یہ ادب موضوعی عینیت پسندی رہتے ہوئے سائنسی ہونے کا دم بھرتا ہے اور ادب بھی بہت سے الیکٹرونک (Gadgets) کی طرح ہر سال کے ماڈل چاہتا ہے۔ معاملہ کچھ یوں ہو گیا ہے کہ کوئی کہے کہ اس سال کے افسانہ کا ماڈل یہ ہے اور گذشتہ سال کے ادب کا ماڈل یہ تھا۔ شاید اِسی لئے ہر تخلیق کے نیچے اِن دنوں "سن" تحریر ہوتی ہے ایک زمانہ میں سال اشاعت کے بجائے ایک دور لکھا ہوتا تھا اور یہ دیدہ ریزی نققین پر چھوڑ دی گئی تھی کہ وہ پرانے رسالوں کے انباروں سے ماہ و سال کی جنتری تیار کریں تاکہ ایک مصنّف کے تخیل نے جس تخلیقی رَو کے وسیع و عریض (Spectrum) کے کسی نقطہ پر رُک کر اپنا کام ختم کیا تھا اُس کی سرشاری فنکار کے حصہ میں آئے اور کھٹی ڈکار بھی کھاتہ تیار کرنے والے کے حصہ میں۔ بہرحال سرشاری اور کھٹی ڈکار دونوں ہی تخلیقی نظام بلکہ میٹابولزم (Metabolism) کا حصہ ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ قارئین ادب ادیب کے احساس ناآسودگی پر قائم مشاہدہ اور مطالعہ کے تانے بانے پر قائم قوتِ متخیلہ اور ذاتی (Vision) کے سہارے تخلیق کردہ دنیا کی سیر میں خود کو اور اپنے وقت کو کس حد تک بھول سکتے ہیں۔

میں آج آپ سے اقرار کروں کہ فلسفہ محض تکنیک ہو کر رہ گیا ہے جدید ادب کے وُکلا سے یہ شکایت ہے کہ وہ مغرب کے "قدیم" کو مشرق کا "جدید" بنانے کی تگ و دو میں یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ رفت و گزشت بہر حال رفت و گزشت ہی ہوتا ہے۔

جمیلہ ہاشمی کے اوائلی افسانے پڑھتے تو مجھے یوں لگا کہ اُن کے یہاں پریم چند، بلونت سنگھ اور قرۃ العین حیدر کے فن اور اسلوب کے لئے علیحدہ علیحدہ وجوہات کی بنا پر ایک معصوم سی لیکن بہت زوردار چاہت موجود ہے۔ انتظار حسین نے لکھا تھا کہ جمیلہ ہاشمی کے افسانوں کے علاوہ پاکستان میں اب سکھ کہیں بھی نظر نہیں آتے لیکن مجھے جمیلہ ہاشمی کے افسانوں میں سکھوں سے زیادہ اور بھی بہت کچھ نظر آیا۔ میرے خیال میں پنجاب کے مخلوط کلچر کے خاتمہ پر امرتا پریتم کا "نوحہ" جمیلہ ہاشمی کے افسانوں کی وہ انمٹ یادیں بن گئیں جو اِس کرۂ ارض کی لینڈ اسکیپ (Landscape) کا حصہ بن کر رہ گئے ہیں۔

جمیلہ ہاشمی نے کمال قدرت کے ساتھ وہ سب کچھ ہمارے تجربہ کا حصہ بنادیا جو ہمارے تجربہ کا حصہ نہ ہو سکتا تھا، یا اگر وہ ہمارے تجربہ کا حصہ ہو سکتا بھی تھا، تو اس طرح نہ ہو سکتا تھا جس طرح جمیلہ ہاشمی اُسے ہماری یادوں کا حصہ بنانا چاہتی تھیں۔ یہی تو وہ منزل ہے جو ادب کے (Canvas) پر یادوں ، الفاظ ، ریاضت اور کامیاب صورت گری کے ذریعہ ممکن ہو پاتی تھی۔ کہیں کہیں میلوڈرامہ بھی نظر آتا رہا لیکن ہاں میں یہ گوش گذار کہنا بھول گیا کہ جب قصہ کہنے والا جذبہ کی چنگاری کی تپش سے روشن ہو رہا ہو اور سننے والا اُس جذبہ تک مصنفہ یا مصنف کے خیال میں ذہنی تحفظات کا مظاہرہ کر سکتا ہو تو پھر کچھ نہ کچھ میلوڈرامہ آ ہی جاتا ہے۔ پریم چند سے منٹو تک سبھی کسی نہ کسی مرحلہ پر قاری کو چونکانا چاہتے ہیں۔ آج کے بعض جدید بھی ہیئت کے تجربات اور اپنے مواد (Content) کی ترتیب کے ذریعہ ایک نوع کی شاک تھراپی (Shock Theropy) ہی استعمال کرتے ہیں۔ کیوں ؟ شاید اس لئے کہ قاری کی طرح مصنف بھی اپنے ادب پاروں میں زندہ نہیں رہ پاتا۔ وہ اپنے تجربات کا "کُل" ہونے کے بجائے اپنے تجربات کو مسترد کرتا ہوا ملتا ہے اور اس طرح ایک ایسی صورتِ حال پیدا ہو چکی ہے کہ اب قاری مصنف سے یہ کہہ سکتا ہے کہ "حضرت آپ مجھ سے ادب میں "زندہ" نہ رہ سکنے کی جو شکایت کر رہے ہیں وہ مجھے یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ آپ بھی اپنے ادب پارہ سے اُسی قدر گریزاں نظر آتے ہیں جیسے کہ میں"۔

جمیلہ ہاشمی جس تخلیقی جذبہ کے ساتھ ادب کی دُنیا میں داخل ہوئیں وہ واقعی قابلِ داد تھا اور ہے۔ میں اُن کے فن میں نمایاں احساس تنہائی کا قائل ہوتے ہوئے بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ مردوں کے معاشرہ میں اُن کی بہت سی باتیں ناگفتنی رہ گئیں۔ "روہی" "چہرہ رُوبرو" "وحشتِ سوس" کی دُنیا فنی لحاظ سے "تلاش بہاراں" "آتشِ رفتہ" آپ بیتی اور جگ بیتی اور اپنا اپنا جہنم سے مختلف دنیا ہے۔ آتشِ رفتہ، تلاشِ بہاراں، اپنا اپنا جہنم اور آپ بیتی اور جگ بیتی کی دُنیا برصغیر ہی کے (Local) سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ پنجاب کے دیہات میں زندگی کی اقدار کی کایا کلپ ہوتے دیکھ کر تڑپ

اُٹھتی ہے "واہ گُرو" کے پس پشت گرونانک اور میرابائی و دیگر بھگتی تحریک بلکہ اُس سے بھی پیشتر "ناتھ" دور کے شُعرا کے پنجاب نے جس "سائیکی" کو تشکیل دیا تھا، ۱۹۴۷ء کی خون ریزی نے اُسے خاک بسر کے بجائے لہولہان کر دیا تھا۔ یوں لگتا ہے کہ اُن کے یہاں محسوس کرنے والا اور لکھنے والا وجود بذات خود ، اندوہناک کرب کی آگ میں سلگ رہا ہے۔ جمیلہ ہاشمی کا متخیلہ رومانوی ہے۔ بعض اوقات رومانوی متخیلہ حقیقت کی اپنے طور پر تعبیر کرتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جمیلہ ہاشمی نے "فصل" کے بجائے "وصل" کے جذبات کو اہمیت دی اور ہر مصنف کو یہ حق حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے کرداروں کے لئے ایک ایسی "تاریخ" کو تخلیق کرے جو اُن کرداروں کے لئے ضروری اور مفید بھی ہو۔

جمیلہ ہاشمی نے 'روہی" لکھا تو اُن کے ذہن میں چولستان کے حسن کی سحر کاری کے ساتھ خواجہ غلام فریدؒ کی کافیوں میں "روہی روہی" کا نعرہ مستانہ بھی تھا اور میرا خیال ہے کہ یہی ناولٹ وہ کلیدی نکتہ ہے جس کے بعد "چہرہ رُوبرو" لکھا گیا اور اس طرح جمیلہ ہاشمی کی مشرق اوسط کی جانب ذہنی مراجعت واضح ہو جاتی ہے۔ قرۃ العین حیدر کے یہاں "تصوف" کی چاشنی گذشتہ چند برسوں میں "گردشِ رنگِ چمن" اور "چاندنی بیگم" میں نمایاں ہوئی ہے لیکن جمیلہ ہاشمی کے ناولٹ "روہی" میں "روہی" کے لئے جو سُپردگی ہے وہ منفرد ہے۔ جمیلہ ہاشمی اپنی زمین ، اپنی زمین کے نباتات اور حیوانات اور اپنی زمین کے باسیوں کے دُکھ درد محسوس کرنے کے لئے جس تڑپ کا مظاہرہ کرتی ہیں وہ خواجہ غلام فریدؒ کے یہاں "روہی" اور "محبوبہ" کے تصور سے جنم لیتا ہے۔ خواجہ غلام فریدؒ کی شاعری کا محور ہی "روہی" ہے۔ "روہی" کی جس دوشیزہ نے خواجہ غلام فریدؒ کی زندگی میں بھونچال پیدا کر دیا تھا اُس نے خواجہ غلام فریدؒ کی درجنوں کافیوں کو ورڈزورتھ کی (Lucy Poems) کے مانند بنا کر رکھ دیا ہے۔ "روہی" سے "چہرہ روبرو" ہر چند کہ ایک نئی کہانی ہے، نئی تاریخ ہے، نئی لینڈ اسکیپ ہے لیکن "روہی" میں جس زندگی کی تڑپ ہے وہ قرۃ العین طاہرہ کے روپ میں جلوہ گر ہوئی ہے۔ ہر وجود خود کو مکمل تر کرنا چاہتا ہے محبت کے ذریعہ ، گیان کے ذریعہ۔ قرۃ العین طاہرہ کا کردار جمیلہ ہاشمی کے یہاں "روہی" کی مقامیت کو ایک اور رنگ دینے کی کوشش تھی۔ وہ اپنی باطنی زندگی کو مزید مالا مال کرنے کے لئے قرۃ العین طاہرہ کی جانب مُڑی تھیں۔ سندھی اور سرائیکی افسانہ اور جمیلہ ہاشمی کے اوائلی افسانوں میں زمین اور روح ہم معنی اور ہم وزن نظر آتے ہیں شاید یہ مقامیت کے احساس کو آفاقیت کے ارفع مقام کی جانب لے جانے کی کوشش ہو۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جمیلہ ہاشمی ایک طرف افلاطونی فلسفہ کے مُضر اثرات کی بات کرتی ہیں۔ جیسا کہ اُنہوں نے اکیڈمی آف لیٹرز کے سیمینار منعقدہ ۱۹۸۰ء میں واضح طور پر کیا۔ (اب یہ مقالہ کتابی صورت میں "مقالات" کے نام سے شائع ہونے والی کتاب میں شائع ہو چکا ہے) ۔ لیکن دوسری طرف وہ قرۃ العین طاہرہ کے جذبِ دروں پر فدا ہیں۔ کیا یہ بھی مقامیت اور آفاقیت کی یکجائی ہے؟ ایک تخلیقی فنکار واقعتاً بہت مشکل کام کرتا ہے۔ وہ اجتماعِ ضدین کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ اس توقع پر کہ برق کی عبادت بھی کرے اور حاصل کا افسوس بھی ہو یا جو بات تاریخی طور پر

ممکن نہ ہو پائی ہو وہ قوتِ متخیلہ کے ذریعہ ممکن ہو پائے۔ میں جوں جوں جمیلہ ہاشمی کی تخلیقی دنیا میں سفر کرتا ہوں مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ اُتنی سادہ فنکار نہیں تھیں جس قدر اُن کی تخلیقات کا بیانیہ اور ادعائیہ لہجہ ثابت کرنا چاہتا ہے میرے خیال میں اس عہد کے ایک اہم شاعر کے مندرجہ ذیل اشعار جمیلہ ہاشمی کے ذہن تک رسائی کے لئے بڑی کسی نہ کسی حد تک مددگار ثابت ہو سکتے ہیں:

تھا قیامت، سکوت کا آشوب
حشر سا اک، بپا رہا مجھ میں
پسِ پردہ کوئی نہ تھا پھر بھی
ایک پردہ کھنچا رہا مجھ میں

ایک زمانہ تھا کہ جمیلہ ہاشمی اپنے بچپن کے پنجاب کی حسیت کے لئے ایک مخصوص زبان اور اسٹرکچر (Structure) تیار کرنے میں مصروف نظر آتی تھیں۔ اُن کے یہاں ذہن کے سارے تناؤ بیانیہ زبان کے (Tensions) بنتے نظر آ رہے تھے۔ شاید اس طرح وہ اپنے بظاہر بڑے پر جُوش اور دنیاوی کاموں میں مشغول کرداروں کے ساتھ "تنہا" ہو سکتی تھیں۔ اس کے یہاں تاریخ کے سامنے سپر انداز ہونے کا رویہ نظر نہ آتا تھا بلکہ وہ ایک مسلسل احتجاج بن گئی تھیں ایک ایسے سماج کے خلاف جہاں احتجاج کے جُملہ اسباب نامسعود اور نامحمود تھے۔ اور بطور خاص ایک عورت کا احتجاج وہ تو کوئی بات ہی نہ تھا۔ لیکن ۱۹۸۰ء کے مقالہ میں اُنھوں نے ایک عجیب بات کہی تھی:۔

"تخلیقی ادب میں اضافہ کرنے والے سیدھے آسمان سے نہیں اُترتے ۔ شعور کی لافانی سرحد کو چھونے والے ہم اور آپ میں سے ہیں۔ مگر اُن کے اندر چھپے ہوئے خزانوں تک پہنچنے کے لئے علم کی روشنی درکار ہے ——— زمانے کو آپ ظالم کہئے یا غیر جانبدار کہیے عنوان کے بدلنے سے مضمون نہیں بدل سکتا مقدر کو کوئی نیا نہیں بنا سکتا وقت کسی کے لئے تھمتا رُکتا اور اپنے رُخ کو بدلتا نہیں۔ ہم میں سب چاہیں لاکھ ہومر (Homer) پیدا ہو جائیں مگر اُنہیں بچانے کے لئے زمانے کی دست برد سے محفوظ رکھنے کے لئے یونانیوں کی طرح مہذب تعلیم یافتہ قوم کی بھی ضرورت ہو گی۔"

میں آپ سے عرض کر رہا تھا کہ جمیلہ ہاشمی نے اسی تحریر میں یونانی فلسفہ پر بہت سخت حملہ کیا تھا لیکن اس کے باوجود اُن کی خوبی ہی یہ ہے کہ اُن کا نظریۂ تاریخ اُن کے نظریۂ وجدان سے قطعی الگ ہے۔ اور وجدان بھی عشق کا وہ نقطۂ عروج ہے جسے عقلِ اعلیٰ کہا جا سکتا ہے ۔ وہ انسانی آزادی کو یقینی بنانے قانون اور جبلّت دونوں سے رہبری حاصل کرنے کی خواہش مند نظر آتی ہیں۔ وہ ایک عجیب بے چین روح ہیں جو غیر شعوری طور پر کسی قسم کی جکڑ بندی کی قائل نظر نہیں آتیں۔ لیکن "دشتِ سوس" میں جو ۱۹۸۰ء کے سیمینار کے ۲ سال بعد یعنی ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا وہ حلّاج کے لئے وہ گوشۂ رعایت نہ نکال سکیں جو قرۃ العین طاہرہ کے لئے موجود تھا۔ حلّاج راسخ العقیدگی اور باطنیت میں ملاپ چاہتا

تھا بلکہ اُسی طرح جس طرح کہ ابن عربی اور شاہ ولی اللہؒ ۔ حلّاج امام حنبلؒ کا معتقد ہوتے ہوئے بھی شعوبیہ تحریک کا حامی تھا جو خلافتِ عباسی کے ایک مخصوص دور میں غیر عرب مسلمانوں کے ساتھ بے اعتنائی بلکہ تعصب کے خلاف تحریک تھی۔

میں اُن قارئینِ ادب میں شامل نہیں ہوں جو اپنی پسند کے نظریۂ تاریخ کے ساتھ دوسروں کے نظریہ ہائے تاریخ کو سیاق و سباق کی معروضی شرائط کے ساتھ دیکھنے سے اجتناب برتتے ہیں۔ جہاں مجھے اپنا نظریۂ ادب اپنا لگتا ہے وہاں دوسرے ادباء کے نظریۂ ادب کی راہ میں حائل شعوری رکاوٹیں نامناسب نظر آتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جمیلہ ہاشمی اپنی عمر کے آخری برسوں میں تاریخ کے جس نظریہ کی حامی ہو چکی تھیں وہ تخلیق آزادی کے نظریہ سے متصادم نہیں ہے۔ ہر فنکار کو حق حاصل ہے کہ اُسے اپنی تخلیق کے حوالہ سے جانا جائے چونکہ تخلیق بسا اوقات نظریۂ تاریخ سے ماورا ہو جاتی ہے اور اس صفائی کے ساتھ کہ بس الاماں۔

جمیلہ ہاشمی نے ۱۹۸۰ء میں جس نظریۂ وقت کی بات کی تھی یعنی وقت کے خلاف بند نہیں باندھا جا سکتا ہے۔ وقت کو ماہ و سال اور ادوار کی حد بندیوں کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا، حال میں ماضی شامل ہے اور مستقبل میں حال و ماضی یہ سب مغرب میں ٹی ۔ ایس ایلیٹ اور قرۃ العین حیدر کے یہاں بہت واضح طور پر موجود ہے۔ اس نظریہ کے ماننے والوں کے یہاں انسان دوستی بہر حال خدا دوستی کے مترادف عمل ہوتا ہے۔

جمیلہ ہاشمی قرۃ العین حیدر سے متاثر ہیں تو اس میں کیا مضائقہ ہے۔ ہر ادیب کسی نہ کسی سے متاثر ہوتا ہی ہے۔ آج کتنے ہی نئے لکھنے والے جمیلہ ہاشمی سے متاثر ہوں گے اور وقت بتائے گا کہ یہ تقلید محض ہوگی یا تخلیقی روایت کے دروبست کے ساتھ ایک اور نوع کی انفرادیت پسندی ہوگی لیکن قرۃ العین حیدر اور جمیلہ ہاشمی میں ایک بیّن فرق ہے۔ دونوں رومانوی متخیلہ کی اسیر نظر آتی ہیں لیکن جمیلہ ہاشمی قرۃ العین حیدر کے مقابلہ میں زیادہ (Sensuous) ہیں اور وہ علاقائی حسیت کے تحت اردو زبان کے ساتھ اپنے برتاؤ (Treatment) میں بڑی حد تک آزاد ہیں۔ اگر اُن کی کوئی ترکیب یا تمثال عام قارئین کی سمجھ سے بالاتر ہے تو وہ اس لئے کہ اُس کا تعلق علاقائی یا پھر بڑے تہذیبی دائرہ ۔ یعنی شرق اوسط اور وسطی ایشیا پر محیط جغرافیائی حدود سے ہوتا ہے۔ خواجہ غلام فریدؒ کی سرائیکی کافیوں — اور اُردو غزلوں میں بھی ایک مخصوص حسیت کی کارفرمائی ہے جو ایرانی وسط ایشیائی تاریخ کے تلازموں سے بے نیاز ہے اور یہ وہ مخصوص وصف ہے جو جمیلہ ہاشمی کو پنجابی اور سندھی افسانہ نگاروں کے قریب تر لاتا ہے۔ اُن کے یہاں تجریدی (Abstract) خیالات جس انداز میں تفرید (Personify) ہوتے ہیں وہ اپنے علاقائی سرمایۂ احساس و اظہار پر کامل اعتماد ہی سے پیدا ہوا ہے۔ سکھ معاشرت کی پیش کش (سرخ آندھی اور بن باس) اُسی کمال کے ساتھ ہے جو بیدی کے یہاں ہندو سماج اور عسکری و منٹو کے یہاں عیسائی معاشرہ کے ساتھ ہوئی ہے۔ وہ جس وصف کے لئے بطور خاص ممتاز رہیں گی وہ کرداروں کو اُن کی مخصوص فضا میں آباد کرنے کی ایک ایسی قوت ہے جو کرافٹ (Craft) کی شرائط کے بغیر پوری نہیں کی جا

سکتی۔ جمیلہ ہاشمی اپنے سماج سے اُس کے خام رویّوں کے پس پشت سماجی معاشی و سیاسی پس ماندگی کا گلہ کرتی ہیں لیکن اُن کے یہاں یہ کام کسی مسلک کے زیر اثر نہیں بلکہ احساس کی سطح پر یا ضمیر کی سطح پر ہوتا ہے۔ اور اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اپنے ادب کا اس زاویۂ نگاہ سے بھی مطالعہ کرنا چاہئیے کہ مخصوص مسلک کی عینک سے دیکھے اور مخصوص ذہن سے پرکھے گئے ادب میں وہ کیا کچھ اہم ہے جو آج بھی اہم ہے۔ اس زاویۂ نگاہ سے مطالعۂ زندگی کی بدلتی ہوئی اقدار کی تفہیم کے لئے بھی ضروری ہے۔ جمیلہ ہاشمی کی دنیائے فکشن ایک غیر جذباتی مطالعہ چاہتی ہے صرف نئی نسل ہی سے نہیں بلکہ اُس نسل سے بھی جو اب پرانی نسل شمار ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ جمیلہ ہاشمی کے یہاں بچپن کی یادیں جو اوائلی تحریروں میں موجود ہیں اپنی تہذیبی یادوں (جو بعد کی چند نگارشات کا خاصہ ہیں) اس بات کی علامت ہیں کہ وہ اپنے باطن کی وسعتوں کے لئے ایک بڑے تہذیبی وسعت کی طلبگار تھیں لیکن اس طرح کہ وہ اپنے علاقائی خدوخال کی وجہ سے اُس بڑی تہذیب کے موزائیک (Mosaic) کا حصہ بن سکیں تاکہ شرق اوسط کے صوفیائے کرام کے نعرہ ہائے مستانہ کی موسیقی بڑے تہذیبی دائرہ کے کورس میں اپنی مخصوص نغمگی اور حسیت کے ساتھ پہچانی جا سکے۔

جمیلہ ہاشمی اردو فکشن میں ایک تنہا اُداس ادیبہ کی مضبوط قوتِ متخیلہ کے لئے یاد رکھی جائیں گی۔ میرا خیال ہے کہ مضبوط قوت متخیلہ کا مفروضہ تاریخ کو اپنے طور پر برتنے کا ایک ایسا حق ہے جس کے سامنے حلّاج اور متوکل کی عمروں کا تفاوت سے زیادہ اہم یہ نکتہ ہے کہ آیا جمیلہ ہاشمی کا حلّاج علامہ اقبال اور اشرف علی تھانوی کا حلّاج ہے اور عزیز احمد کا حلّاج یا پھر جمیلہ ہاشمی کے عہد کا حلّاج ہے۔ لیکن میں نے اس مضمون کے شروع ہی میں کہا تھا کہ جمیلہ یونانی فلسفہ کے خلاف ہوتے ہوئے بھی قوتِ متخیلہ (Imagination) کی کامل آزادی کے لئے آزادیٔ تحقیق و اظہار بھی چاہتی تھیں۔ تو پھر ہمیں حلّاج کے بارے میں ایک تاویل سے خود بخود، حلاج کے بارے میں دیگر بہت سی تاویلیں بھی دستیاب ہو جائیں گی۔ جس کے بعد ہمارا اپنا اپنا دشتِ سوس ہو گا، اپنا اپنا حلّاج ہو گا — اپنا اپنا دار و رسن ہو گا اور اپنا اپنا جہنم ہو گا۔

جمیلہ ہاشمی بہر طور، اردو فکشن کے ایک اہم نام کی حیثیت سے یاد رکھی جائیں گی۔ اُنہوں نے اردو ادب کو ـ اپنی کہانیوں اور ناولوں کی صورت میں، علاقائی حسیت اور آفاقی اقدار کے عمودی اور افقی ابعاد مہیا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اُن کے یہاں تنہائی مساواتِ مرد و زن پر قائم سماج کے لئے شدید اصرار اور اپنے مخصوص روحانی نظام اقدار کے ساتھ شیفتگی کے حامل واقعاتی (Structures) اس خوبی کے ساتھ رقم ہوتے ملتے ہیں کہ کاش جس جذبہ نے جمیلہ ہاشمی کے فن کو بالیدگی بخشی تھی وہ مزید پروان چڑھ سکے۔

اسلوب احمد انصاری

بی اے آنرز (آکسن)

یونیورسل بک ہاؤس علی گڑھ

اردو کے پندرہ ناول

اسلوب احمد انصاری
بی۔ اے۔ آنرز (آکسن)

یونیورسل بک ہاؤس
۳۔ عبدالقادر مارکیٹ، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ ۔ ۲۰۲۰۰۱

نام کتاب : اُردو کے پندرہ ناول
مصنّف : اسلوب احمد انصاری
سنہ اشاعت : اپریل ۲۰۰۳ء
تعداد : ۲۰۰
طابع : انٹرنیشنل پرنٹنگ پریس، علی گڑھ
ناشر : یونیورسل بک ہاؤس، علی گڑھ
صفحات : ۴۰۸
قیمت : دوسو پچاس روپے

تقسیم کار: ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

URDU KE PANDRAH NOVEL

By

A. A. Ansari

مندرجات

دشتِ سوس

'دشتِ سوس'، جمیلہ ہاشمی کا غنائیہ المیہ ناول ہے، جس میں مرکزی کردار حسین بن منصور ہے۔ جو ایک CHARISMATIC یعنی مقناطیسی شخصیت رکھتا ہے۔ یہی وہ آفتاب جہاں تاب ہے؛ جس کے اردگرد دوسرے کردار گردش کرنے والے سیاروں کی مانند ہیں۔ 'صدائے ساز'، 'نغمۂ شوق' اور 'زمزمۂ موت'، میں ناول کے اجزا کی تقسیم اس مدوجزر کو محیط ہے، جس سے حسین کی پوری زندگی عبارت ہے۔ دشتِ سوس استعارہ ہے اس DRYNESS OF SOUL کا، جسے ازاول تا آخر پیش کیا گیا ہے۔ مجمیٔ آتش پرست کا پوتا ہونے کے ناطے حسین کے خمیر میں وہ التہاب مضمر ہے، جو اسے وراثت کے طور پر ملا ہے۔ ناول پر جگہ جگہ دشتِ سوس سے اٹھتے ہوئے زرد، سیاہ اور سرخ ریت کے ذروں کے ان طوفانوں کا غلاف چڑھا ہوا ہے، جو فضا کے اجلے پن کو متاثر کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی دشت وصحرا کی وسعتوں میں تجارتی قافلوں کا سفر اور انتقالِ مکانی اس خانہ بردوش زندگی کی علامت ہیں، جو انسان کو برابر پا بجولاں رکھتی ہے۔ بیضا، تستر، دوحرقہ، بصرہ اور بغداد وہ مخصوص جغرافیائی نقطے ہیں۔ جن سے ناول کے عمل میں واقعات منسلک اور وابستہ ہیں۔ حسین کا باپ منصور اپنے باپ مجمی کی زندگی ہی میں مشرف بہ اسلام ہو گیا تھا لیکن باپ بیٹے کے درمیان اس تبدیلیٔ عقیدے کے سلسلے میں کسی ناگواری یا تلخی کے آثار نظر نہیں آتے۔ البتہ یہ دونوں رشتے حسین بن منصور کی سائیکی کے اسٹرکچر کو سمجھنے میں ضرور ممد ومعاون ہوتے ہیں، یعنی ایک طرف وہ آتش شوق ہے، جو حسین کو مدام حالتِ اضطراب میں رکھتی ہے، اور دوسری جانب 'مذہبی شعائر کی ادائیگی سے وہ شیفتگی اور وہ انہماک ہے، جو اس کے اپنے باپ منصور سے اسے ملا ہے۔ اس پر

مستزاد مذہب کا وہ داخلی یا سرّی پہلو ہے، جو تصوف یا منازلِ سلوک طے کرنے پر بھی ایک اضافہ ہے، یعنی انا الحق کا وہ نعرۂ بے باک وآتشیں جس کا تا حینِ حیات اور موت کی دہلیز پر پہنچنے تک حسین برابر ورد کرتا رہا۔ ناول میں تضاد اور ذہنی کشمکش کے عناصر بدرجۂ کمال نمایاں ہیں، اور اس غنائیہ میں پوری طرح حلول کیے ہوئے ہیں۔ 'دشتِ سوس' میں جو کچھ عمل کی سطح پر سامنے آتا ہے، اس سے بڑھ کر وہ زیرِ زمین زندگی اور اس کے ارتعاشات ہیں، جو ہمہ وقت قاری کی توجہ کو اپنی جانب کھینچتے ہیں۔ یہاں تخیلی صورتیں، پرچھائیاں، واہمے، ذہنی خاکے اور مرقعے ٹھوس واقعات کی پیش کش سے کچھ کم اہم نہیں ہیں۔ لیکن اس بنا پر یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ پورا عمل ایک طرح کا PHANTASMAGORIA ہے۔ حسین کا باپ منصور ریشم سے کپڑا بنانے کے کام میں تسترمیں لگا ہوا ہے اور اس کی دلی خواہش ہے کہ حسین بھی اس کام میں اُس کا ہاتھ بٹائے، لیکن حسین کی سرشت کسی اور ہی مٹی سے بنی ہے۔ وہ ایک طرف مذہبی ارکان کی بجاآوری اور اپنی تربیتِ نفس میں ہمہ تن مصروف رہتا ہے، اور دوسری جانب اس کی زندگی آغاز کار ہی سے ایک VISIONARY کی زندگی رہی ہے۔ اس کا تخیل پیش بیں یعنی PROLEPTIC ہے۔ اسے ایک طرح کا سرّی معمول یعنی OCCULT MEDIUM کہہ لیجئے انا الحق کا نعرۂ مستانہ، جو اس کے لبوں پر برابر جاری رہتا ہے۔ اس کی زندگی کا ایک جزوِ لاینفک ہے۔ بہ الفاظِ دیگر نہ صرف نفس کی تربیت، بلکہ انفرادی نفس کو ماورائی نفس میں مدغم کر دینے کا تصور اس کے ہاں ایک توانا اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ فنا کا مفہوم اور اس کی علت غائی بھی یہی ہے کہ فنا ہی دراصل بقا کا در وا کرتی ہے۔ شروع ہی میں مستعمل یہ جملے: 'عشق مزرعِ گلاب ہے / عشق مزرعِ زندگی ہے'، اور یہ دو مصرعے: 'از پےِ جاناں جاں ہم رفت / جاں ہمہ رفت و جاں ہم رفت' حسین کی زندگی کے تار و پود میں گتھے ہوئے ہیں اور اس کے باطنی احوال کی تفہیم کے لئے ایک کلید فراہم کرتے ہیں۔

حسین بن منصور ہر لحاظ سے ایک غیر معمولی کردار ہے۔ خاموش، دروں بیں، ماحول سے یکسر بیگانہ، حسی کشش اور لذتوں سے کنارہ کش، ذاتی مفادات سے مجتنب، اصول و ضوابط کی پابندی میں سخت گیر، ایثار و قربانی کے جذبے سے مملو اور سرشار، ماورا رے لوگ نے

میں فقیدالمثال نفس کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرنے والا، ضبط و تحمل، قناعت و استغنا، توبہ و استغفار میں لاثانی اور ان سب پر مستزاد ایک شعلۂ مستعجل۔ ناول کے آغاز ہی میں اور بالکل اتفاقاً اس کی ملاقات ایک نرم و نازک غیر خود آگاہ آہوئے رم خوردہ نسطوری راہبہ اغول سے ہو جاتی ہے، ایک گزرتے ہوئے قافلے کے ایک فرد کی حیثیت سے حوض کے کنارے بیٹھی ہوئی اغول سے اس کی نظریں چار ہوتی ہیں، نہ اشاروں کنایوں میں اور نہ زبانی حسین سے اس کی گفتگو ہوتی ہے۔ لیکن وہ چشم زدن میں اس امر کا ادراک کر لیتی ہے کہ حسین کی شخصیت کا سب سے زیادہ تابناک پہلو اس کی وہ بے پناہ آنکھیں ہیں، جو مخاطب کے اندرون کی تہوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ یہ وہی آنکھیں ہیں، جو اس کے ماورائی رویا اور آوازوں کے لیے ایک CONDUIT فراہم کرتی ہیں۔ اس کی صرف بظاہر غیر اہم لیکن درحقیقت معنی خیز درخواست یہ ہے کہ اسے جلایا نہ جائے۔ خود اس کا اپنا مستقبل، جسے وہ حسرت و یاس کے آئینے میں دیکھ رہی تھی، یہ ہے کہ اسے کوئی سوداگر خرید کر کسی امیر کے ہاتھوں کنیز کے طور پر فروخت کر دے گا۔ یہی اس کا مقدر ہے، جس سے مفر یا روگردانی کسی طرح ممکن نہیں۔ مقدر یا مقدرات جسے آپ DETERMINISM کہہ لیجئے۔ اس ناول میں ایک کلیدی لفظ ہے۔ حسین اس امر میں یقین رکھتا ہے کہ انسان مقدرات کے سلسلے میں مجبور محض اور پابہ زنجیر ہے اور کچھ ایسی ماورائی طاقتیں ہیں، جنہوں نے انسان کی زندگی کے خطوط کو حتمی طور پر متعین کر دیا ہے۔ حسین اور اغول دونوں کی زندگیوں کے زیر و بم پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اغول، جو خیال کی طرح نازک، مادے کی کثافتوں سے منزہ اور مطہر اور لمس کی گرمی، تمازت اور لذت سے ناآشنا ہے، اور جو حسین کی حد تک صرف قیاس کی ناپیمودہ وسعتوں اور پہنائیوں میں پوشیدہ رہتی ہے۔ ایک حد تک دانتے کی بیاترچ کی یاد دلاتی ہے کہ وہ جنس سے ماوراء ہو جاتی ہے۔ حسین اور اغول وجود کے دو ذرّوں کی طرح ہیں جو ایک دوسرے سے الگ ہی رہتے ہیں۔ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ اغول ایک طرف حسین بن منصور کے لیے ایک روحانی اور غیر لمساتی وجود یعنی PRESENCE کی حیثیت رکھتی ہے اور دوسری جانب حامد بن عباس نے بھی جس سے وہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئی، اسے ایک زرخرید لونڈی سے فزوں تر اور لائقِ احترام سمجھا۔ اس نے اغول سے نہ صرف نکاح کیا، بلکہ اس سے

غیر معمولی طور پر ایسا برتاؤ بھی روا رکھا، جو بالعموم جنسی اور جسمانی تعلق سے کلیتہً آلودہ نہیں ہوتا۔ ایسا لگتا ہے کہ اغول کی فطرت میں کوئی ایسا ملکوتی عنصر ہے، جس کی غور و پرداخت دونوں صورتوں میں ملحوظِ خاطر رکھی گئی۔ حامد بن عباس کے دل پر اس کی محبت ایک نقشِ لازوال کے طور پر بدستور مرتسم رہی، یعنی دشتِ سماویہ کی ایک ایسی بستی میں اس کے اچانک اور غیر متوقع انتقال کے بعد بھی مدتِ مدید تک۔ اس کا اظہار اس طرح کیا گیا ہے:

"حرم کی یہ ساری آبادی خدا معلوم کہاں سے آئی تھی۔ دور دراز ملکوں کی نہایت حسین عورتیں، جن کو آسمان کی نظریں بھی دیکھنا چاہیں، مگر حامد کا دل اسے یاد کرتا تھا۔ جواب نہ تھی۔ جوان۔ مجموعی میں کبھی نہ تھی۔ مگر پس پردہ وہ روشنی کی طرح ہر چہرے کے پرتو میں شامل رہی تھی؛ رہنے والی تھی۔ اس لیے وہ کبھی اسے فراموش نہ کر سکتا تھا۔ پرسکون، مکمل، خاموش، باوقار تمکنت۔ وہ ایک مکمل خاتون تھی۔" (ص ۳۹۶)۔

یہ کہنا بڑی حد تک صحیح ہوگا کہ اغول کی پاکیزہ اور اچھوتی شخصیت، جسے عام معیاروں پر نہیں جانچا جا سکتا، اس زبردست ہیجان و اضطراب اور تناؤ اور کشمکش کا ماخذ ہے، جو ہمیں اس ناول میں ملتا ہے، اور جس میں حسین بن منصور اور حامد بن عباس ANTIPODAL وجود لت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں کے درمیان جو فرق ہے، اس کی طرف ایک اچٹا سا اشارہ ناول کے شروع میں اس طرح کیا گیا ہے:

"حامد کو حسین کا کھویا ہوا انداز اور کم گوئی پسند نہ تھی۔ وہ بہزاد کی عورتوں کا شیدائی اور ظاہری تکلفات پر دم دیتا تھا۔ مسقف بازاروں میں وہ کنیزوں کا پیچھا کرتا، اور ان سے کہیں نہ کہیں ملنے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔ یہ افسانے سننے کے لیے اس نے حسین کو کبھی تیار نہیں پایا..... 'مجھ میں وہ جنون نہیں، جو تم میں ہے:' حامد نے کہا اور اس لیے میں لباسِ ظاہری سے آزاد ہو کر دیوانہ نہیں بن سکتا۔" (ص ۱۳۵)۔

یہاں فرزانگی اور دیوانہ پن کے دو متضاد شیوؤں آمنے سامنے رکھ دیئے گئے ہیں اور پورا ناول انہی کی تعبیر و تفسیر سے عبارت ہے۔ حسین کے سلسلے میں یہ کہا گیا ہے:

"وہ کیوں اغول کو بھلا نہیں سکتا۔ جب وہ سونے کے لیے لیٹتا، تو سنہری بالوں کا دھارا

جس میں زرد چاندنی گندھی ہوتی، اس پر گرنے لگتا، یہاں تک کہ وہ بخرِ دخار کی طرح اسے ڈھانپ لیتا۔ موجیں اور لہریں اسے ایک تنکے کی طرح پٹختیں، اٹھاتیں، کبھی جھولا جھلاتیں۔ یہاں تک کہ چھوٹے کتے کے بالوں میں سسکیاں لیتی رات مدہوش ہوجاتی، اور وہ سو جاتا"۔ (ص ۱۰۵)۔

اور اس سے آگے چل کر یہ بھی کہا گیا :

"وہ اسے بھلا نہیں سکے گا، کبھی بھی نہیں۔ آدمی بھلاتا تو اسے ہے، جسے یاد کیا جائے اور اغول اسے یاد کہاں تھی۔ وہ تو حسین تھی یا حسین خود اغول تھا۔ ہاں وہ حسین تھی وہ اغول کہاں تھی۔ جب اس کی ہستی اس سے الگ، اس سے پرے کوئی دوسری نہ تھی۔ تو پھر اور کچھ نہیں تھا۔ وہ آج تک اپنے آپ سے برسرِ پیکار رہا تھا۔ اپنے آپ سے"۔ (ص ۱۲۲)۔

کیا یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اغول سے حسین کی بے پناہ چاہت اس کے نعرۂ انا الحق ہی کا دوسرا روپ تھا؟۔

ناول 'دشتِ سوس' میں دو طریقہ ہائے زندگی صاف طور پر عکس افگن ہیں۔ اور یہ عکس افگنی تفصیل کے ساتھ اور ٹھوس جزئیات کے آئینے میں کی گئی ہے۔ ایک طرف ریشم سے کپڑا بننے کا کاروبار ہے جس میں حسین کا باپ منصور لگا ہوا ہے اور اس کا دادا جو ایک مجوسی تھا۔ سرائے میں قافلہ سالاروں کو ٹھہراتا، انہیں کھانا مہیا کرتا، اور سردی سے بچنے کے اسباب فراہم کرتا۔ اس کے بیٹے منصور نے زندگی کی اس نہج سے انحراف کرتے ہوئے ریشم بنانے کا کاروبار چلایا۔ اسی کی ایک ذیلی شکل یہ بھی تھی کہ حسین نے کچھ مدت تک نداف کا پیشہ اختیار کیا۔ اس کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے :

"شعلۂ مستعجل کی سی حسین کی جوانی جس کو عبادات نے ایک عجیب ضیا بخش دی تھی پیشانی پر اس کے نصیب کی روشنی اور آنکھوں میں سکون اور ٹھنڈک کی کیفیت نے اسے لوگوں کے لیے باعثِ برکت وجود بنا دیا تھا۔ اس کی مقناطیسیت کچھ یوں تھی کہ لوگ اس کی طرف کھنچے چلے آتے تھے"۔ (ص ۲۰۰)۔

اور جب وہ اپنے کام میں لگتا، اور اس کے لبوں پر 'راز پے جاناں' کا معنی خیز مصرع ابھرتا تو وہ اس کے آہنگ میں پوری طرح ڈوب جاتا، اور اس نعرے کی عارفانہ رمزیت تصوف کے اداشناسوں سے مخفی نہ رہتی۔ پھر اس کے دل کا درد اس کے نالوں میں ڈھلتا، اور اسکی آواز آتش نوا مغنی کی دل نوازی کون و مکاں کی حدود کو پار کرتی اور اس حریم ناز کے باہری ایوانوں میں دستک دینے لگتی تھی۔ زرگر توفیق پر بھی عجیب بے خودی طاری ہو جاتی۔ وہ سایے کی طرح اس مجذوب، اس سالک، اس نداف کا پیچھا کرتا جو ہجوم سے بیزار تھا اور چہروں کے میلے میں کسی کی تلاش میں تھا۔" (ص ۲۰۹)۔

لیکن یہ واقعہ ہے کہ آقائے رازی کی اس تاکید کے باوجود کہ دنیا ایسی فرومایہ شے نہیں کہ اسے منہ ہی نہ لگایا جائے، حسین نے کبھی استقلال کے ساتھ اس کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھا۔ کاروبار دنیا سے ہٹ کر یعنی ریشم و دیبا کی مصنوعات کی تیاری اور فروخت سے الگ رہ کر ہمیں اس دنیا کے نقوش ناول کے صفحات پر آراستہ نظر آتے ہیں، جو صومعوں، زاویوں اور درگاہوں کی زندگی تھی۔ تربیت نفس کے یہ وہ مراکز تھے جہاں شریعت کی پابندی پر زور دیا جاتا تھا۔ اس کے بالمقابل استغراق، مجاہدے اور مکاشفے کے مراکز ہیں، جن میں رچے بسے بغیر روح کی تطہیر ممکن نہیں۔ اور جہاں آداب خداوندی سیکھنے کے طور طریقے انوکھے اور نامانوس ہیں۔ تستر میں سہیل بن عبداللہ کی درگاہ، حضرت جنید بغدادی کا مدرسۂ نظامیہ اور اسی طرح کے دوسرے مدارس اور فقہا کی مجلسیں اور مذاکرے، اس پوری تنظیم کا ایک حصہ ہیں جو ناول کی بساط پر ہمیں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ لیکن یہ امر بہر حال قابل تامل ہے کہ حسین جو ہمہ وقت حالت اضطراب و کشاکش میں الجھا رہتا ہے ان میں اپنے لیے تسکین کا کوئی پہلو نہیں پاتا اور ان سے باہر نکل کر وسیع تر فضاؤں میں پرواز کرنا چاہتا ہے کیونکہ وہ خالق حقیقی یا حقیقت مطلقہ سے براہ راست ربط و اتصال کا خواہاں ہے۔ اس کا نعرۂ انا الحق من و تو کے درمیان فرق کو ایک بہت بڑی رکاوٹ تصور کرتا ہے اور اسے کوئی بھی ایسا ضابطۂ اخلاق و عمل دور نہیں کر سکتا، جو صرف شریعت کی پابندی پر سختی کے ساتھ اصرار کرے۔ بہ الفاظ دیگر انائے اضافی اور انائے مطلق ایک ہی وحدت کے اجزائے لاینفک ہیں۔ اس ناول کی بنیاد متضادات

پر قائم ہے ایک طرف بغداد اور دوسرے شہروں کی وہ زندگی ہے، جس پر اسلامی تہذیب و ثقافت کی گہری چھاپ لگی ہوئی ہے جہاں مدنیت کے سارے آثار و مقتضیات دل و نگاہ کو اپنی سمت کھینچتے ہیں۔ جہاں انسان بیش از بیش مادی ترقیوں کے حصول میں مصروف نظر آتا ہے، جہاں کی ہر شے کا حسن خیرہ کن اور بہجت انگیز ہے اور دوسری طرف مختلف دینی مراکز ہیں۔ جہاں درس اور مجادلوں کی گرما گرمی ہے اور جہاں دین و مذہب کے مسلمات اور دوسرے گہرے اور متعین نکات زیر بحث لائے جاتے ہیں۔ لیکن حسین ایک مضطرب اور سیماب آسا روح ہے جو ماورا رہنے بھی ماورا، جانا چاہتا ہے اور وہ بھی صرف اپنے ایقانات کی روشنی میں۔ یہ محض شریعت اور طریقت کی گزرگاہوں کے درمیان فرق اور بعد کا معاملہ نہیں ہے۔ وہ تو ان دونوں سے آگے نکل جانے پر مصر ہے کیوں کہ بالآخر یہ دونوں ہی معدوم ہو جاتی ہیں اور عاشقِ صادق اور محبوبِ ازلی کے درمیان کوئی دوری باقی نہیں رہ جاتی۔ عام اصطلاحی زبان میں ہم اسے بالترتیب وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا نام دیتے چلے آئے ہیں، یعنی خالق کا مخلوق میں حلول کر جانا یا خالق کا مخلوق سے علیحدہ اور دور رہنا۔ حسین کے ضابطۂ کار میں یہ دونوں ہی تو بالآخر بے معنی ہیں یا یہ کہیے کہ کم از کم پوری طرح تشفی بخش اور راحت فزا نہیں ہیں کیوں کہ آئینہ اور آئینہ گر کوئی وجودی حقیقت نہیں رکھتے۔ آئینے کا شکستہ ہو جانا بھی اور ظاہر و باطن اور اول و آخر کی یکتائی بھی اصلِ حیات و ممات ہے۔ اقبال نے اسی لیے کہا ہے 'تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ / کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں'؛ اور اسی طرح فنا اور بقا بھی ایک یکتا مظہر کے دو نام ہیں کیوں کہ فنا یعنی موت یا عدمیت ہی بقا یعنی ابدی زندگی کے لیے ایک زینہ فراہم کرتی ہے اور دونوں ایک واحد منزل کے لیے نشاناتِ راہ ہیں۔ ان کے درمیان تمیز ایک التباس سے زیادہ نہیں۔

ابھی یہ کہا گیا کہ سلطنتِ عباسیہ کے دور میں 'جو ناول کے پس منظر میں موجود ہے'، تفسیر و حدیث و فقہ کے مختلف مراکز اور درس گاہیں قائم ہو گئی تھیں۔ جو ثقافتی زندگی کی بوقلمونی اور آب و تاب کے بالمقابل علومِ متداولہ اور درس و تدریس اور ان کی تشہیر و اشاعت کا ایک موثر وسیلہ تھیں۔ لیکن یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ ایک نقطۂ نظر سے یہ اس صورتِ حال کے خلاف

ایک ردعمل تھا جو سلطنتِ عباسیہ کے سیاسی عدمِ استحکام کی وجہ سے ابھر کر سامنے آئی تھی۔ دیارِ مغرب میں حکومت کے وقار کو کمزور کرنے کے لیے بغاوتوں کا بازار گرم رہتا تھا۔ سلطنت کی حدود تو بیشک وسیع ہو گئی تھیں، لیکن انہیں استقامت اور پائیداری نصیب نہیں ہوئی تھی اور اس کی مرکزیت پر پے درپے ضربیں پڑتی تھیں، اور تابڑ توڑ حملے ہوتے رہتے تھے۔ منتشر عناصر پوری طرح سرگرم عمل تھے اور ایک مستقل دردِ سر بنے ہوئے تھے۔ اس صورتِ حال کی مقاومت لابدی تھی۔ لیکن اس میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ دوسری طرف اس پر مستزاد مصر اور دوسری جگہوں پر قرامطی انتشار و اختلال کا سبب بنے ہوئے تھے اور معتزلہ بھی درپردہ اپنے مشن کو کامیاب بنانے میں مصروفِ کار تھے۔ گو وہ بظاہر صرف مذہب کی عقلیت کے مفروضات کے ساتھ تطبیق کرنے کے دعویدار تھے۔ وہ ارسطو کی عقلیت کے معترف۔ اور اسے ترجمان بنائے ہوئے تھے اور جس طور سینٹ ٹامس نے عیسائیت اور عقلیت کو ہم آہنگ کرنا چاہا تھا، اسی طرح یہ بھی اسلام میں بظاہر ایک نئے علم کلام کی بناڈالنے اور اس کی ترویج کے خواہاں تھے۔ لیکن اندرونی طور پر وہ مذہب کے بنیادی مسلمات کی نفی کر کے اسلامی فکر کی بنیادوں میں رخنہ ڈالنا چاہتے تھے۔ اسلامی تاریخ میں کئی بار ایسا ہوا ہے کہ شریعت کی سخت گیری کے خلاف ردعمل متصوفانہ یا سرّی ایقانات کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ حضرت جنید بغدادی شریعت پر مکمل طور پر کاربند ہونے کا مطالبہ کرتے تھے۔ اس کے برعکس شبلی اور ابن عطار اندرونی مدرکات پر پوری طرح بھروسہ کرنے کے قائل تھے۔ ان کی روحانیت اسی پر اپنی اساس رکھتی تھی۔ یہی خلیج عمر بن عثمان مکی اور ابو یعقوب اقطع اور ان سے متبائن عقیدہ رکھنے والوں کے درمیان حائل تھی۔ حسین بن منصور کا معاملہ سب سے الگ اور نرالا تھا۔ وہ عبادات میں بھی خشوع و خضوع اور غلو کے ساتھ مستغرق رہتا تھا اور اس دوران دنیا و مافیہا سے بے خبر اور بے نیاز ہو جاتا تھا اور دوسری طرف اس کا نعرۂ انا الحق اس کے جسم و جان کو التہاب میں جھونک دیتا تھا یہ ہر لمحہ اس کی زبان پر جاری رہتا اور اس کی رگ رگ اور نس نس میں اترا ہوا تھا۔ یہی اس کی محیر العقول روحانی قوت کا سرچشمہ تھا۔

اغول سے حسین کی ملاقات وقفے اور ناغے سے ہوتی ہے لیکن وہ اس کے ذہنی افق

پر ایک نادیدہ مظہر کی حیثیت سے برابر چھائی رہتی ہے۔ حامد بن عباس سے جو اولاد اس کے ہاں ہوئی، اس کا نام بھی غالباً اغول کی تحریک اور ترغیب پر حسین ہی رکھا گیا۔ اس کی پرورش و پرداخت پر حامد نے پوری توجہ صرف کی لیکن اسے اپنے بیٹے سے جو توقعات تھیں، وہ پوری نہیں ہوئیں۔ گو اس کی کوئی منطقی توجیہہ نہیں کی جا سکتی بجز اس کے کہ اس کی GENES میں حسین بن منصور کے خون میں گردش کرنے والے ذرات غیر شعوری طور پر جذب ہو گئے تھے۔ بجائے ایک سیکولر انداز کا نوجوان بننے کے حامد عباس کا اکلوتا بیٹا ایک مذہبی آئیڈیل کی طرف بڑھتا نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک طور سے حسین بن منصور کی تقریباً مکمل شبیہہ معلوم ہوتا تھا۔ وہی سحر کن آنکھیں، تنہائی سے وہی شغف، مذہب میں وہی استغراق و انہماک، دنیوی معاملات سے وہی بے رغبتی، وحشت و کرب کا وہی امتزاج، وہی کج کلاہی اور استغنا، جو حسین بن منصور کی شخصیت میں ایک بانکپن کے ساتھ نمایاں تھا۔ اغول سے حسین بن منصور کی چند ہی ملاقاتیں غیر متوقع اور پراسرار طریقے سے ہوئیں۔ پہلی بالواسطہ طور پر جب اس کے مریدِ خاص توفیق نے جو تستر کا زرگر تھا۔ اغول کی یہ درخواست اس تک پہنچانے کا اہتمام کیا کہ وہ اس کے لیے نصیبین جانے کی دعا کرے، جہاں وہ یکسوئی کے ساتھ ہمہ تن عبادت و ریاضت میں زندگی بسر کرنا چاہتی تھی اور اس کی آس لگائے بیٹھی تھی، جب اغول کا نام لیا گیا، تو اس کے ہاتھ سے قلم گر گیا۔ وہ ساری جان سے کانپا؛ جیسے سخت سردی سے بخار چڑھنے کی کیفیت ہو اور پھر ایک دم موت کی زردی اس کے چہرے پر کھنڈ گئی۔ اسے لگا ایک زمانہ اسے یہاں ٹھہرے ہوئے ہو گیا ہے اور پلکیں ایک دوسرے سے چپک گئی ہیں۔ وہ کبھی آنکھیں کھول نہیں سکے گا۔ اغول کی طرف دیکھنے کی ساری کوشش کے باوجود وہ نگاہ نہیں اٹھا سکا۔" (ص ۲۰۲)۔

وہ آسانی کے ساتھ اپنے آپ کو اغول کے طلسم سے آزاد کرنے پر ہرگز قادر نہیں تھا۔ ساری فضا میں اغول کی خوشبو پھیلی تھی اس کے گرد ایک دائرہ تھا جس میں ایک ہی ہوا بار بار چلتی اور ٹھہر جاتی تھی اور اغول کو پکارا کرتی تھی۔ اس کا جسم اپنی مدتوں کی ترسی ہوئی سوکھی رگوں میں ایک سیال کو تیز چلتا محسوس کرتا تھا۔ اغول کے نام پر یہ روانی بڑھ جاتی۔ کہیں اندر آتش فشاں پھٹ رہے تھے .....
اسے اپنے آپ میں سے اغول کی خوشبو آنے لگی تھی۔ دل میں گھنٹیاں سی بج اٹھتیں اور ایک نام

سُنائی دیتا۔" (ص ۲۰۳)۔

ابویعقوب اقطع کی بیٹی زینب سے حسین بن منصور کی شادی ایک فوری ردِ عمل کے طور پر تکمیل کو پہنچی۔ اس نے ابوایوب اقطع کی بیٹی کو دیکھا:

"عجیب سوختہ چہرہ تھا۔ سیاہ رنگ، افسردہ اور بے رونق۔ باپ کی بیماری سے پریشان، کتنے تضادات اس ایک چہرے میں جمع تھے۔ آواز کی نغمگی اور چہرے کی کرختگی، جیسے کوئی مصفا چشمہ خس و خاشاک کے اندر سے پھوٹ کر بہے۔" (ص ۱۴۳)۔

اغول سے حسین کی دوسری بالواسطہ ملاقات اپنے بیٹے حسن کے توسط سے ہوئی، جس نے زینب کی کوکھ سے جنم لیا تھا، جب اس سے اغول کے بیمار بیٹے کی صحت یابی کے لیے دعا کرنے کو کہا گیا تھا۔ اور تیسری بار بالمشافہ گفتگو کنیز گلرنگ کے، جو حامد بن عباس کی ترکی کنیز تھی۔ اور اغول کی فرستادہ، بیچ میں پڑنے سے ہوئی تھی۔ یہ دونوں ربط اس وقت قائم ہوئے جب حسین بن منصور کی شہرت، کشف و کرامات پر اس کی قدرت اور اس کے مستجاب الدعوات ہونے کی بنا پر چار سو پھیل چکی تھی۔ اغول کی موت اچانک اور قطعی غیر متوقع طور پر ہوئی اور حامد بن عباس کی دسترس سے دور اسے دشتِ ساوہ میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ لیکن اس سے پہلے وہ آخری بار حسین بن منصور سے مل چکی تھی، جبکہ وہ اپنی ہیئت کذائی میں ایک قلندرانہ شان اور آن بان رکھتا تھا۔ ایک گدڑی پوش فقیرِ بے نوا۔ اغول نے اسے مکہ معظمہ میں دیکھا۔ حسین کو پہچان کر اغول کو انتہائی صدمہ ہوا کہ وہ اپنے وجودِ گزشتہ کی گرد و غبار میں اٹی ہوئی ایک دھندلی سی تصویر رہ گیا تھا۔ وہ نوجوان جو اس کی یاد کو سینے سے لگائے ماہ و سال کی غلام گردشوں سے گذرتا رہا تھا، اور یہ جو ستون سے ٹیک لگائے ہیبت و جلال کا غیر مرئی نقش بالکل دوسرا شخص تھا، اس نے سوچا کہ شاید وہ غلطی پر ہو۔ مگر حسین کی بے ہوشی کے بعد وہ گم سم واپس خیمے میں پہنچ گئی:

"بالکل تباہ شدہ کشتی کی طرح جس کے بادبان لپٹ گئے ہوں، مستول ٹوٹ گئے ہوں اور چرچراتے تختوں کے سوراخوں میں سے پانی اندر آ گیا ہو۔ وہ بس ڈوب گئی، پانی کی لہریں اور موجیں اس پر سے گذر گئیں۔ گذرتی چلی گئیں۔" (ص ۲۱۰)۔

آخری ملاقات کے دوران اغول نے امتداد وقت کے باوجود اپنی پائندہ محبت کا اعتراف

بھی کیا اور اپنے عقائد کی لازوال پاکیزگی کا بھی باوجودیکہ وہ نسطوری ہی رہی، اور اس نے تبدیل مذہب نہیں کیا تھا۔

اقسطع کی بیٹی زینب نے بھی حسین بن منصور کا تعلق بہ حیثیت شوہر بہت گہرا، دوررس اور سرشاری کا نہیں رہا۔ اور نہ اپنے بیٹے حسن سے۔ لیکن ناول کے پورے سیاق وسباق میں حسین بن منصور کا اپنے متعلقین سے ذاتی سروکار بہت زیادہ اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ اہم ترامر وہ مقناطیسی کشش ہے، جس کی طرف شروع ہی میں اشارہ کیا گیا، اور جسے محض نجی وابستگیوں کے دائرے میں مقید نہیں کیا جاسکتا۔ اس شخصیت میں دو عناصر خاص طور پر نمایاں ہیں، اول حسین کی آنکھوں کی غیر معمولی روشنی اور تابندگی، جو اپنی شفافیت کے باعث اشیاء اور افراد کے آرپار ہونے کا وصف رکھتی ہیں، دوسرے جذب وکیف کی وہ مسحور کن کیفیت جو اس پر ہر وقت طاری رہتی تھی۔ گویا وہ اس دنیا کا نہیں بلکہ کسی دوسری اقلیم کا باسی ہو، اور اسی کی طرف مراجعت کرنا چاہتا ہو، اور تیسرے وہ قلندرانہ اور مجذوبانہ انداز اور رویّہ جو دنیوی معاملات کو قطعی خاطر میں نہ لانا چاہتا ہو، گویا وہ ایک طرح کا بوجھ اور خلل ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنے ماحول سے ناآشنائے محض اور ناآسودہ بھی ہے، اور اس پر پوری طرح تصرف بھی رکھتا ہے۔ اگر ہم اپنی گفتگو کو مخصوص اور محدود کردیں، تو یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ اغول اور حسین دو ایسے ذرے ہیں، جو ایک واحد تجلّی سے مستنیر ہیں، اور خارجی کائنات سے ان کا واسطہ اور رشتہ کم سے کم ہے۔ وہ ان دیکھے اور غیر معلوم طریقے پر ایک ہی دائرے میں گردش کرتے رہے تھے۔ یہ دو ہستیاں ایسی تھیں، جن کی تفہیم حامد بن عباس جیسے اپنی انانیت کے خول میں بند آدمی کے لیے دشوار بلکہ ناممکن تھی۔ اس سے پہلے یہ بھی کہا جاچکا ہے کہ حسین بن منصور کی وہ شخصیت جو انا الحق کے حصار میں محفوظ و مامون تھی، ایسی تھی، جس کا ادراک حضرت جنید بغدادی کے لیے بھی، اپنے عرفان وآگہی کی وسعت کے باوصف ایک کارِ دشوار تھا۔ نعرۂ انا الحق تو دراصل استعارہ ہے حسین بن منصور کی حقیقت مطلقہ سے واسطے کا، اور اس کے اور اغول کے درمیان جو رشتۂ عرفان و تفہیم تھا، وہ ہر طرح کی لسیاتی آلودگیوں سے پاک اور ایک طرح کی ملکوتی شان اور تزئین رکھتا تھا۔ اپنے بارے میں سمنون محب کو مخاطب کرتے ہوئے حسین نے کہا تھا:

"آتشِ سوزاں سے بچنے کے لیے میں نے یہ راہیں اختیار کیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ آگ ہی میں رہوں۔ میں مجوسیت سے الگ اور بلند ہوں۔ حسین نے ٹٹول ٹٹول کر لفظ ڈھونڈ کر ایک ایک حرف کرکے اپنا مطلب ادا کیا۔" (ص ۲۶۲)۔

چنانچہ حسین کے کردار کی نقش گری اس طرح سامنے لائی گئی ہے :

"حسین ایک تجلی میں نہا رہا تھا۔ سکون اس کے چاروں طرف بحرِ ذخار کی موجوں کی طرح پھیل رہا تھا۔ ایک کشتی جو تنکے کی طرح موجوں پر بہتی جائے، اور وہ بہا جاتا تھا۔ پھر موجیں ایسے آئینے تھیں جن میں حسین ہی حسین تھا۔ اس کو شش جہت سے جو آئنہ مقابل تھا۔ اس میں بھلا وہ کہاں سے آن ٹپکا تھا جو ہر آئینے میں وہ آپ نظارہ بھی تھا، اور نظارگی بھی۔ وہ پھر حائل تھا اس کا وجود۔" (ص ۳۶۵)۔

ناول کا ایک پہلو جو سیاسی تغیرات کے ردِعمل اور جذبات کی تندی و تیزی کے لیے ایک متوازن کرنے والی قوت کی حیثیت رکھتا ہے، تجارتی قافلوں کی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی میں نظر آتا ہے۔ یہ قافلے مدام گردش میں رہتے ہیں۔ اس کا ایک پہلو تو سامان اور اشیاء کی فراہمی کے سلسلے میں مراکز کی تلاش اور تجارت کو فروغ دینے کے لیے نئی نئی منڈیوں کی کھوج لگانا اور دوسرے اس میل جول اور باہمی ردِعمل کے مواقع فراہم کرنا، جو مختلف النوع تہذیب و تمدن رکھنے والے گروہوں اور طبقوں کے درمیان ہوتا رہتا ہے۔ اسی دوران فطرت کے بے داغ اور مرتعش حسن کی بے مثال ترصیع بھی نظروں کے سامنے آتی رہتی ہے۔ دجلہ میں بہتے ہوئے پانیوں کی تیزی و روانی، نخلستانوں میں ابلتے ہوئے چشموں کا نمودار ہونا، سبزے کی روئیدگی، اونچے درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ، پرندوں کی چہچہاہٹ اور ترنم ریزی، طلوع و غروبِ آفتاب کے وقت شفق کی ست رنگی قبائیں، ستاروں کے جھرمٹ کی تابندگی، نمودِ صبح کی دلآویزی، نیلگوں آسمان کی وسعتوں میں سیاروں کی آہستہ خرامی اور اپنے اپنے ORBIT میں ان کا تیرنا، ان سب سے ہمیں وقتاً فوقتاً سابقہ پڑتا رہتا ہے اور ان کی پراسراریت صرف چشم بینا پر آشکار ہو سکتی ہے۔ ایک منفی عنصر بھی کبھی کبھی ان فضاؤں میں در آتا ہے، اور وہ ہے تجارتی قافلوں پر قزاقوں اور لٹیروں کا شب خون مارنا اور چشم زدن میں بے گناہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو بلا استثنا موت

کے گھاٹ اتار دیا۔ عام طور پر یہ حملے ان لوگوں سے کرائے جاتے تھے، جو اس کام پر بالقصد مامور کیے جاتے تھے اور ان کے محرکات بالعموم سیاسی ہوتے تھے۔ یہ قرامطیوں کے ہاتھوں منظم کیے جاتے تھے اور اس کا مقصد عام لوگوں میں ہراس اور بے چینی پیدا کرنے کے علاوہ حکومت کی طاقت کو زک پہنچانا اور اسے ہلا دینا یا DESTABILIZE کرنا ہوتا تھا۔

حسین بن منصور ناول میں شروع سے آخر تک جس طرح سے پیش کیا گیا ہے وہ ایک مافوق الفطرت منظہر معلوم ہوتا ہے، جس کے کردار کی اہم اور نمایاں خصوصیت اپنے آئینۂ ادراک میں ان رویائے کا عکس دیکھ لینا ہے، جو اس پر منکشف ہوتے رہتے ہیں۔ وہ علوم ظاہری اور متداولہ میں اس حد تک دلچسپی محسوس نہیں کرتا، جس حد تک کہ ان کی تدریس اور پاسداری بالعموم اور جائز طور پر کی جاتی ہے اس کے نزدیک رویا، صرف اعتبار و وقار اور کھرے پن ہی سے متصف نہیں ہیں۔ بلکہ وہ کشفِ اسرار کا اس حد تک وسیلہ بھی ہیں کہ وہ نظر کے سامنے سے حجابات کو اٹھا دیتے ہیں اور حقیقت اپنی حقیقی اور تنزیہی شکل میں جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ مشاہدہ اور تجربہ اور حواسِ ظاہری ہمیں صرف سامنے کی اشیاء کا علم، یعنی ان کی صفات کا علم بخشتے ہیں، لیکن باطن کی آنکھ کے سامنے وہ سب کچھ عیاں ہو جاتا ہے، یعنی ذات کی حقیقت جسے مشاہدے کی محدود استعداد حلقۂ ادراک میں نہیں لاسکتی۔ اس احساس اور شعور نے حسین بن منصور کو ظاہری اعتبارات سے مستغنی بنا دیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ لباس کی صفائی اور نزہت سے بھی بیگانہ ہو گیا۔ عام طور سے لوگوں کے دلوں میں یہ بات گھر کر گئی ہے کہ وہ اپنے اکتسابات روحانی کے بل بوتے پر خلاف معمول اشیاء کو برتنے پر قادر بھی ہے، اور مستجاب الدعوات بھی ہے۔ اس کے اندر وہ ساری ظاہری علامات ہیں، جو ایک مستغرق اور مجذوب شخص میں پائی جاتی ہیں۔ جس کے لیے اس کی دنیا صرف اس کے رویائے یعنی VISIONS سے عبارت ہے۔ اس کی مجذوبانہ حالت کی ایک MOCK - HEROIC تجسیم صفحات ۳۵۱ اور ۶۲-۳۵۸ میں پیش کی گئی ہے۔ یہاں مختلف قسم کے چھچھورے، بے ہودہ اور کھلنڈرے لونڈے سوانگ بھر بھر کر اس کے نعرۂ انا الحق کو مضحک انداز میں پیش کرتے اور اس طرح اپنے سوقیانہ پن کا مظاہرہ کرتے ہیں، اس کی حالتِ جذب کو لوگ دیوانگی کا نام دینے سے نہیں چوکتے۔ لیکن خود اس کا مطمحِ نظر یہ ہے

کہ یہ دیوانگی، فرزانگی سے ہر اعتبار سے افضل اور مرجح ہے۔ اس کے ہاں عقل کی روباہی نہیں، عشق کی برجستگی اور نشاطِ کار موثر ترین محرک ہے کہ ' طلب کی آگ میں جلتا ہے رقصِ پروانہ ' (سید امین اشرف)۔ یہ دیوانگی نعرۂ انا الحق کی زائیدہ ہے۔ اس کا مفہوم اپنی ذات کا تکبر نہیں، بلکہ محدود کو لامحدود میں مدغم کرنے کا حوصلہ اور امنگ ہے۔ یہ اسباب و علل کے سلسلے سے ماورا ہے، اور اس سے خود فراموشی کی وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ جسے عوام عقل سے دست برداری اور جنون کا مترادف جانتے ہیں۔ لیکن جس کا ہدف جرمن فلسفی کیسیرر کی زبان میں، اور صوفیائے مشرق کے نزدیک بھی 'من' و 'تو' کے امتیاز کو کالعدم کردینا ہے۔ یہ عاجزی (اپنے صحیح مفہوم میں) تو ہے، گرفتاری اور پابندِ سلاسل ہونا نہیں ہے۔ اقبال کی زبان میں حسین بن منصور بلاشک و شبہ یہ کہنے کا مجاز ہے :-

من بندۂ آزادم عشق است امام من عشق است امام من، عقل است غلام من

جاں در عدم آسودہ بے ذوقِ تمنا بود مستانہ نواہا زد در حلقۂ دامِ من

وہ خود تو کرامات دکھانے کا دعوے دار کبھی نہیں رہا۔ لیکن عوام کی کم فہمی اور ضعیف الاعتقادی کو کیا کہیے، کہ وہ اسے نادیدہ اور ناقابلِ وثوق مظاہر پر حاوی سمجھتے تھے، اور انہیں اپنی منشاء اور مفاد کے مطابق ہم آہنگ کرنے کا اہل اور ماہر۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کی دعائیں جو منزہ اور مطہر اعماقِ قلب سے برآمد ہوتی تھیں؛ مستجاب ضرور تھیں اور ان میں اک نوع کی سحر انگیزی حلول کر گئی تھی؛ شاید یہ نتیجہ ہو اُس کے ہمہ تن اور ہمہ دم عبادات میں اشتغال بہیم کا۔ اپنے آپ کو تمام مادی کثافتوں سے پاک کرنے اور علائقِ دنیوی سے گلو خلاصی کا، یعنی بڑی حد تک روح کی مادے پر فتح پالینے کا، اور اس عقیدے میں یقینِ کامل کا کہ فنا ہی بقا کے لیے نشانِ راہ ہے۔ جو دیوانگی اس سے منسوب اور مختص کی جاتی تھی، فی الاصل وہی فرزانگی تھی۔ یہ کوئی PATHOLOGICAL قسم کی چیز نہیں تھی۔ بلکہ روشن ضمیری اور تزکیۂ نفس کی ایک بین علامت تھی۔ جن کرامات کا اس سے ظہور ہوتا تھا۔ یا یہ کہہ لیجیے کہ حجابات کے اٹھ جانے اور مادی اسباب پر قابو پالینے کے سبب جن مظاہر کا اس کی ذات سے صدور ہوتا تھا۔ وہ نتیجہ کہے جاسکتے ہیں نفس کی تربیت تامہ اور ریاضِ کامل کے ذریعے غیر نفس کو زیر کرنے اور مطیع بنا لینے کے۔ اس صورتِ حال کا ایک

ثمر اس کے لیے یہ ضرور نکلا کہ ایک طرف وہ اپنے مراقبات، گوشہ نشینی اور عبادات میں خشوع و خضوع کے پیشِ نظر حد درجے قابلِ احترام سمجھا جانے لگا، اور دوسری جانب دوسروں کی حاجت روائی کے سلسلے میں اس کی مستعدی اور خلوص کی بنیاد پر اسے اس وقت کے بغداد میں ایک قابلِ رشک حیثیت حاصل ہو گئی جس کی کوئی بظاہر توجیہہ نہ کی جا سکتی تھی، اور نہ ہی اس پر کوئی سوالیہ نشان لگایا جا سکتا تھا۔ اس کا نعرۂ انا الحق جسے وہ بے تکان اور پوری آگہی کے ساتھ دہراتا رہتا تھا۔ البتہ بعض غلط فہمیوں کا موجب ضرور بن گیا تھا۔ کیوں کہ عام احساس کے مطابق یہ بمنزلے کلمۂ کفر کے تھا کہ یہ ایک طرح سے الٰہیات کی پوری بنیاد میں رخنہ پیدا کرنے کے مترادف تھا۔ علمائے ظاہر اور فقہا کا اس ضمن میں نقطۂ نظر یہ تھا کہ یہ ناپختگی اور بے صبری کے رویے پر دال ہے کیونکہ خدا خالقِ کائنات اور حقیقتِ مطلقہ ہونے کے ناطے انسان کی دسترس سے باہر اور اس کے حیطۂ امکان سے ماورا ہے۔ خالق اور مخلوق نہ کسی طور متحد الاصل ہیں، اور نہ کبھی ہو سکتے ہیں، ان کے مابین حجاب اور دوری اور فاصلہ ضروری بلکہ ناگزیر ہے۔ اس کی ذات کا ادراک صفات کے آئینے ہی میں کیا جا سکتا ہے اور اپنے نفس کی آگ کو روشن کرنے اور خدا کو اپنی جان پر رواں کرنے کے وسیلے سے ماورا سے بھی ماورا پہنچنے کی تمنا ایک نوع کی خام خیالی ہے، اور بے صبری اور عدم احتیاط کی غمازی کرتی ہے اور کم ظرفی کی بھی۔ اپنے اہداف کے حصول کے سلسلے میں خود ضبطی اور تمکین بہر حال ضروری شرائط ہیں۔ خدا تک رسائی غیر مشروط طور پر نہیں ہو سکتی۔ ایک منزل کو طے کر کے اگلی منزل کی طرف بڑھنا تو قابلِ فہم ہے اور قابلِ استناد بھی۔ لیکن ایک ہی جست میں بہت سی منزلوں کو طے کرنے کا عزم غیر معمولی جسارت کا متقاضی ہے۔ اور یہ ایک ناممکن الحصول آئیڈیل ہے اور اس راہ میں ہزیمت اور شکست خوردگی انسان کا مقدر ہے جس سے کسی طرح گریز نہیں کیا جا سکتا۔
انسان خالقِ کائنات سے ربط و تعلق قائم کرنے کی سعی تو بے شک کر سکتا ہے اور یہ ایک پسندیدہ جائز اور معقول ہدف ہے۔ حسین بن منصور کا خیال تھا کہ انسان کا قادرِ مطلق یا حقیقتِ آخری سے ربط ضبط بلا کسی واسطے کے ہونا چاہیے اور اس پر اخلاق کے قانون کی گرفت کیوں ہو؟ قرآن کریم میں یہ کہا گیا ہے کہ خدا نے انسان کی اپنی شبیہہ پر تخلیق کی اور یہ بھی کہ ہم انسان کی

شہ رگ سے بھی قریب ہیں: نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْد۔ ان دونوں نصوصِ قطعی
سے بھی یہ استدلال قائم کیا جا سکتا ہے کہ اس ربط و تعلق کو کسی سہارے یا مداخلت کی ضرورت
نہیں۔ انسان اپنا مقدر خود ہی بنا اور بگاڑ سکتا ہے۔ اس لیے کہ کوئی ایسی شے نہیں جس کا استخراج
برتاؤ سے کیا گیا ہو کہ اس کی شناخت خود تجربے ہی میں ہوتی ہے یا خود 'میں ہوں' سے۔

یہ امر بہت بدیہی ہے کہ اس ناول کے لیے مشہور صوفی حلاج بن منصور کی تاریخی شخصیت
ایک PARADIGM فراہم کرتی ہے بعینہٖ جیسے شیکسپئر کے المیہ کردار لیئر کے لیے BOOK OF JOB میں
JOB کی صورتیں مثال کا حکم رکھتی ہیں۔ حلاج اور حسین بن منصور کی زندگی کے واقعات میں قریبی
مماثلت پائی جاتی ہے۔ برطانوی رومانی شاعر ورڈز ورتھ کی طرح دونوں کے ہاں وجود کے نامعلوم پیرایوں
UNKNOWN MODES OF BEING کا احساس پایا جاتا ہے اور دونوں کے ہاں نغماتِ کبریائی
PAEANS OF GLORY کی خارجی تجسیم بھی جگہ جگہ ملتی ہے اور یہ ایک SURREALISTIC اثر پیدا
کرتی ہے۔ دونوں کے ہاں وجدانی یعنی UNITIVE زندگی کا تصور مشترک ہے۔ جس پر
عیسائیت کے اثرات کا شدومد کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور اس کے ضمن میں حضرت
عیسیٰ کو ہستیٔ مطلق کی ایک تجسیم یا INCARNATION سمجھا جاتا ہے۔ نعرۂ انا الحق کے پسِ پشت
جو محرک ہے اسے انسان کی الوہی کیفیت کے حصول کے عمل کے لیے ایک لفظ DEIFICATION
سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ خدا اور بندے کے درمیان جو تعلق ہے، اس میں دوئی کے لیے
کوئی گنجائش نہیں۔ انسان کے خدا میں انضمام یا خدا کے انسان میں حلول کا ادعا تعجب انگیز
کیوں ہو؛ حلاج بن منصور کے نعرۂ آتشیں کی موافقت اور مخالفت میں جو کچھ کہا گیا' اس کے
بارے میں امام غزالی کا محاکمہ بہت صائب ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نعرۂ انا الحق مرکوز ہے
بندے کی آقا سے بغایت محبت پر۔ اور اسے کفر یا بے حرمتی یعنی BLASPHEMY کے
درجے پر نہیں رکھا جا سکتا۔ لیکن اس کا پرزور اعلان اور اس کی اشاعت ایک غیر دانش مندانہ
قدم اس وجہ سے تھا کہ ایک سری حقیقت کو ان لوگوں پر آشکار نہیں کرنا چاہیئے، جو UNI
NITIATED یا NON-ELECT کے درجے پر ہوں۔ جہاں تک فنا اور بقا کے تعلق کا مسئلہ
ہے، حسین بن منصور کے برتاؤ کے مطابق فنا ہی بقا کی کنجی فراہم کرتی ہے۔ اس خیال کا

عکس جدید فرانسیسی وجودی مفکر ہائیڈیگر کی تحریروں میں بھی ملتا ہے. جن کے مطابق عدمیت یا NOTHINGNESS عدم وجود یعنی NON-BEING کے مترادف نہیں ہے. بلکہ اس کا تعلق ابدیت اور لامناہیت یعنی INFINITUDE سے ہے. لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس تصور کا سرچشمہ نبی کریمؐ کی اس حدیث قدسی میں ملتا ہے: موتوا قبل ان تموتوا (مرنے سے پہلے مر جاؤ). جس کا ورد کرنے سے جسم و جان پر کیکپی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

اغول کی پراسرار موت اور کنیز گلرنگ کی اس اطلاع کی تصدیق اور یہ انکشاف بھی کہ وہ تا دمِ آخر اس غلیظ گدڑی پوش بدست، فقیرِ بے نوا حسین بن منصور کی محبت میں گرفتار اور اس کا کلمہ پڑھتی رہی:

"آقا انھوں نے ابن منصور کے سامنے اپنی لازوال محبت کا اقرار کیا تھا؛ اپنی ان گناہ آنکھوں کا، جو اس محبت کی وجہ سے ہر جگہ اسے دیکھ سکتی تھیں" (ص ۲۷۹).

حامد بن عباس کو، جو اس ناول میں حسین بن منصور کا مدِ مقابل کردار ہے، ایک صاعقہ بردوش عذاب کی طرح نازل ہو کر اسے چشم زدن میں جہنم میں ڈھکیل دیتا ہے اور واقعات کے تسلسل کو ایک نئی جہت اور نیا موڑ عطا کرتا ہے. وہ حسین بن منصور کے بارے میں مختلف النوع قسم کی مثبت اور منفی رائیں سنتا رہا تھا اور اب وہ اس رائے پر مطلع ہوتا ہے کہ ناکامیوں اور کامرانیوں کے علی الرغم اور پس پردہ اس کی شکست و ریخت کا سب سے بڑا سبب حسین ہی ہے اور انتقام کی آتشِ سوزاں، جو اس کے اندرون میں یک لخت بھڑک اٹھتی ہے؛ اسے غضبناک بنا دینے اور اپنے ہوش و حواس کھو دینے کے لیے کافی ہے. وہ بالواسطہ تفصیلِ حال کی تفتیش اور اس کی پراسرار اور عجیب و غریب شخصیت کی تفہیم و ادراک کے لیے اسے اپنے محل میں طلب کرتا ہے اور باہمی مکالے کا آغاز کرتا ہے: ایسی فضا میں جو دہشت ناک بھی ہے، اور خلافِ معمول بھی لیکن حسین ہر سوال کا جواب براہِ راست، مسکت اور ایک حد تک مبہم انداز میں دیتے؛ جس میں ذو معنویت کا پہلو بہر حال نکلتا ہے، اور کسی قسم کے دباؤ اور دبدبے کے سامنے نہ جھکنے کا عزمِ صمیم اپنے اندر پاتا ہے. صرف اس لیے کہ اس کا تعلق اس کائنات سے گہرا اور ناقابلِ انقطاع ہے، جو زمان و مکاں کی حدود سے بہت پرے ہے، اور اسے اپنی اندرونی طاقت اور مشیت ایزدی پر پورا

بھروسہ ہے۔ اس کے برعکس حامد بن عباس ایک زخم خوردہ جانور کی طرح کوئی چارۂ کار اپنے سامنے نہیں پاتا ماسوا اس کے کہ اسے قید میں ڈال دے لیکن یہ امر بھی بہت دلچسپ اور حیرت انگیز ہے کہ وہ حسین کو انتہائی درجے کی اذیت پہنچانے کے لیے جو بھی کڑی پابندیاں اس پر عاید کرتا ہے وہ اس کے پائے استقامت میں کوئی کمزوری نہیں پیدا کرتیں، بلکہ وہ ایک آہنی دیوار کی طرح اپنے مستقر پر جما رہتا ہے اور اپنے ایذا رساں کے لیے صرف حقارت محسوس کرتا ہے۔ سات آٹھ سال کی مدت کے بعد، اور یہ زمانہ وہ مغرب میں لڑائیوں اور بغداد کی مرکزی حکومت کے خلاف سازشوں اور بغاوتوں کو ناکام طور پر فرو کرنے میں صرف کرتا ہے۔ جب وہ واپس بغداد پہنچتا ہے۔ اور انتقام کی آگ اسے نئے سرے سے برماتی ہے، تو وہ حسین بن منصور پر ایک آخری اور بھرپور وار کرنے کی ٹھان لیتا ہے۔ ایک طرف حسین بن منصور تھا ایک بے بضاعت کرم جو لجلجاتا ہوا مٹی کی تاریکیوں میں اس پر خندہ زن تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بے بسی کیا تھی اور اس کا باعث وہ خود تھا۔ زنداں کے اندر بند سلاخوں کے پیچھے بیڑیاں پہنے ہوئے، عبادات میں منہمک، اپنے نعرۂ اناالحق کو اپنی آہوں میں دبائے، اپنی خاک نشینی میں اپنی برتری کو سمجھتا ہوا، اپنے ہونے پر فخر کرتا ہوا، وہ جس کی آنکھیں بے پناہ تھیں۔ مگر جنہیں روشنی سے حجاب آتا تھا۔" (ص ۴۱۳-۴۱۲)۔

اور دوسری جانب حامد بن عباس تھا:

> "اس کے حامد بن عباس کے نصیب میں محبت نہیں نفرت تو تھی۔ شدید عمیق نفرت سب چارہ گر ناکام ہو چکے تھے۔ زہر آلود نیزے کی انی، دل میں چبھ رہی تھی۔ وہ آخری کوشش کرے گا، ساری شکستوں کا انتقام لے گا، اگر محبت اس کا حق نہیں، تو نہ سہی، نفرت کرنا، مٹانا، معدوم کرنا تو اس کے اختیار میں تھا۔" (ص ۴۳۴)۔

وہ حسین بن منصور کے خلاف فردِ جرم قائم کرنے کے لیے (اور جرم سے بظاہر مراد ہے نعرۂ اناالحق کا برابر ورد کرتے رہنے سے کفر کا مرتکب ہونا) مواد فراہم کرنے کا حکم دیتا ہے، یعنی ایسی دستاویزات، معروضات اور مراسلوں کا ترتیب دیا جانا جن میں اسے روح اللہ تسلیم کرتے ہوئے دعاؤں کی فرمائشیں کی گئی تھیں، اور ایسے اوراق جن میں گمراہ کن اگرچہ بے بنیاد عقیدے اس سے منسوب کیے گئے تھے اور قاضی ابوعمر کو اس کے خلاف کفر کا فتویٰ دینے اور نتیجۃً اسے سزا کا مستوجب

قرار دینے کے لیے پوری طرح آمادہ کرلیا جاتا ہے۔ اس سے قبل اسی منصوبہ بندی کے تحت حضرت جنید بغدادی اور ان کے حلقے کے دوسرے فقہا کو بھی اسی نیت سے اپنے محل میں پرتکلف ضیافت پر مدعو کیا جاتا ہے تاکہ اس کام کے لیے شرعی جواز بھی مہیا کرلیا جائے۔ مگر حضرت جنید کی حد تک یہ کوشش پوری طرح بارآور ثابت نہیں ہوئی۔ لیکن ایک خصوصی عدالت میں جس کی کارروائی قاضی ابوعمر کے سپرد کی جاتی ہے، حسین بن منصور کے خلاف متعلقہ الزامات کے سلسلے میں تیار کردہ محضر پر قاضی کا فتویٰ صادر کردیا جاتا ہے اور بعد میں خلیفہ مقتدر کی مہر بھی اسے آخری اور قطعی شکل دینے کے لیے ثبت کردی جاتی ہے اور حسین بن منصور کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے برابر ثابت ہوتی ہے۔ اور اب مقتدر کی ماں شغب بھی جو حسین سے بھرپور عقیدت رکھتی اور برسوں مختلف معاملات میں اس کی دعاؤں کی طالب اور خواستگار رہی ہے، اور سرکاری کارروائیوں میں ایک حد تک دخیل رہی ہے، اس فیصلے کو منسوخ کرانے میں اپنے آپ کو کلیتہً بےبس پاتی اور ناکام رہتی ہے۔

حسین بن منصور کے مدمقابل کی حیثیت سے حامد بن عباس کا کردار بڑی اہمیت کا حامل ہے وہ گوناگوں صلاحیتوں کا مالک اور ایک لحاظ سے غیر معمولی ہے، جس کا اندازہ کسی حد تک اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ریاست کے ایک ادنیٰ یا معمولی کارندے کی حیثیت سے بتدریج ترقی کرکے وزیراعلیٰ کے عہدے تک پہنچ گیا۔ اس نے خلیفۂ وقت کو اپنی فہم و فراست، معاملہ فہمی اور دوراندیشی کو کام میں لاکر اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا، اور اس کا معتمد بن گیا تھا اور خلیفہ کی ماں شغب بھی اس کی جرات، حسنِ انتظام اور جوڑ توڑ کے فن میں اس کے طاق ہونے کے سبب اس کے مقابلے میں حریفِ ناتواں بن کر رہ گئی تھی۔ وہ وزیر باتدبیر بھی تھا، خودپرست اور ایذارساں بھی، اور نفرت اور انتقام جیسے سفلی جذبات اس کے خمیر میں گندھے ہوئے تھے مغرب میں المہدی کے خلاف سیاسی اور جنگی محاذ پر ناکامیوں اور اپنے بیٹے حسین کی طرف سے مایوسی کے سبب کہ وہ اس کی تربیت جن خطوط پر کرنا چاہتا تھا، وہ اس سے برابر منحرف اور دامن کشاں ہی رہا اور اس کی موت بھی دیارِ غیر میں واقع ہوئی، ان سب واقعات نے مل جل کر جن میں دشتِ سماویہ میں اعول کی تجہیز و تکفین بھی شامل تھی، حامد بن عباس کی کمر توڑ کر رکھ دی اور اس کے جسم و جان کے ہر ہر خلیے میں زہر گھول دیا۔ صدائے ساز، اور

'نغمۂ شوق' کی منزلوں سے گذر کر جب 'زمزمۂ موت' کی آہٹ ہمارے کانوں تک پہنچتی ہے تو ہم گویا ناول کے نقطۂ عروج کو چھو جاتے ہیں۔ حسین بن منصور کو شہید کرنے کی غرض سے جو فردِ جرم مرتب کی گئی تھی۔ اس کی بنیاد دو امور پر تھی۔ اوّل اس کا پُر سوز، جاں گسل اور بے بیم نعرۂ انا الحق جس کا مفہوم یہ تھا کہ انفرادی نفس ہی حق یا حقیقتِ مطلقہ ہے اور اس کے اور ماسوا کے درمیان ہلکا سا امتیاز یا دوری بھی گوارا نہیں کی جا سکتی۔ اور دوسرے ارکانِ ظاہری کی بجا آوری کے ساتھ لیکن شریعت کی سخت گیری کو پوری طرح تسلیم کرتے ہوئے اپنے رویائے صادقہ پر یقینِ کامل اور بھر پور اعتماد اور نتیجۃً جاہ و جلال، ثروت و شوکت، مناصب و مراتب اور دنیوی معاملات میں تفوق و برتری کے مروجہ اور تسلیم شدہ معیاروں کو پائے استحقاق سے ٹھکرا دینا۔ اور 'دانشِ برہانی' کی روشنی کے بجائے 'دانشِ نورانی' کی عطا کردہ بصیرتوں اور انکشافات کو مرجع سمجھنا اور ان کی رہنمائی کو قطعی اور حتمی ماننا۔ حامد بن عباس کے لیے اس قسم کے تمام مفروضے اور ایقانات ناقابلِ اعتبار ہی نہیں بلکہ قابلِ مذمت ہیں۔ وہ تو ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح اپنے زخموں کو چاٹنے میں منہمک رہتا ہے، اور اس سے لذت اندوز ہوتا ہے اور پوری طرح حساب چکانے پر تلا ہوا ہے۔ اس کی قوتِ ارادی فولاد و آہن سے مرکب ہے۔ گو یہ کلیتہً ایک منفی اور سلبی قوت ہے۔ یہ بات بھی بڑی اہم ہے کہ ہر طرح کے حیلے حوالوں سے کام لینے کے باوجود وہ اپنی مقصد برآری میں کامیابی سے دور اور گریزاں ہی رہا۔ تا آنکہ ایک عجیب قسم کی گلا گھونٹنے والی پیاس نے اسے آدبوچا، اور بالکل ہی بے جان اور بے حوصلہ کر دیا۔ حسین بن منصور سے جب حامد بن عباس کو اس پیاس سے چھٹکارا دلانے کے لیے دعا کی درخواست کی گئی، تو اس کا معنی خیز جواب، جو اس کے وجدانی احساس پر مبنی معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ اسے راحت و آسودگی عطا کرنے یعنی اس پیاس کو رفع کرنے کا وسیلہ اسے خونِ ناحق سے سیراب کرنے کے سوا اور کوئی نہیں۔ حامد بن عباس برابر انگاروں پر لوٹتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے حریف حسین بن منصور کو کوڑے لگانے، اسے مثلہ کرنے، اس کے جسم کو پارہ پارہ کرنے اور اسے آگ میں جلا دینے کے انتظامات مکمل کر لیتا اور ایسا کرنے کے احکامات صادر کر دیتا ہے۔ اور اس ضمن میں اس کی جان بخشی کے لیے کسی نوع کی سفارش کی شنوائی کا کوئی امکان نہیں۔

جیسا کہ کہا گیا حامد بن عباس کے بہیمانہ، سفاکانہ اور ہیبت ناک عمل کا محرک وہ جذبۂ انتقام ہے جو وہ حسین بن منصور کے خلاف اتنی شدت، توانائی اور تواتر کے ساتھ محسوس کرتا رہا ہے، اور جس نے اس کے اعصاب کو تناؤ کی انتہائی سطح پر رکھا۔ جس لمحے اس پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ اوّل تا زیست حسین کی محبت کے سحر میں گرفتار رہی، اور اس نے حسین سے آخری ملاقات اس وقت کی، جب وہ موت کے دروازہ پر دستک دیا چاہتی تھی، تو اسے یہ محسوس ہوا کہ اس کی اپنی زندگی ایک تخ بستہ خرابے میں محصور ہو کر رہ گئی ہے:

"حامد کے منہ میں راکھ کا مزہ تھا اور بلند شعلے اس کے گرد ناچنے والے جنوں کی طرح محوِ رقص تھے.... وہ ایک دشتِ تنہائی میں کھڑا تھا اور ریگِ رواں کے بھنور میں نہایت آہستگی کے ساتھ ڈوب رہا تھا۔ وہ آگ کے بحرِ زخار پر ایک آتش گرفتہ تنکے کی طرح اپنے وجود کی حدت سے جل رہا تھا۔ اس کی عمرِ عزیز لا حاصل تمناؤں میں گزری۔ سوختہ جاں، دل گرفتہ، رنجور و مہجور۔ عہدوں اور طاقت اور دربارِ خلافت میں اس کی رسائی سے اسے منفعت نہیں ہوئی... آخر کیوں؟... ایوان اس کے سامنے منہدم ہو گئے تھے۔ اب وہ کیا کرے۔ احساسِ شکست خوردگی ہی باقی رہا تھا۔ وقت اس کے ہاتھوں ریگِ رواں کا دھارا بن کر پھسل گیا تھا۔ سارا جاہ و جلال، کنیزوں سے آباد قصر کا ہر کونہ، حکم دینے اور منوانے کی باتیں سب لا حاصل، لایعنی۔" (ص ۳۹۳)۔

ایک اور بیان اس تاثر کو محکم کرنے کے لیے اور بھی ملتا ہے:

"پھر اس کا دل ایک خلا سے معمور ہو گیا اور خلا نے اس پر محیط ہو کر اس پر طاری ہونا شروع کر دیا۔ کوئی اس طلسم سے پرے کہہ رہا تھا، حامد بن عباس کہاں ہے؟ یہ گونج ایک چیخ کی طرح اس کے اندر سے ابھری۔ اسے اپنے چاروں طرف تمسخر اڑاتی ہوئی چیخیں سنائی دیتی تھیں خالی ایوانوں اور کھلے دریچوں اور بند کمروں اور نیلے آسمان تلے شور مچاتے پرندے فضا میں ڈبکیاں لگاتے کوے سب کہہ رہے تھے؛ کہاں۔ کہاں۔ کہاں۔" (ص ۵۹۱)۔

دونوں تراشوں میں تخ بستگی اور خلا میں ایسی آوازوں کا شور جو اسے مضحک بھی سمجھ رہا ہو اور یکہ و تنہا بھی، بہت نمایاں ہے۔ اپنی کائنات کے یوں یک لخت مسمار ہو جانے پر اسے

چاروں طرف گردوباد کے طوفانوں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اسے ایسا لگا، جیسے اس کے تعمیر کردہ مضبوط قلعے میں نہ صرف دراڑیں پڑ گئی ہوں، بلکہ کسی ان دیکھے ہاتھ نے اسے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا ہو اور یہاں اب ملبے کے ڈھیر کے سوا کچھ نہ رہا ہو۔ انتہائی تلخی کے ساتھ اس نے یہ بھی محسوس کیا گویا اس کا اپنا بیٹا اس کا تمسخر اڑا رہا ہو، جس نے کبھی بھی زندگی کے اس نقشے کے مطابق اگنا اور بڑھنا قبول نہیں کیا۔ جو حامد بن عباس نے اس کے لیے کشید کیا تھا۔ بلکہ وہ کسی ان جانی قوت کے اشاروں پر حسین بن منصور کے پسندیدہ خطوط پر اپنی زندگی کی تعمیر و تشکیل کرتا رہا ہو۔ اس کے اندر وہی دروں بینی، وہی استغنا، وہی عاجزی اور انکساری، وہی قناعت اور صبر و ضبط نمایاں تھا۔ جو حسین بن منصور کے لیے طرۂ امتیاز رہا تھا۔ اس کا شعور حتمی طور پر مذہبی اور متصوفانہ تھا اور اس کی نظریں زمان و مکاں کی حدود سے پرے افق پر جمی رہتی تھیں اور وہ دنیوی زندگی کے مطالبات اور مقتضیات کو پرکاہ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ حسین بن منصور اور حامد بن عباس دو افسانوی متقابل کردار ہی نہیں۔ وہ خیر اور شر کی دو اساطیری صورتیں یعنی CONFIGURATIONS اور TITANIC قوتیں ہیں۔ حسین کی انائے محدود، اصل انائے مطلق سے بغایت اور شدید محبت کی ایک غیر معمولی تجسیم ہے اور حامد بن عباس کی شدید نفرت اپنی ذات سے شدید محبت کی ایک معکوس شکل ہے۔ بہ الفاظ دیگر وہ خیر اور شر کے نہیں، بلکہ عالمگیر محبت اور عالمگیر نفرت کے دو ایسے پیکر اور نقوش ہیں، جن کی وسعتوں اور جن کے امکانات نا پیدا کنار ہیں۔ وہ دونوں ہی عنصری جذبوں کی زبان گویا ہیں جس طرح محبت اور سیر چشمی، مہر و وفا اور رحم اور شفقت حسین ابن منصور کی شخصیت میں حلول کر گئی ہیں۔ اسی طرح حامد بن عباس حیوانی جبلتوں کے اظہار و انکشاف کی ایک ایسی کریہہ المنظر شبیہ ہے، جو سفاکی، انانیت اور سفلے پن میں اپنی مثال آپ ہی ہے۔ قاضی ابو عمر اور قاضی ابوالحسین جیسے سادہ لوح بندے، جنھیں اس بات پر حیرت تھی کہ حامد کیوں حسین بن منصور کی جان تلف کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔ اس کے بے پایاں شر کی گہرائیوں کو ناپنے کے کہاں اہل ہو سکتے تھے۔ اردو ادب کے قارئین کے لیے یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ برطانوی شاعر ولیم بلیک نے جو ایک اعلیٰ درجے کا مصور بھی تھا، اپنے اساطیری شاعرانہ نظام میں ایک کردار وضع کیا ہے، اور اسے فن مصوری کے ذریعے منقش بھی کیا ہے، اور اسے اس نے NEBUCH-

ADNEZZER کے نام سے موسوم کیا ہے اور یہ کردار متوحش بہیمت کی ایک خیرہ کن علامت ہے۔ وہ بہیمت کی ایسی نچلی سطح پر کھڑا ہے، جہاں سے وہ ہرگز اپنا سر بلند نہیں کرسکتا بعینہٖ یہی مقام اس ناول میں حامد بن عباس کا ہے۔ یہ ناول سرتاسر ایک غنائیہ المیہ ہے۔ جسے نقطۂ عروج تک پہنچانے والی لہریں شروع ہی سے اٹھنے لگتی ہیں تاآنکہ وہ ایک بحرِ زخار بن کر پوری فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔ ایسی ہی ایک موجِ پرخروش میں کیز گلانگ کا ہیولے جس نے اغول کی حسین کے لیے جاودانی محبت کا راز حامد کے سامنے فاش کیا تھا؛ گم کر دیا جاتا ہے۔ المیہ میں شر بظاہر خیر پر غالب آجاتا ہے اور اسے تباہ و برباد کردیتا ہے۔ لیکن خیر کے تفوق اور برتری کا ایک نقشِ جمیل پھر بھی باقی رہ جاتا ہے؛ جو تخریب یعنی WASTE کے اندوہ گیں احساس کو کسی قدر متوازن اور معتدل کرنے کے لیے لابدی ہے۔ حسین بن منصور کی شخصیت میں حسین ابن علی کی سرفروشی کا جذبہ بھی بدرجۂ اتم موجود ہے، جنہیں جادۂ حق کی تقدیس کی خاطر جامِ شہادت نوش کرنا پڑا؛ اور حلاج بن منصور کا نعرۂ آتشیں بھی جو من و تو کے فرق و امتیاز کو کلیتہً مٹا دیتا ہے۔ لوح سے تحت تک اس کی شخصیت میں ایک گہرا رچاؤ ملتا ہے۔ اس کی ذات میں نرمی اور دلآویزی بھی ہے، اور صلابت و استقامت بھی۔ وہ ایک گلیشیر کی مانند ہے جس میں سے لاوا ہر وقت ابلتا رہتا ہے۔ لیکن اس کے اندرون کی یہ آگ محض بھسم کر دینے والی نہیں ہے، بلکہ یہ تطہیر و تنزیہہ کا وسیلہ اور معمول ہے کہ جو اس سے چھو جاتا ہے، وہ مطہر اور پاک ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس حامد بن عباس کے اندرون میں جو آگ دہک رہی ہے، وہ تمامتر ایک تخریبی خاصیت رکھتی ہے یہ جسم اور روح دونوں کو سلا دینے والی اور مٹا دینے والی شے ہے۔ یہ ناول محض انفرادی برتاؤ میں عمل اور ردِ عمل اور محبت کے مختلف مظاہر کے مابین کشمکش کی عکاسی ہی نہیں کرتا بلکہ اس کا تمامتر سروکار اس امر سے ہے کہ کس طرح ایک شدید روحانی جذبہ جو ماورائی نسبتوں سے متعلق ہے، نہ صرف شخصیت کی کایا پلٹ کر دیتا ہے، بلکہ کائنات اور اس کے جملہ مظاہر اس کی زد پر رہتے ہیں حسین بن منصور اپنے رویاء کی دنیا میں رہتا ہے۔ جو خود اسی کی خلق کی ہوئی ہے اور مادی زندگی کے التزامات اور اس کی دلگیر اس پر مطلق اثرانداز نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس وہ خود مادی کائنات کو اپنے ایقانات کے بل پر زیر و زبر کرسکتا ہے۔ یا بہ الفاظِ دیگر یہ کہیے کہ اسبابِ و علل کی اس دنیا میں جو ہماری نظروں کے

سامنے پھیلی ہوئی ہے، وقتی طور سے DISLOCATION پیدا کرسکتا ہے۔ وقت کا عدم تسلسل یا اس کا DISLOCATION ہی وہ شے ہے، جسے معجزہ اور کرامات کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے؛ اور عوام اس پر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ دراصل مادی نتائج کے اسباب مادی ہی نہیں روحانی بھی ہو سکتے ہیں، اور ہوتے ہیں؛ حسین بن منصور کی اس صلاحیت کے لیے ایک لفظ CLAIR-VOYANCE استعمال کرسکتے ہیں۔ پیش بینی کا یہ ملکہ حسین اور گلزنگ کے درمیان ان جملوں کے لین دین میں ظاہر ہوتا ہے:

"سمری غلام نے حاضر ہوکر کہا: باہر کچھ غلام منتظر ہیں۔ انہیں ٹھہرنے کا کہو، گلزنگ نے کہا، سمری واپس چلا گیا۔ ابن منصور حامد بن عباس مجھے قتل کرا دے گا۔ وہ مجھے نہیں سکتا تمہیں وہ قتل نہیں کرا سکتا۔ موت اور اذیت کا وعدہ کسی اور سے ہو چکا ہے، اس نے پہلے سے کہا۔" (ص ۲۰۲)۔

اس میں اشارہ اپنی موت کی طرف ہے، جس کا حسین بن منصور کو وجدانی علم ہو چکا تھا اور جسے اس کی آنکھیں وقت آنے سے پہلے ہی بے حجاب دیکھ رہی تھیں۔ اس کے برعکس حامد بن عباس کے تمام افعال و اعمال کے پسِ پشت جو محرک ہے، وہ اپنے بالیدہ لیکن زخم خوردہ ایغو کو ہر قیمت پر تسکین پہنچانا اور جذبۂ انتقام سے مغلوب ہوکر اپنے آپ کو ہر قسم کی اخلاقی پابندی سے بالاتر تصور کرنا اور اپنے مدِمقابل پر ظلم و استبداد کے پہاڑ توڑ کر اس سے ایک طرح کی لذت اندوزی کرنا، اور حسین بن منصور کا ردِعمل یہ ہے:

"مشیت یہی ہے آقائے رازی کہ میں عشق کی فصل کاٹوں۔ محبت کے لیے جان دو، اور سنو آقائے رازی، جس کے نصیب میں شہادت ہو جسے یہ مرتبہ مل سکے۔ وہ کیوں اس سے بھاگے، کہاں جائے۔ جاوداں موت سے جاوداں زندگی کی طرف جبکہ موت سب کا مقدر ہے! میں زندگی کو کیوں نہ پسند کروں، از پئے جاناں۔" (ص ۲۶۶)۔

اپنی موت کا یہ خیر مقدم، ترجیحات کا یہ معیار، ایک طرح کا عمل ارتفاع ہے، جسے حسین بن منصور ہی کے لب ادا کرسکتے ہیں۔ اس کے بالمقابل یہ تراشہ رکھیے:

"پھر اس پر شدید پیاس کا دورہ پڑا۔ اور اس کے اندر کسی نے کہا، جب تک حسین بن منصور زندہ ہے۔ تمہاری پیاس نہیں بجھ سکتی۔ نامراد اور تشنہ تم زندگی کے صحرا میں بھٹکتے رہو گے تا آنکہ موت تمہیں اپنی آغوش میں لے لے۔ تم فنا ہو جاؤ تم نہ رہو، حامد بن عباس وزیر مملکت، عباسی جاہ و جلال اور شان و شوکت لازوال ہے۔ مگر تم تو لازوال نہیں ہو اور اس سے پہلے کہ وقت تمہاری گرفت سے پھسل جائے تم اپنی تشنگی مٹالو" (ص ۵۵۴)۔

موت کا آسیب حامد بن عباس کے ذہن سے چمٹا ہوا ہے اور جس شدید اضطراب اور کشمکش کے منجدھار میں وہ گھرا ہوا ہے: یہ اس کی خارجی، لغوی صورت گری ہے اور جیسے جیسے ہم ناول کے نقطۂ عروج کی طرف بڑھتے ہیں، نغمۂ موت اس طور سنائی دینے لگتا ہے:

"قاضی ابو عمر نے وضو کا پانی مانگا اور نماز تہجد کے لئے کھڑے ہو رہے تھے کہ ایک عجیب سنسناہٹ سی محسوس کی؛ جیسے تیز شوریدہ لہریں طوفان کی رفتار سے بڑھتی چلی آ رہی ہوں آ ایک ایسی آواز جیسے صور پھونکا جا رہا ہو۔ ہر شے فنا ہو رہی ہو۔ سمندر اور آسمان اور زمین اور کائنات اور ہر سیارہ اور ستارہ ٹوٹ کر جل کر راکھ میں تبدیل ہو رہا ہو۔ یہ کیسا نغمہ تھا، جو انہیں اپنے اندر اور اپنے باہر سنائی دے رہا تھا" (ص ۴۴۴)۔

یہ ایک استعاراتی بیان ہے موت کے متوقع سقوط کا جواب حقیقت بننے والا ہے۔ حسین بن منصور کی موت کا حکم سنائے جانے اور اس کے عمل درآمد کی تیاریوں کے جلو میں گرد و پیش کی پوری فضا میں ایک زبردست ہلچل پیدا ہو جاتی ہے، اور ایک پراسرار نغمہ گونج اٹھتا اور اس کے ارتعاشات سے پوری کائنات کانپنے لگتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ حسین بن منصور کے پیش دیدہ انجام پر بین کر رہی ہو اور حامد بن عباس کی پورے جوش اور قوت کے ساتھ مذمت کر رہی ہو۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انسان اور فطری کائنات کے آہنگوں میں ایک نامیاتی ربط و تعلق ہے، اور ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس نقطے پر معاً ہمیں شیکسپیئر کے ڈرامے THE TEMPEST کے تیسرے ایکٹ

کے تقریباً خاتمے پر ALONSO کی یہ سطریں یاد آتی ہیں، جن میں وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے PROS-PERO کے ساتھ جو دغابازی کی تھی، پوری کائنات اس پر اس کی سرزنش کر رہی ہے:

ALONSO O! IT IS MONSTROUS, MONSTROUS

METHOUGHT THE BILLOWS SPOKE AND TOLD ME OF IT

THE WIND DID SING IT TO ME AND THE THUNDER

THAT DEEP AND DREADFUL ORGAN-PIPE PRONOUNC'D

THE NAME OF PROSPER: IT DID BASS MY TRESPASS III.W.98-99

کائنات پر حامد بن عباس کے جارحانہ اور متشددانہ رویے کے ردعمل کو اس طرح سامنے لایا گیا ہے:

"حامد نے اجازت چاہی اور اُلٹے قدموں دربارگاہ سے باہر آگیا اور باہر ایک تاریک سیاہ آندھی نے بغداد کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے بڑھنا شروع کیا۔ بادل بجلی کو، طوفانوں کو، سناٹوں کو، رعد کے شور کو، اور ویران سی اداسی کو لیے بڑھتے رہے۔ قہر بلا اور باد بلا نے غنیم کی فوج کی طرح بغداد کو اپنے حصار میں لے لیا۔" (ص ۱۷۴)۔

مزید:

"دوسرا دن طلوع ہی نہیں ہوا کیوں کہ اندھیرا بغداد کو گھیرے ہوئے تھا۔ ایک تاریک آندھی جس میں مشرق اور مغرب کی وادیوں اور کہساروں کی اور بحرِ محیط کی ہوائیں جمع تھیں، مسلسل چل رہی تھی اور ذرہ ذرہ گردیوں تھی جیسے آسمان ریزہ ریزہ ہو کر گر رہا ہو۔ صبح میں نہ پرندوں کی چہکاریں تھیں، اور نہ ہی بوئے گل، ایسا سناٹا اور اداسی تھی کہ دجلہ اپنے کناروں میں اندھے آئینے کی طرح تھا اور خون کی بو ہر سو پھیلی تھی۔ گرم اور تازہ اور جاندار اور نہایت جوشیلے خون کی بو جس کے ساتھ جلنے کی بساندھ بھی تھی۔ جیسے آگ پر اسے پکایا جا رہا ہو۔"

(ص ۴۸۸)۔

اس سے بڑھ کر یاس انگیز وہ منظر ہے، جب حسین بن منصور نے آقائے رازی کو یوں مخاطب کیا:

"آقائے طوسی اتنے زرد کیوں ہو، کیا تمہیں دشتِ سوس کی خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی محسوس نہیں ہوتی، آج دشت نازاں ہے، اور ذرے رقصاں ہیں، آج تو کامگار اور

بامراد دن ہے، عشقِ تپاں آج اپنی منزل کو پہنچے گا۔ آقائے رازی سنو ہوا مبارکباد کے نغموں سے یوں بھری ہے، جیسے آوازوں سے باجا" (ص ۴۸۸)۔

حسین بن منصور کے لبوں پر دقتِ آخر تک یہ دو مصرعے رواں رہے :

"عشق مزرعِ گلاب ہے / عشق مزرعِ زندگی ہے" جنہیں سن کر شبلی اور عطار کی روحیں سرمست ہو گئی ہوں گی۔ اور جب اس کے ہاتھ کاٹ ڈالے گئے، تو کٹے ہوئے ہاتھوں سے خون بہتا دیکھ کر اس نے اسے منہ پر مل لیا۔ آقائے رازی نے کہا، بخدا میں دیوانہ ہو جاؤں گا۔ یہ کیا کر رہے ہو : وضو کر رہا ہوں، تاکہ نمازِ عشق ادا کر سکوں۔ آقائے رازی، کیا عشق مزرعِ زندگی نہیں ! حسین کیا تم اتنے دیوانے ہو کہ تمہیں جان سے گذرنے کا بھی خیال نہیں ؛ رازی نے کہا، کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ یہ جان ہی تو تھی، جو راہ میں حائل تھی۔ اب میں آزاد ہوں۔ میں اور وہ یوں مل گئے ہیں، جیسے شراب پانی میں مل جاتی ہے" (ص ۴۸۹)۔

آخری لمحاتِ زیست میں ادا کیے گئے یہ الفاظ، جنہیں روح کا مرثیہ کہئے اس قابل ہیں کہ جلوسِ آدم کا ترانہ بنیں۔ یہاں من و تو کے انضمام کے لیے شراب اور پانی کے امیج استعمال کیے گئے ہیں ؛ جو ہمیں کیبر جیسے فلسفی کی یاد دلاتے ہیں ؛ جو ازلی مجذوبانہ کیفیت اور جو ادرائی رویا، اس ناول کا تھیم ہے۔ ان کی تجلیاں ان آخری الفاظ میں سمٹ آئی ہیں۔ اقبال نے حلاج پر اپنے ان اشعار میں اس موضوع کا اس طرح احاطہ کیا ہے ؎

زخاں خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست | تجلیٔ دگرے درخورِ تماشا نیست
نظر بخویشتن چناں بستہ ام کہ جلوۂ دوست | جہاں گرفت و مرا فرصتِ تماشا نیست

اور ST. BONAVENTURA کے الفاظ میں حسین بن منصور جائز طور پر یہ کہہ سکتا ہے کہ 'خدا ایک ایسا دائرہ ہے جس کا مرکز ہر طرف ہے، اور جس کی بیرونی سطح کہیں بھی نہیں'۔ اپنے مرکزی موضوع اور فنی دروبست اور تنظیم کے اعتبار سے ایک بہت ہی اہم اور طاقت ور ناول ہے۔